اپنا اپنا جہنم
جمیلہ ہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ

جمیلہ ہاشمی

اپنا اپنا جہنّم

جمیلہ ہاشمی

رائٹرز بُک کلب۔ لاہور، کراچی

دوسرا ایڈیشن : جنوری ۱۹۸۳ء
ناشر : رائٹرز بک کلب
السیر، سینٹ جونز پارک لاہور کینٹ
مطبع : کمبائن پرنٹرز لاہور
قیمت : -/۴۵

سول ایجنٹس

غالب پبلشرز، پوسٹ بکس ۴۰۷۹، ملتان روڈ۔ لاہور۔ ۲۵

قرۃ العین حیدر کے نام

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں!

فہرست

زہر کا رنگ

بولان میل تین گھنٹے لیٹ پہنچی تھی اور مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر گوتم اسٹیشن پر میرا منتظر نہیں ہوگا۔ کراچی شہر کی گہما گہمی میں ہر آدمی اتنا مصروف ہوتا ہے کہ کوئی دُور کے رشتے کے بھتیجے کے لیے تین گھنٹے بیکار نہیں بیٹھ سکتا، اور پھر میں جیسا کہ مجھے معلوم ہوا تھا، گوتم کی خوب جمی ہوئی پریکٹس تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ بہت مشہور تھے۔ کلینک کے پتے پر جانے کے بجائے میں نے وکٹوریا روڈ کے علاقے میں ان کا گھر ڈھونڈنے کا سوچا۔ آدمی چاہے تو بھگوان کو بھی ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ آدمی کا ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے؟

اور اب دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ بھلا یاد کے اس پتلے سے دھاگے کے ناطے کوئی گھر ڈھونڈے جاتے ہیں؟ بابا نے کہا تھا "گوتم کا گھر اس کے کلینک سے بہت فاصلے پر ہے۔ گھر وکٹوریا روڈ پر ہے اور کلینک شہر کے گنجان علاقے میں۔" وہ ماں سے کہہ رہے تھے، میں نے ایف، ایس، سی کا امتحان پاس کیا تھا اور بابا میرے مستقبل کے متعلق بہت پُرامید تھے۔ وہ چاہتے تھے میں بھی گوتم کی طرح ڈاکٹر بنوں، خوب روپے کماؤں، زندگی میں نام پیدا کروں، میرا نتیجہ سننے کے بعد سے ماں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ خیالوں میں کھوئی ابھی سے مجھے ڈاکٹر سمجھنے لگی تھی، بابا البتہ خوشی کے ساتھ ساتھ سوچ میں ڈوبے تھے یہ داخلہ کس طرح ہو سکے گا، آج کل تو ہر کام سفارش سے ہوتا ہے یا رشوت کے بل بوتے

پر! سفارش تو خیر گوتم کی وجہ سے ممکن تھی، مگر رشوت کے لیے روپیہ کہاں سے آتا اور اس لیے بابا نے بہت سوچ سمجھ کر ڈاکٹر گوتم کو لکھا تھا، نہیں شاید فون کیا تھا۔ "اگر میرا داخلہ ممکن ہو اور وہ ایک احسان کر سکے تو مجھے کراچی بھیجا جائے" وہاں سے جواب آتے پر میری تیاری شروع ہوئی۔

ماں یوں جلد جلد میرا ہر کام کر رہی تھیں، بہنیں بھاگ بھاگ کر میرا سامان درست کرنے لگیں، جیسے میں کسی بہت ہی اہم اور ضروری رازداری کے کام پر روانہ ہونے والا ہوں، نئی رضائی، نئی چادریں خریدی گئیں۔ نیا بکس آیا، نئے کپڑے بنے۔ کھانے کے لیے کئی قسم کی مٹھائیاں اور جانے کیا کیا۔ ہمسائے تک اس تیّنوں کے سفر میں شریک تھے، عورتیں ماں کو بدھائی دیتیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے لڑکوں سے کہتیں "دیکھا منّو کتنا قابل ہے، تم بھی ایسے ہی قابل بننا کتنے زیادہ نمبر لیے ہیں اس نے"۔ میں ہیرو بنا پھرتا تھا، کالج کے دوست کہتے تھے "منوہر یار تم اب تو ہمارے سے گئے۔ خوش نصیب ہو، ڈاکٹر بن جاؤ گے اور یہاں تو اب آگے پڑھنے کے ہی لالے ہیں۔ تم جب دوسری بار ہمیں ملو گے تو ہم کلرک بن چکے ہوں گے۔ چھوٹی موٹی ٹوکریاں کرتے پھرتے یا نوکریوں کی تلاش میں! اور تم، تمہاری کون برابری کر سکتا ہے۔ ایسی باتیں سن سن کر میرا دماغ آکاش کی اونچائی پر تھا۔ میں بھی ماں کی طرح سپنے دیکھتا تھا۔

جب گاڑی چلی ہے تو بہنیں رو رہی تھیں۔ ماں نے بابا سے چوری ایک تھیلی مجھے دے کر ہولے سے کہا تھا۔

"منّو یہ تیرے لیے ہیں، میری طرف سے جب تجھے بہت ضرورت پڑے تو تب ہی ان کو استعمال کرنا، پردیس میں کون جانے کب آدمی کو سہارے کی تلاش ہو"۔

بابا نے کہا تھا۔ خط لکھنا، دوسروں پر بوجھ بننے کی کوشش نہ کرنا۔ گوتم نے نہایت مہربانی سے تمہارا داخلہ کرانے کا وعدہ کیا ہے، مگر اس سے زیادہ مدد ان

سے نہ لینا، ایسے رشتوں کو آڑے وقت کے لیے رکھنا چاہیئے۔

میرا جی جدائی کے خیال سے اور آواز آنسوؤں سے بھاری ہو رہی تھی۔ دوستوں سے بچھڑنے کا غم۔ پردیس کی وحشت اور پھر دوڑ دوڑ کر میرا کام کرنے والی بہنیں جو بڑے پیار اور بڑی آس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں، ماں جس کا چہرہ ایک لمحے دمکتا تھا اور دوسری گھڑی زرد پڑ جاتا تھا۔ میں نے بابا کی بات کا جواب صرف سر ہلا کر دیا۔ ان کے بالوں میں سفیدی زیادہ تھی اور ٹوپی کے اندر سے جو حصہ نظر آتا تھا وہ زیادہ گنجا تھا بوجھ سے جھکے کندھے آدمی کی وقت گزرنے کے ساتھ یہ دشا ہوتی ہے۔ میں نے سوچا۔ بابا کبھی جوان رہے ہوں گے۔ میری طرح زندگی اور سپنوں سے بھرے دماغ والے اور اس گھڑی وہ اپنی خوشی میں بھی سنجیدہ تھے۔ آنے والے دن کا چہرہ پہلے سے کس نے دیکھا ہے؟ بھرے ہوئے مسافروں کی گہما گہمی میں کمی ہو گئی۔ سوار ہونے والے اطمینان سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ وداع کرنے آئے ہوئے باہر کھڑے ایسی لا معنی باتیں کہہ رہے تھے۔ باتیں جن میں حسرتیں، آشائیں اور بچھڑنے کا دکھ بھرا ہوتا ہے اور اس کے باوجود ان کا مطلب نہ سننے والے کو پورا سمجھ میں آتا ہے اور نہ کہنے والے کو۔ گارڈ نے جھنڈی ہلائی۔ سیٹی بجی، بھاری پہیوں میں حرکت ہوئی اور کچھ کچھ کی آواز کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ رومال ہلے، ہاتھ ہلے۔ میری چھوٹی بہن نے رونا شروع کیا۔ اس کے رونے کی آواز مجھ سے دور ہوتی گئی اور ماں کا محبت کرنے والا چہرہ اپنی مہربانی اور چمک کے ساتھ پیچھے چھوٹ گیا۔

کراچی کی ہوا جو دُم دُم چلتی ہے اور دامنوں کو پھٹپھاتی ہے مگر پسینہ خشک نہیں کر پاتی چمکتے سورج تلے ایک سار بہتی جاتی ہے سڑک پر آدمیوں کا دریا رواں تھا اور مجھے گوتم چاچا کا گھر نہیں مل رہا تھا۔ مجھے بھی ضد ہو گئی تھی کہ کہیں نہ کہیں تو آخر میرے آس پاس وہ جگہ ہو گی ہی نا جس کی تلاش تھی۔ میں آخر

اس سیدھی سپاٹ سڑک پر جو کئی چوک کاٹتی چوراہوں سے گزرتی، بلنیوں کی رنگنی سمیٹتی آگے بڑھتی ہے، وہ گھر کیوں نہیں ڈھونڈ سکتا؟ میں نے جی میں کہا۔ "اگر یہ گھر جس کا پتہ بھی ڈھنگ سے مجھے معلوم نہیں مل گیا تو میں زندگی میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بڑا ڈاکٹر بن سکوں گا وغیرہ وغیرہ" آج یاد آتا ہے تو ہنسی آتی ہے، آدمی جب جوان ہوتا ہے اور پُرامید تو ذرا ذرا سی باتیں اس کو مقابلے کے لیے اکساتی ہیں، تمام اُونچی بلڈنگوں میں جا کر میں ڈاکٹر گوتم کا پتہ پوچھ چکا تھا۔ اب بڑ کے درخت کے نیچے کھڑا تھا اور ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ موٹروں کا دریا تھا کہ اس میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ دھوپ سے سنولائے ہوئے چہرے مطمئن خوش سوچ میں ڈوبے میرے پاس سے گزر رہے تھے، صورتیں جو خیال کی پرچھائیں کی طرح دیکھی ہوئی لگتی ہیں اور پھر بھی اجنبی ہوتی ہیں گھنی شاخوں پر چمکتے پتے یوں ہل رہے تھے جیسے کسی ناچ کے توڑے سیکھ رہے ہوں۔ آگے پیچھے پھر آگے پھر پیچھے۔ ان کی حرکت میں کوئی ترتیب نہ ہونے کے باوجود ترتیب تھی اور وہ سراسراہٹ کی لے پر جھوم رہے تھے۔ میں یوں چپ تھا جیسے میرا سارا وجود سانس روکے کسی شے کا انتظار کر رہا ہو عجیب بات تھی۔ اس چوراہے پر اجنبی شہر کے دل میں میں اپنے دل کی دھڑکن کے رُکنے کی راہ دیکھتا تھا۔ پھر مدھم سُروں میں کوئل کی کوک پتوں کے ساز کے ساتھ اُونچی ہوئی مجھے ایسا لگا جیسے میں اس جنگل میں اکیلا ہوں، اور یہ کوک میرے لیے ہو۔ میرا دل ایک دم دھڑکا اور پھر ہر دل کی طرح یوں ہی بس جاری رہنے کے لیے سینے میں چلنے لگا۔ اس لمحے میں نے اپنے آپ کو نہایت بے بس اور کھویا ہوا سا پایا۔ ایک بالک کی طرح جو راستہ بھول گیا ہو۔

کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تیز اور دُکھ بھری۔ میں نے درخت سے پرے جھانکا۔ ایک تختی پر گوتم لکھا تھا۔ تو میری تلاش سپھل ہوئی۔

بڑ کا درخت جس کی شاخیں فٹ پاتھ پر لٹک رہی تھیں۔ ان کے گھر کے سامنے تنا، پورچ پہ سایہ کیے ہوئے پھاٹک کو ڈھانپے ہوئے۔

میں نے سوچا تھا چاچا کی بیوی ایک ادھیڑ عمر ماں کی طرح کی ہی ہوگی چمکتا چہرہ جیسے چمپا کا رنگ ہو اور کہیں کہیں لکیروں کی وجہ سے گمبھیرتا میں ڈوبا ہوا جس لڑکی نے دروازہ کھولا وہ تو میری بڑی بہن سے ذرا نکلتے قد اور تقریباً اسی کی عمر تھی۔ بڑی بے آسرا سی لگنے والی معمولی سی لڑکی جس کو دیکھ کر نہ آدمی سپنے دیکھنے لگتا ہے، اور نہ ہی جسے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے نہ جس کی آنکھیں ہوش اڑاتی ہیں، اور نہ ہی اس کا رعب پڑتا ہے۔ میں نے سوچا یہ چاچا کی لڑکی ہوگی، مگر اتنی اداس سی کیوں ہے؟

"ڈاکٹر گوتم جن کے رشتہ دار چمن میں رہتے ہیں، یہی ہیں؟"

اس نے مجھے بہت غور سے دیکھا اور کہنے لگی "منوہر ہو تم"

"جی میں منوہر ہوں" میں نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔ لاپرواہی سے اور ناز سے جیسے میں اس سے نکلتے قد کا ہونے پر اپنے آپ کو اس سے بڑھیا محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے دروازہ چھوڑ دیا اور میں پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

"اصل میں گوتم تمہیں لینے صبح جا نہیں سکے تھے" اس نے تپائی پر ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ میں جو ایک تصویر کے سامنے کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا، پلٹا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ میرا پلٹنا اور اسے حیران ہو کر دیکھنا اس نے بھی محسوس کیا۔

پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ اب دوپہر ڈھل رہی ہے۔ گوتم کی راہ دیکھی تو اور دیر ہو جائے گی۔ وہ تین بجے سے پہلے کبھی نہیں لوٹتے۔ میں تمہارا کھانا نکال دیتی ہوں۔" یہ ہے غسل خانہ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا یہ دھان پان سی لڑکی جس کو عورت کہنا درست نہیں ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر گوتم کی بیوی کمال ہے بھئی۔

پورچ کے اوپر کمرہ تھا۔ رنگ برنگ شیشوں والی کھڑکیوں میں سے دھوپ

کی روشنی سے رنگوں کی چھوٹ سی فرش پر پڑتی تھی۔ بستر پر سفید چادر بچھی تھی، جیسے ہی میں لیٹا رنگوں کے لہریوں نے مجھے ڈھانپ لیا۔

میں سپنے دیکھنے کا عادی نہیں ہوں، میرا مطلب ہے مجھے بہت کم سپنے نظر آتے ہیں، لگتا ہے سونے کے ساتھ ہی میرا دماغ بھی چین سے اپنے خیالوں کو لپیٹ کر آرام کر رہا ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہر رات سپنے دیکھتے ہیں، تو میں یقین نہیں کرتا، میں نارمل آدمی ہوں، عام سا جیسے اور بہت لوگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگ سپنے دیکھیں اس سہ پہر کو جب میں وکٹوریا روڈ کے چوراہے پر بنے اس گھر کی پورچ کے اوپر سو رہا تھا اور بڑ کی شاخوں میں چھپی کوئل رہ رہ کر کوکتی تھی موٹروں کے شور سے ہنگامہ سا تھا۔ میں نے ایک عجیب سپنا دیکھا۔

میں نے دیکھا سات رنگ پروں والا ایک پرندہ ہے جو اپنی چونچ میں کوئی پھل پکڑے ہے، اور میرے سر کے قریب کبھی اڑتا ہے اور کبھی بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے پروں میں سے بڑی میٹھی باس نکلتی ہے۔ اور یہ خوشبو میرے اندر ہی اندر سفر کرتی ہے۔ خون کے ساتھ رگوں میں بہتی ہے میں بیہوش ہونے کو ہوں۔ پھر وہ پرندہ ایک شاخ پر بیٹھ جاتا ہے شاخ پر نہ پتے ہیں نہ پھل۔ ننگی ہے، جیسے سردیوں میں برفباری کے بعد درخت کا کوئی پتا نہیں رہتا۔ ماتم کرنے کی آوازیں کہیں سے آرہی ہیں۔ وہ پنچھی ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے جیسے ان کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہولے ہولے اسے بھول جاتا ہے کہ اس کی چونچ میں کچھ ہے۔ وہ منہ کھولتا ہے بولنے کی کوشش میں اس کی آواز گدھے کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔ پھل نیچے گر جاتا ہے، میں جھک کر اسے اٹھاتا ہوں تو وہ اندر سے کھوکھلا ہے، اور اصلی بھی نہیں ہے، رنگا ہوا مٹی کا کھلونا ہے۔ میں اور وہ دونوں پھل کی طرف دیکھتے ہیں میری آنکھوں میں بھی افسوس ہے اور اس کی آنکھوں میں بھی چمک ہے جیسے ان میں آنسو ہوں۔ پھر مٹی کے اس کھلونے کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا ہوں کہ وہ میرے ہاتھ سے گر جاتا ہے اور آدھے بنا ٹوٹ جاتا ہے۔ بریک لگنے کی کرخت تیز آواز آئی اور میں جاگ گیا۔ شاید نیچے سڑک پر کوئی حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ دیر

تک میں پاؤں نیچے لٹکائے بستر پہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ میں کہاں ہوں ——
دروازہ آہستگی سے کھول کر وہ اندر آئی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اسے کھولا
ات کی روشنیاں بڑ کے پرے جل رہی تھیں۔

گوتم تمہارے جاگنے کا انتظار کرتے کرتے دوبارہ اپنے کلینک چلے گئے ہیں۔
اب وہ رات کے دس گیارہ بجے ہی آسکیں گے۔ تم چائے پیو گے یا کافی!

"آپ میرے لیے تکلیف نہ کریں، میں باہر جا کر پی لوں گا اور ہوٹل سے اپنا
سامان بھی لے آؤں گا۔" اس کی آواز کی رسان سے مجھے لگا وہ میرے آنے کو بوجھ نہیں
سمجھتی، "نہیں بھئی اب پردیس میں تم جائے کیوں ہوٹلوں میں پیتے پھرو گے۔ رسویا ہے
وہ ابھی ایک منٹ میں لائے دیتا ہے۔" اور پھر وہ چلی گئی۔ اس کے پیچھے روشنیوں کے
لرزتے سائے پتوں کی سرسراہٹ میں ملے۔ ٹریفک کے شور پر ہنستے شریر بچوں
کی طرح کود کر اندر آتے اور پھر باہر جاتے رہے۔

ہوسٹل سے میں گوتم چاچا کے گھر آیا تھا۔ یہ غالباً پہلی آوار تھی۔ ان آٹھ دنوں میں
میں نے ایک دو لڑکوں سے سرسری سی راہ و رسم پیدا کی تھی اور بس لیکچروں کو سننے
اور بڑی بڑی کتابوں کو اٹھانے کا جادو ہی ایسا ہے کہ کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود
آدمی اپنے آپ کو ابھی سے ڈاکٹروں کی طرح سنجیدہ باوقار مصروف جاننے لگتا ہے۔ کمرے
میں میرا ساتھی لڑکا بھی خاموش طبع سا تھا اور اس لیے ہفتے کی شام کو جب اگلے دن کا
کوئی پروگرام نہ تھا، کتابوں پر کاغذ چڑھانے اور الماری ٹھیک کرنے کے بعد تھکا
تھکا سا وجود لیے میں نے گوتم چاچا کے ہاں جانے کا سوچا اور پھر میرے دو چار کپڑے
ان کے ہاں تھے۔ دھوبی شاید لے ہی آیا ہو۔

مایا بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی آیا شاید کسی کام سے اندر گئی تھی۔ گوتم چاچا نے کہا
آؤ آؤ، ہم لوگ ذرا کلفٹن تک گھومنے جانے والے تھے، میرا مطلب ہے میں تو کمپنی
کے کسی افسر کو دیکھنے جا رہا ہوں، مایا اور آیا سمندر کے کنارے ٹہلنے جاتی ہیں۔ اب تم
بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ۔" پھر وہ موٹر خانے تک گئے جو پچھلی طرف تھا۔ بچہ

کلکاریاں مارتا اور ہمک ہمک کر ماں کی گود سے نیچے کودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تندرست صحت مند گول مٹول سا سانولہ شیام سندر۔ میں نے ہاتھ اس کی طرف اٹھائے تو وہ یوں لپک کر میرے بازوؤں میں آیا کہ میں نے اُسے مشکل ہی سے سنبھالا مایا کہنے لگی "بہت شریر ہے پر تم سے اتنے دنوں میں خوب جان پہچان ہو گئی تھی نا۔ اس لیے یوں تمہاری طرف اُلٹ پڑا۔"

چھوٹے بہن بھائیوں سے دوری کی وجہ سے مجھے بھی شیام بہت اچھا لگا تھا اسے دیکھ کر مجھے مالتی یاد آ جاتی جو میرے آتے سمے اسٹیشن پر یوں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اب جانے کب میرا جانا ہو سکے کب ایسے دن کبھی لوٹ کر نہیں آتے نا۔ میں اس کو گود میں اٹھائے اٹھائے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ کومل تیوروں میں بولنے لگی جیسے اندھیرے کا سینہ چیر کر روشنی کی لکیر انسے اور گہرا اور ڈراؤنا بنا دے۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ رنگ برنگے آنچل پھٹپھٹا رہے تھے۔ موٹروں کی قطاریں ڈوبتے سورج کی روشنی میں کھڑی اس رونق کے باوجود ایسی الگ رہی تھیں جیسے کسی ویران غیر آباد جزیرے پہ اتاری گئی ہوں۔ تماشا دکھانے، چیزیں بیچنے والے یہاں وہاں اِدھر اُدھر چکر لگاتے پھرتے تھے غباروں کے رنگوں میں ڈوبے ہوئے آدمی کو بہلانے کے لیے ہر آنے والے کی طرف بڑھتے تھے۔ سمندر آج بہت اندر کی طرف آیا ہوا تھا۔ پیلی تتلیاں تھیں۔ گو تم ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ کہنے لگا۔

"میں لوٹتے سمے تم لوگوں کو یہیں سے لے لوں گا۔"

سمندر کے کنارے دُور دُور تک میلا لگا تھا۔ جگہ جگہ دُکانیں لگی تھیں، جو پہیوں والی سرکس کی گاڑیوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکتی تھیں۔ شیام اپنی گاڑی میں سو گیا تھا جس کو آیا ہمارے لیے ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔

برفباری کے طوفانوں میں رہنے والوں کے لیے پہلے پہل سمندر کا کنارہ چہل پہل اور رونق سے پُر دلکش اور دلرُبا ہوتا ہے۔ سامنے سیاہ سمندر حدِ نظر تک پھیلا ہے جھاگ اُڑاتی ہوئی لہریں ایک دوسری کے پیچھے بھاگتی آتی ہیں۔ شائیں شائیں کرتی

ہوئیں۔ مالوا بھی اپنی تندی و تیزی سے سب کچھ بہالے جائیں گی اور ساحل تک آتے آتے دم توڑ کر شریر بچوں کی طرح واپس بھاگیں اور شور سمیت سمندر کے اندر کودتی ہوئیں زیادہ دیر سمندر کی طرف دیکھو تو چکر آنے لگتے ہیں، اور پھر لگتا ہے آدمی ان چکروں میں گھوم رہا ہے، مٹ رہا ہے۔ لہروں کے ساتھ ساتھ اس مہاساگر میں کھنچتا چلا جاتا ہے اور آخر میں آدمی مٹ جاتا ہے۔ صرف چنگھاڑتی ہوئی مہیب آواز باقی رہتی ہے میں نے بہت ساحل دیکھے ہیں۔ گھوما ہوں، ہر جگہ یہی احساس ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے یہ احساس مجھے ہی ہوتا ہو۔ اب تو میں سمندر سے خوف کھانے لگا ہوں۔ کون جانتا ہے کہ وہ زندہ ہو اور پھر بھی فنا ہو جائے۔ اس کی ہستی کہیں نہ ہو۔ ریت کے ایک ناچیز ذرّے کی طرح ہوا میں، آوازوں اور شور مچاتی لہروں میں مل جائے۔

مگر میں نے زندگی میں پہلی بار ساحل دیکھا تھا جس سمندر کے متعلق کتابوں میں پڑھا تھا وہ آج میرے پاؤں میں تھا۔ جہازوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور سمندر کے اندر بڑی بڑی بادبانی کشتیاں تنکوں کی طرح لہروں کے ساتھ اٹھ اور گر رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا میرے منہ پر آ کر لگتی تھی۔ بڑی محنت سے سنوارے ہوئے بال بکھر رہے تھے۔ مایا نے ایک نہایت خوبصورت اسکارف اپنے بالوں پر لپیٹ رکھا تھا۔ مگر اس سے بھی اس کی شکل کے معمولی پن میں کوئی جاذبیت پیدا نہ ہو سکی تھی نہ اس کی آنکھوں میں کوئی جادو تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر کوئی نمو تھی۔

آیا نے بچہ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر لیا اور خود ایک ٹوٹی سی کرسی پر کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ میں اور مایا آگے اور آگے سمندر کے کنارے کنارے چلتے گئے۔

بات کرتے کرتے میں نے اسے کہا "چاچی"

کہنے لگی "منوہر میں تم سے کوئی زیادہ بڑی نہیں ہوں، یہی دو چار سال کا فرق زیادہ سے زیادہ ہو گا، تم مجھے مایا کہا کرو۔

میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" میں گو تم کو بھی چاچا کہتا ہوں۔

مایا نے کہا۔ گوتم کی اور بات ہے وہ مجھ سے پندرہ بیس سال بڑے ہیں۔ ان کو تم جو جی چاہے کہہ سکتے ہو۔ مگر مجھے "چاچی" کہلوانا اچھا نہیں لگتا۔" پھر رک کر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگی۔

"پتہ نہیں کیوں مجھے جب بھی کوئی کسی رشتے سے پکارتا ہے، لگتا ہے مجھ میں کسی اور کو تلاش کر رہا ہے، یا میں، میں نہیں کوئی اور ہوں"

ہم دونوں آگے ہی آگے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔

مجھے اچھا لگتا ہے کہ میرا ہر ملنے والا مجھے میرے اپنے نام سے پکارے۔ تم کو پتہ نہیں، گوتم کے سب دوست مجھے مایا ہی کہتے ہیں، پہلے پہل تو سب کو تعجب ہوا مگر اب تو لوگ عادی ہو گئے ہیں۔ عورتیں بھی پہلے مجھے مایا کہتے ہوئے بجائے مسز گوتم کے عجیب محسوس کرتی ہیں۔ پھر کہنے لگتی ہیں اب میں کسی کی بھابی، کسی کی بہن، مسز گوتم کچھ نہیں بس صرف مایا ہوں۔

سورج لہروں میں کہیں نیچے ڈوب گیا تھا اور شراب کی سی سیاہ موجیں زیادہ تندی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ سمندر کے کنارے کا یہ بازار مجھے پرانی کہانیوں کی طرح کا لگا الف لیلیٰ کی کہانیوں کا سا دھواں دیتے گیس اور ٹمٹماتی ہوئی لالٹینیں جل رہی تھیں اور سروں پر آس پاس اندھیرا پھیلا تھا جو پُراسرار آوازوں سے پُر اور دل لبھانے والا تھا۔ ذرا پرے ہر آدمی کے پیچھے تاریکی تھی اور لہروں کی پُرشور گھٹنے اور بڑھنے والی آواز تھی۔ پھر پہلی راتوں کا چاند سمندر کے ایک کنارے سے بڑھنے لگا۔ تاریکی میں تاروں کے نیچے روشنی پھیلنے لگی اور آدمیوں کے سائے ذرا واضح ہونے لگے، جہاں ہم تھے وہاں تک پانی آ گیا۔ مایا نے شیام کو ہلکے کمبل سے ڈھانپ دیا۔

لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ ٹخنوں تک گیلی ریت میں دھنس رہے تھے۔ عورتیں اپنے دامن بچانے کے لیے ساڑھیوں کو اوپر اٹھائے ہوئے تھیں، پوڈر اور سرخی سے پُتے چہرے کاجل سے سیاہ آنکھوں کی وجہ سے زیادہ غیر انسانی لگ رہے تھے۔ بچے ہنستے ہوئے، جوان گاتے ہوئے یا قہقہے لگاتے ہوئے لڑکیوں کی

ناک میں آئے ہوئے لڑکے اور جانے کیسے کیسے لوگ۔

مایا چپ چاپ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ میں بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ میں اسے مایا کہنا نہیں چاہتا تھا، کچھ نہیں پا رہا تھا۔ ایسی رونق میں بات کرنا کوئی ضروری بھی تو نہیں ہوتا۔

پھر گوتم کی موٹر کا ہارن بجا، وہ کہنے لگی "گوتم آ گئے ہیں"

میں نے کہا "کیسے پتہ چلا"

وہ آتے ہوئے لائٹ کو جلاتے بجھاتے آتے ہیں، یہ اشارہ ہے۔

گوتم نے موٹر کھڑی کی، آیا نے سوئے ہوئے شیام کو گود میں اٹھایا، مایا نے بچے کی گاڑی کو تہہ کر کے پیچھے رکھا اور ہم سب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

گوتم کہنے لگے۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی تھی۔ وہاں کچھ لوگ آ گئے تھے۔ ان سے باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ تم لوگ راہ دیکھ رہے ہو گے۔ "منوہر تم سناؤ بھئی، کالج کیسا لگا؟"

میں نے انہیں سب باتیں بتائیں۔

گوتم چاچا موٹر تیز تیز چلاتے ہیں۔ مگر انہیں اس پر انتہائی قابو بھی ہے۔ وہ بہت اچھے ڈرائیور ہیں۔ گھر آ گیا انہوں نے مایا سے کہا۔ میں اور تم منوہر کو کہیں باہر کھانا بھی کھلاتے ہیں اور پھر اسے اس کے ہوسٹل بھی پہنچا آئیں گے۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے کراچی اتنا آباد اور اتنا پر رونق نہیں تھا۔ دو ایک مشہور چینی ریستوران تھے، اور دو چار اچھا دیسی کھانا تیار کرنے والے ہندو ریستوران!

مایا کہنے لگی "چلتے ہو تو کہیں چینی کھانا کھلاؤ۔ گھر کی ترکاریاں اور ایک سی چیزیں کھاتے کھاتے تو دل بھر گیا ہے۔

"گوتم کہنے لگے "منوہر سے پوچھ لو یہ چینی کھانا کھا سکے گا۔

"کیوں بھئی چینی کھانا کھاؤ گے، مایا نے اگلی سیٹ پر سے منہ پیچھے کر کے مجھے پوچھا

میں نے اس سے پہلے کبھی سوائے اپنے کھانے کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میرے بابا کٹر قسم کے مذہبی آدمی ہیں، رشیوں منیوں کی طرح وہی کھاتے ہیں، جو کتابوں میں لکھا ہے، وہی

ٹھوگ کرتے ہیں، جو دیوتاؤں نے آدمیوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ سنکاروں کے مطابق رہتے ہیں۔

میں نے کہا "ماما کے پاس رہتے ہوئے ماں کے ہاتھ کا پکا کھاتے رہے ہیں۔ اب آپ جو کھلوا دیں۔"

"تو تم نے ابھی اسے مایا کہنا شروع نہیں کیا" مگر تم نے ہنس کر موڑ ایک کوٹھی کے اندر موڑ دی۔ "یہ رہا تمہارا کھانے کا گھر" وہ موٹر کو بند کر کے نیچے اتر آئے۔

ہوا چل رہی تھی اور پہلی بار اس گھپ اندھیرے میں میں نے محسوس کیا کہ مایا اگر کسی کی طرف ذرا غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو اس کے پسینے چھوٹ سکتے ہیں، اس کی نبضیں تیز ہو سکتی ہیں، اس کا دل دھڑک سکتا ہے۔ مایا میں ایک ایسی طاقت ہے جو اس کے کمزور جسم سے بہت زیادہ قوی ہے۔ جانے اس کا منبع کہاں ہے؟ مگر یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ میں ذرا سا گھبرایا ہوا نیچے اترا۔ مایا نے اپنی ساڑھی کی سلوٹوں پر ہاتھ پھیرا گوتم چاچا کے سفید بالوں نے مدھم جلنے والی چینی طرز کی لالٹین کی روشنی پکڑ لی، اور وہ الہ دین کے چراغ والا جادوگر لگنے لگا۔ برآمدے میں نہایت نفیس لکڑی کے کام کے بنے ہوئے پردے کے پیچھے سے نکل کر ایک لڑکی نے ہمارا سواگت کیا اس کی لمبی قمیض کا چینی سلک اژدھوں کی سبز تصویروں والا تھا اور اپنی دبی دبی جھجک کے ساتھ بہت بڑھیا معلوم ہوتا تھا۔ ہال ایک دل لبھانے والے ساز کی آواز سے بھرا تھا ساز بجانے والے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ صدائیں جو دل میں پرانی یادیں جگاتی اور نیند کی طرح خوش آئند ہیں، ہلکی ہلکی نشہ لانے والی دھیمے سُروں میں کانوں سے نہیں آتما کے اندر اتر جانے والی ساری نشستیں اس انداز سے لگائی گئی ہیں کہ بڑے بڑے منقش پردوں کے پیچھے چھپا جا سکے۔ مدہوش کن سی فضا جس میں تیسرا آدمی اجنبی لگتا ہے اور باتیں کرنا بیکار معلوم ہوتا ہے۔

مایا اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گوتم اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"پچھلی بار سے اب تک انھوں نے بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔

"کیا کچھ" مایا نے بھولے سے کہا۔

یہ دیکھو پچھلی بار جب ہم آئے تھے تو ان لیمپوں کے شیڈ سرخ تھے۔ اب سبز ہیں۔ اور تم نے دیکھا۔ باہر برآمدے میں خوش آمدید کہنے والی لڑکی کا لباس کتنا بڑھیا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ نئی آئی ہے کیونکہ پچھلی لڑکی سے اس کا انداز زیادہ دل نشیں اور آواز زیادہ سُریلی ہے۔ اس کی آنکھیں رسیلی اور ہونٹ بھرے بھرے ہیں۔ وہ اتنی صحت مند نہیں تھی، شاید یہاں کی آب وہوا نے اس کو مجبور بنادیا تھا۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ان کا اصل سٹور چین میں ہے باسی سڑی ہوئی پرانی چیزوں کو ٹھیک بنانے کے لیے یہ واپس وہیں کو بھیج دیتے ہیں اور یہاں کے شوکیسوں میں سجانے کے لیے نئی لڑکیاں لے آتے ہیں، نئی چیزیں۔"

مایا اور میں اس کی باتیں سن رہے تھے۔ میں نے کہا آپ کی نظر بہت گہری اور بڑی مفصل ہوتی ہے۔ ایک ہی نظر میں آپ نے اس لڑکی کی اتنی تفصیلات کو جان لیا۔

گوتم نے کہا "منوہر میں ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر کو ماہر نفسیات، شعبدہ باز، گرو سب کچھ ہونا چاہیئے۔

مایا نے کہا "ہر شے کو ہر وقت تجزیہ کرنے سے زندگی کا مزہ ہی کیا رہ جاتا ہے پر بات یہ ہے کہ تمہاری نظریں عورت کی کھال کے اندر باہر زیادہ دیکھتی ہیں۔"

گوتم نے ہنس کر کہا "تمہیں اگر شکایت پیدا نہ ہوتی تو میں سمجھتا تمہیں مجھ سے ذرا سا لگاؤ بھی نہیں ہے۔"

مایا نے پردے کے پیچھے کھڑے ویٹر کو اشارہ کیا۔

گوتم کو قریب سے دیکھنے اور اس کے مزاج کی رَس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس سے ایک تفصیلی ملاقات ہی کافی نہیں ہوتی۔ وہ ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے مثال ماہر نفسیات بھی ہے اس کی نظر بہت سی چیزوں کا ایک ہی وقت میں جائزہ بھی لے سکتی ہے، اور وہ ان سے حظ بھی اٹھا سکتا ہے اس کی شخصیت میں جادو کا سا اثر ہے اور کبھی کبھار اس کی اس خود اعتمادی کی وجہ سے تم اس سے بے پناہ

نفرت بھی محسوس کر سکتے ہو۔ اس کی کہی ہوئی بات کم ہی مجبوری ہوتی ہے۔ وہ دوسرے پر اپنا آپ مسلط کرنا نہیں چاہتا اس کے باوجود کوئی اس کے جادو سے آزاد نہیں رہ سکتا

ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ گوتم نے کہا "بھتیجے چینی کھانے کو تم ایک ہی بار کھا لینے سے پسند نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے تمہیں اپنے مزے کو باقاعدہ ٹریننگ دینی ہوگی۔ کیونکہ یہ کھانے ایک خاص طرز زندگی ایک خاص طرز احساس اور ایک اجنبی انداز فکر کی نشان دہی کرتے ہیں، یہ تہذیب بہت دور سے آئی ہے مگر پھر بھی اتنی دور سے نہیں کہ تم اس کو اپنا نہ کہہ سکو۔

مایا نے کہا "آج یہ اپنی رشی اوتار کی موڈ میں ہیں۔ آج اپنی ساری علمیت پلے بل ہوتے پر جادوگر کی طرح اپنی ساری پونجی داؤ پر لگا کر اس کا اثر تمہارے چہرے پر دیکھنا چاہیں گے۔

گوتم نے ہاتھ ہلا کر کہا "میرے ساتھ زیادتی ہے بالکل زیادتی مایا تم کو معلوم ہے مجھے اتنا وقت ہی کہاں ملتا ہے کہ کسی سے اپنے جی کی بات کہہ سکوں، یہاں تک کہ میری تو تم سے بھی کم ملاقات ہوتی ہے۔ رات کو گیارہ بجے کلینک سے لوٹتا ہوں تو گدھے کی طرح اتنا تھکا ہوا کہ ڈھنگ سے ڈھینچوں ڈھینچوں بھی نہیں کر سکتا۔"

میں زور سے ہنسنے لگا۔ وہ کیسی مضحکہ خیز بات کہہ رہا تھا۔

گوتم نے کہا "ڈاکٹر کی زندگی اور گدھے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ اتنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ان بیس برسوں کے عرصے میں میرا کتنا جی چاہا ہے کہ میں کبھی طویل رخصت پر جاؤں۔ کراچی سے بس غائب ہو جاؤں، پھر برف پوش وادیوں میں پھولوں سے بھری ہوئی زمینوں پر طویل سیریں کروں، میلوں پیدل چلوں، صبح سے شام تک پیدل چلتا رہوں، اونچی آواز میں گیت گاؤں، اس قدر زور سے چلاؤں کہ اپنی آواز کی بازگشت سن سکوں، آدمی کے جی میں کیسی کیسی تمنائیں ہوتی ہیں۔

"مایا کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ کبھی تم بھی اس بساندے ہوئے ٹڈی مارے شہر سے دور کہیں جاؤ۔"

مایا نے کہا "میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے تمہاری بساط پر میں تو ناکارہ

مہرہ ہوں، میرے لیے کلفٹن کی ہوا بہت ہے۔ میرے سینے میں کوئی دل ہے جو چاہے گا یا دماغ میں کچھ ہے کہ میں سوچوں گی چینی ریستوران اور بس!"

میں نے کہا: "اب کے چھٹیاں ہوں تو آپ لوگ میرے ساتھ چلیں!"

گوتم نے چمچ رکھ کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔

"مایا یہ مزے کی بات ہے منوہر کے ساتھ اب کے تم چلی جانا۔

"تمہارے بنا کیا جاؤں گی؟" مایا نے نہایت بد دلی سے کہا۔

ارے بھئی میں بھی تم سے آن ملوں گا۔" میں دو تین ماہ تک متواتر کلینک نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہاری طرح میرے پاس فالتو وقت کہاں ہے۔

اور پھر اس چینی ریستوران میں سبز شیڈ والے چینی لیمپوں کی روشنی میں لکڑی کے نفیس پردے کے پیچھے ہم تینوں نے ہولے ہولے سارا پروگرام بنایا۔ گوتم اتنے جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا جیسے مایا کی خوشیاں ہی اس کی زندگی ہوں اور اس کی خوشیوں کا حصول ہی اس کا سرمایہ۔ مایا اس سارے عرصے خاموش رہی وہ اداس نہیں تھی، صرف نہایت لاپرواہی سے بیٹھی تھی جیسے اس ساری بکواس میں نہ اسے یقین ہو اور نہ ہی وہ اس کی کچھ پروا کرتی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ گوتم اور مایا کا جوڑا ایسا تھا کہ ایک دوسرے سے بے نیاز تھا مایا اکیلے پن میں مگن تھی اور گوتم اپنے کلینک میں۔

میں نے کہا۔ "آپ کو ہمارے ہاں جا کر خوشی ہو گی۔"

مایا نے کہا: "تم مجھے مایا نہیں کہہ سکتے مجھے اس آپ جناب سے سخت نفرت ہے۔

گوتم نے کہا "بھتیجے یہ روائتی عورت نہیں کہ تم اسے رشتے سے جوڑ سکو۔ مایا صرف اور محض عورت ہے، میری بیوی کم اور عورت زیادہ ہے۔ یہ صرف مایا ہے سمجھے۔

پھر مایا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

یہ جس ماحول سے آیا ہے وہاں تو محلے کی عورتیں بھی کچھ نہ کچھ لگتی ہیں کسی نہ کسی رشتے کی ڈور میں بندھی ہیں، تمہارے اس نظریئے کو سمجھنے کے لیے منوہر کو وقت چاہیئے۔"

دوسرے لوگ اور پردوں کے پیچھے سازوں کی دھن میں صداؤں کی اس لے پر مدھم روشنی کی اس لَو پر جانے کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ ہر آدمی دوسرے سے الگ طرح سوچتا ہے۔ دیکھتا ہے۔

رات گئے جب وہ مجھے ہوٹل چھوڑنے کے لیے مڑے ہیں تو الوداع کہنے والی چینی لڑکی کی مسکراہٹ اس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پر بڑی مؤدب اور دلفریب تھی اور اس کے جسم کے زاویے بڑے خطرناک تھے جو چینی ریشم کے چُست لباس میں واضح بھی نہیں تھے اور چھُپتے بھی نہیں تھے۔ مایا نے کہا، آدھی رات ہو چکی ہے۔ اب منوہر جاکر اپنے ساتھ والے لڑکے کو تنگ ہی کرے گا۔ کیوں نہ یہیں سو جائے۔

گوتم نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں شریمتی۔ آپ کا گھر ہے اور آپ جسے چاہے اپنے ہاں مہمان رکھ سکتی ہیں "۔ اس نے موٹر گھر کی طرف موڑ لی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کراچی کا شہر اونگھنے لگا تھا۔ سڑکوں پہ بتیاں سوئی سوئی تھیں اور چاند کی روشنی میں پھیکی لگتی تھیں۔ سینماؤں کا شور کہیں دور ہو رہا تھا۔ لوگ آخری شو ختم ہونے پر گھروں کو جا رہے تھے۔

برج کے اُوپر والے کمرے کی کھڑکیاں کھُلی تھیں اور سمندر کی نمی سے بھری ہوا چاندنی کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ فرش پہ بچھے قالین تک کے پھُول چاندنی میں دمکتے اور مہکتے خوشبُو دینے لگ گئے تھے۔ مایا نے مجھے گوتم کا رات کے پہننے کا پائجامہ دیا تھا۔ جو میرے ٹخنوں سے اُونچا تھا۔ اِکّا دکّا موٹریں گزر رہی تھیں اور ان کی روشنیاں کبھی کبھار پتوں سے چھن کر کھڑکی کی چوکھٹ کے باہر ہی کھڑی رہتیں۔ ہوا میں پتے سرسرا رہے تھے اور چمک رہے تھے۔ مجھے لگتا تھا میں کسی جادو کے دیس میں آ گیا ہوں اور جانے اب کیا ہونے والا ہے، میرا روآں روآں منتظر تھا۔ جانے کا ہے کو، پھر وہی کوئل کی کوک سُنائی دی، اتنے قریب سے جیسے وہ خود اس کمرے میں ہو، اس کھڑکی کے چوکھٹ کے باہر ہو۔ میں سحر زدہ سا اٹھا اور بالکنی میں آ کھڑا ہُوا۔ اس کے برابر کی بالکنی گوتم کے کمرے کی تھی۔

شیام کے رونے کی آواز آئی پھر آپا نے شاید اسے سُلا دیا ہوگا۔ اور کوئی صدا نہ تھی۔ کوئل بھی کوک کر سو گئی تھی۔ مجھے اپنی ماں یاد آ رہی تھی اور میں اکیلا تھا۔ میری منزل دور تھی

پھر گوتم کی آواز آئی "مایا میں باتیں نہیں کر سکتا۔ مجھے اس رات کا تو جادو کیا بڑھے سے بڑا خطرہ بھی اب نہیں جگا سکتا۔ اگر تم کو نیند نہیں آ رہی اور تم باتیں کرنا چاہتی ہو تو جاؤ منوہر سے باتیں کرو۔ جاؤ اچھے بچوں کی طرح باہر کھیلو"

پھر بالکنی میں مجھے مایا کا سراپا نظر آیا، وہ درخت کے سائے میں بہت دیر کھڑی رہی اور پھر آہ بھر کر اندر چلی گئی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ کیسے وہ دو سراتھ کے لیے پریشان ہے اور گوتم اس سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسے وہ دس پندرہ سال کی بچی ہو جس کو جھڑکا جا سکتا ہے، پیار کیا جا سکتا ہے۔ جو اس کے بچے کی ماں تو ہو سکتی ہے مگر اس کی بیوی نہیں، وہ اس کی شریکِ حیات نہیں صرف گھر کی مالکن تھی۔

میں نے سوچا میری بہنیں بھی ہیں، جانے انہیں کیسے لوگ بیاہ کر لے جائیں گے۔ اجنبی اور سخت گیر جو انہیں نوکرانیوں سے زیادہ نہیں سمجھیں گے جو گھر میں صفائی اور سکون کی خاطر عورت چاہیں گے۔ دل کے رازوں کی حصہ دار بنانے کے لیے نہیں

مجھے مالتی یاد آئی گھر اور گھر کی ساوگی اور برف پوش پہاڑوں کی تنہائی وادیوں میں گونجتی صدائیں خوبصورت شامیں پاگل کر دینے والی چاندنی اور درختوں کے لمبے سایوں کے نیچے بہتے والے خاموش جھرنے۔ اونچی نیچی راہوں پر ہرنیوں کی طرح چلتی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں صحت مندی اور حسن کی تصویریں، غربت سے بے بس مگر پھر بھی خوش لوگ

اتوار کے دن زندگی کی رفتار بہت سُست ہوتی ہے نہ تو بھاگتے ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور نہ ہی تیز تیز موٹریں بھگاتے ہوئے دفتروں میں جاتے ہوئے افسر شہر دیر سے جاگتا ہے اور سستاتا ہے۔ جیسے کوئی اطمینان سے دھوپ تاپے یسمندر کے کنارے ریت پر لیٹ کر سورج کی شعاعوں میں اپنی جلد کی مرمت کرے، گوتم کو تو روز کی طرح کلینک جانا تھا۔ اس لیے میرے اُٹھنے سے پہلے وہ جا چکا تھا، چائے میرے برابر میز پر پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میرا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

مگر پھر ہوسٹل جانے کے خیال سے اُٹھ کر میں نے غسل کیا، پانی ٹھنڈا لگا اور نیند کا ماتا جسم جاگ گیا۔ نہا کر باہر نکلا ہوں تو باورچی نے کہا "ناشتے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے" میں من ہی من میں مسکراتا جیسے کہانیوں کا راجکمار ہو۔ کھانے کے کمرے کی طرف چلا۔ مایا کی آنکھیں سُرخ تھیں، مگر یہ تو میں نے بعد میں دیکھا ہے وہ تو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوں تو بھی اس نے نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے بال کھُلے تھے جو سیاہ تھے اور اس کی کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ناتواں جسم کے گرد یہ بال جیسے جال ہو۔ اس نے خاموشی سے چائے بنا کر پیالی میری طرف بڑھا دی۔ اس کے ہاتھ کتنے خوب صورت تھے اور انگلیاں کتنی مکمل گوتم کی طرح میں نے ابھی سے چیزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

مایا تم نہیں پیو گی چائے۔

اُس نے میری طرف دیکھا آنکھیں کتنی سُرخ تھیں۔

میں نے کہا "رات بہت دیر تک جاگی ہیں۔"

نہیں زیادہ دیر تک تو نہیں۔ یہ تو میرا معمول ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے
"پہلے تو کبھی آپ کی آنکھیں ایسی نہیں ہوئیں۔"

"منوہر سب دن ایک سے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھار ایسی باتیں بھی تکلیف دیتی ہیں جس کے لیے ہم سوچتے ہیں، ہم عادی ہو چکے ہیں۔" اس نے ہولے ہولے کہا۔

"رات تو ہم لوگ خوش و خرم ہنستے ہوئے گھر آئے ہیں کیا ہوا تھا۔" میں نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔ گوتم کے لیے کبھی نہ کوئی بات اہم ہوتی ہے اور نہ بڑی۔ میں اس کے نزدیک بچی ہوں۔ اس سے بیس سال چھوٹی۔ تمہیں پتہ ہے اس نے مجھے گودیوں کھلایا ہے۔ جب میں پیدا ہوئی ہوں تو یہ لوگ ہمارے برابر میں رہتے تھے۔" وہ شکایت نہیں کر رہی تھی۔

"ایک بچی کی طرح اس نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ اب اس کے لیے میری

حیثیت محض اس کے بازوؤں میں کھیلنے والی مایا کی سی ہے۔ میں اس کے لیے اور کچھ نہیں ہو سکتی، اور کچھ نہیں۔"

آنسوؤں کے ریلے سے اس کی آواز ٹوٹتی ہوئی لگی۔

چائے کی پیالی سامنے رکھے میں سوچتا رہا کہ گوتم اور مایا کا معاملہ قابلِ رحم ہے

وہ چھپکے چھپکے روتی رہی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی بھی کوشش نہیں کی آنسو جو اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے اس کے ہونٹوں کے کناروں پر رک رہے تھے اس کی ساڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

"رات میں نے چاہا اس سے باتیں کروں، مگر ہر رات وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا ہے اور اتنا نیند کا ماتا کہ کھانا کھاتے ہی ایک بات کئے بنا سو جاتا ہے۔ مجھے صرف پیسے کی، زندگی کے آرام کی بھلی کی چیزوں کی ہی ضرورت نہیں، اس کی توجہ کی ضرورت بھی ہے۔ شیام پیدا ہوا تو میں نے سوچا تھا۔ اب میرا من اس میں لگے گا مجھے گوتم کی توجہ کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔ مگر پرانا زخم پھر ہرا ہو گیا ہے۔ وہ تنہائی میں مجھ سے کبھی اتنی باتیں نہیں کرتا جتنی دوسروں کے سامنے۔ دوسروں کے سامنے وہ مجھ پہ اپنی توجہ صرف کرتا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا سرمایہ کہتا ہے مجھ پر جان چھڑکتا ہوا لگتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ ہم سے خوش قسمت جوڑے بہت کم ہیں۔ تم نے دیکھا۔ رات وہ تمہاری موجودگی میں کس طرح مجھ پر سے نچھاور ہو رہا تھا۔ میرے لیے پروگرام بنا رہا تھا۔"

میں نے کہا "مایا تم آج ضرورت سے زیادہ دکھی کیوں لگ رہی ہو۔"

کہنے لگی "آج تم دیکھ رہے ہو، میری باتیں سن رہے ہو۔ روز میں اپنے دکھ کے ساتھ اکیلی ہوتی ہوں۔"

میں نے کہا "اگر تم اپنے آپ کو مصروف رکھو تو اکیلے پن کا یہ دکھ تمہیں تکلیف نہ دے۔"

کیا کروں آخر، میں کیا کروں، تم بھی سمجھنے کی بجائے مجھے نصیحت کرنے لگے ہو

اس نے سر اپنے بازوؤں کے حلقے میں رکھ لیا، اور سسکنے لگی۔

"دیکھو ڈرکر ہیں آیا ہے یہ لوگ کیا سوچیں گے؟"

"سوچیں گے انہیں سوچنے دو۔" اس نے بازوؤں میں سر دیئے دیئے اسی طرح سے کہا۔"

اس کا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا۔

"مایا۔ مایا۔ مت روؤ مایا" میں نے بہت منت سے اسے کہا۔

نہیں میرے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تم سے میں نے اس لیے بات نہیں کی تھی کہ تم گوتم کے بھتیجے ہو، گوتم اور اس کا کوئی بھی میری تنہائی کے دکھ کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

"منوہر اس زندگی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ نئے زمانے کا دکھ ہے، ہر آدمی اکیلا ہے اور مصرف ہے اور مصروف تر ہوتا جاتا ہے۔ گوتم مجھے بیوی نہیں، باندی سمجھتا ہے، اور باندی کے لیے کون وقت نکال سکتا ہے؟"

"وہ میری شکایت کو میرا بچپنا سمجھتا ہے مگر اصل یہ ہے کہ وہ اپنے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ نئے زمانے کا شکار وہ بھی ہے اور میں بھی اور ہماری زندگی بھی۔"

"تمہارا رونا محض وقت گنوانا ہے، جب تم جانتی ہو کہ تمہاری طرح کی اور بہت سی زندگیاں یونہی شکار ہو رہی ہیں تو پھر تم کیوں اتنی شدت سے اسے محسوس کرتی ہو"

مایا نے کہا تھا "اور لوگ ہیں وہ تھوڑے وقت میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم کو پروا نہیں ہے۔ اس کے لیے میرا وجود محض فضول شئے ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ کیا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے؟"

"میں نے تو ابھی پیسہ کمانا شروع نہیں کیا۔ میں کیا جانوں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ارے ناشتہ تو تم نے کیا ہی نہیں۔ مجھ پر کبھی کبھار ایسے دورے پڑتے ہیں، روتی ہوں اور پھر خود ہی چپ ہو جاتی ہوں۔ تم یہ کچوریاں تو کھاؤ، میں نے تمہارے لیے

بنوائی تھیں۔"

آیا، شیام کو لے آئی، اور میں اسے اٹھا کر پورچ کے اوپر والے کمرے میں آگیا اس کے ساتھ کھیلتا رہا۔ پھر مایا بھی وہیں آگئی۔ وہ بچے کے ساتھ بھی اتنی خوش تھی آیا نے کہا اگر ہو سکے تو وہ اپنے بچوں سے ملنے چلی جائے۔ شام تک آجائے گی۔

مایا نے کہا "منوہر اگر تم ٹھہر و تو میں آیا کو چھٹی دے دوں۔ تین چار بجے تو تم آجاؤ گے۔ آج اُن کا کلینک نہیں ہوگا، ہم مل کر پکچر دیکھیں گے۔"

اس کے سوال میں اتنا اپنا پن تھا۔ اور وہ جذباتی ہو کر میرے سامنے رو چکی تھی، اس لیے باوجود چاہنے کے میں جانے کا نام نہ لے سکا۔ شیام سو گیا تھا۔ دوپہر ہو گئی۔ میں اور مایا تاش کھیلتے رہے۔ پھر اس نے گوتم کے کھانے کا بندوبست کیا۔ ہم لوگ ذرا کی ذرا لیٹے پھر اُٹھ کر پکچر دیکھنے چلے گئے۔ رات کا کھانا میں نے نہیں کھایا اور پیدل ہی ہوسٹل کی طرف چلا مایا نے کہا بھی کہ ہم تمہیں پہنچا آتے ہیں مگر میں نے پیدل چلنے کو زیادہ مناسب سمجھا۔

ایک ٹرم ختم ہو گئی ماں کا خط آیا "دِل لگا کر پڑھو، کرایہ کافی ہے، آنے جانے میں بہت خرچ اُٹھ جائے گا۔ اس لیے اگر اپنا آنا دوسری لمبی چھٹیوں پر اُٹھا رکھو

تو بہتر ہے، مجھے اس آنے والے وقت کا خیال آتا ہے، جب تم پڑھ لکھ کر بڑے کامیاب ڈاکٹر بن جاؤ گے اور میں فخر سے اپنا سر اُونچا کر سکوں گی۔ مالتی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ روتی بھی ہے، تمہارے پاس آنے کی ضد بھی کرتی ہے، مگر لڑکیوں کی ضد کیا ہے"؟ ایسی ہی چھوٹی بڑی باتوں سے خط بھرا تھا۔ پھر چھوٹا سا پرزہ تھا۔ بڑی بہن کا وہ سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا مجھے یاد کرتا تھا۔ بھلا ذرا سا بچہ مجھے کیا یاد کرتا۔ بس میرا جی خوش کرنے اور مجھے اپنی یاد کا یقین دلانے کے لیے اس نے لکھا تھا۔ چھوٹے بھائی کا خط تھا۔ اس نے اپنے اسکول کی گپ شپ لکھی تھی۔ ٹیم کا کپتان ہو گیا تھا۔ استاد اس سے خوش تھے۔ شکار کی ایک ٹولی بنائی

بھی اور کُتّے پال رہا تھا کتوں کی قسمیں اور ان کی اچھی بُری نسلیں چار مضمون کا ایک دفتر تھا اسے مجھ سے محبت بھی مجھ پر وشواس تھا، اور اس لیے اس نے خط میں اپنے منصوبوں کے متعلق سب کچھ اُگل دیا تھا۔

خط پڑھ کر میرا جی ایک دم اداس ہوگیا۔ پَر ہوتے تو میں اُڑ کر چلا جاتا مگر چھٹیاں صرف دس پندرہ دن کی ہی تھیں، اور ہم اتنے امیر نہ تھے بابا ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑتے تھے تب کہیں جاکر مہینہ گزرتا تھا۔ ضروریاتِ زندگی یہاں نسبتاً سستی تھیں ورنہ بڑے شہروں میں تو گزارہ مشکل بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔

گوتم نے کہا "ہوسٹل میں کیا پڑے رہوگے، اب گھر نہیں جارہے۔ تو یہاں آجاؤ۔"

مجھے یاد آگیا بابا نے کہا تھا رشتہ داروں کی ہمدردی اور محبت کو آزمانے سے پہلے بُرے وقت کے لیے سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ میں نے اس سے کہا "میں پڑھنا چاہتا ہوں" تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگیا۔ پھر بابا سے کہنے لگا "سوگند لے لو جو میں نے امتحان کے لیے ایک ماہ سے زیادہ کبھی پڑھا ہو۔ تم کہاں کے اتنے پڑھنے والے آگئے پاگل نہ بنو۔ بھلا امتحان سے چھ ماہ پہلے بھی کوئی پڑھتا ہے۔ میری مانو یہاں آجاؤ۔ شیام تم سے کافی ہل گیا ہے خوش ہوگا۔"

مایا اس ساری گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لے رہی تھی، وہ اطمینان سے بیٹھی تھی، جیسے میرے یہاں آنے یا نہ آنے سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

دوسرے دن گوتم میرے ہوسٹل پہنچا اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر لے آیا۔

بڑکے سائے میں کوئل کی کوک سے بھرے اور سات رنگوں والے کمرے میں میرا تقریباً پندرہ دن ٹھہرنا ہونے کے یہ سامان تھے۔

گوتم جب کلینک جارہا ہوتا تو میں بالکنی میں کھڑا ہوتا، اسے الوداع کہتا کبھی کبھی کبھار مایا بھی وہیں آجاتی اور میرے ساتھ ہی پتّوں کی اوٹ میں کھڑی ہاتھ

بلاتی۔ تین چار دن کے اندر ہی مجھے لگنے لگا جیسے گوتم تو وقتی طور پر یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ گھر مایا کا اور میرا ہے۔ کتنا عجیب خیال تھا، بگاڑنے والے خیالات، خراب کرنے والا، بُرا خیال، اور اس خیال کو ذہن سے دور بھگانے کے لیے میں نے تپسیا کرنے کی حد تک اپنے آپ کو گھیر گھار کر اندر ہی روکے رکھا ہے۔

دوپہر کو کھانے پر ہماری ملاقات اس سے ہوتی تو وہ مریضوں، دواؤں اور ایسی ہی بنا سر پیر کی باتوں میں ہمیں اُلجھا دیتا۔

مایا کے لیے میں بھی شاید شیام سے بڑا ایک بچّہ تھا، وہ مجھے اور شیام دونوں کو حکم دیتی سر کے بَل کھڑے ہو جاؤ۔ ہنستے ہنستے دوہرے ہوتے۔ ہم دونوں اس کی بات ماننے میں لگ جاتے۔ کہتی بے شک میں مایا ہوں مگر ہو تو تم گوتم کے بھتیجے اور شیام کی طرح کے بچّے تو ہو۔"

میں کہتا جس طرح شیام تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر تمہیں اپنے ساتھ لگاتا ہے۔ تمہارے مُنہ کو اپنی طرف پھیر کر تمہاری آنکھوں میں جھانکتا ہے۔ میں ایسے کب کر سکتا ہوں۔

بنا غصّہ ستائے کہتی "بڑوں کو یہ رعایت نہیں ملا کرتی من ہر"

"تم مجھے من ہر کیوں کہتی ہو؟ میرا نام تو منوہر ہے۔" میں اس سے پوچھتا۔

"بس ہمیں اسی طرح اچھا لگتا ہے تمہارا نام من ہر کا مطلب ہے من کو جیتنے والا۔" وہ ہنس کر کہتی۔

"اگر من جیتنے لگوں تو میں کام کیسے کروں گا۔ میری زندگی ہے۔ اس کے پیشے میں بھلا پاگل آدمی بھی کچھ کر سکتا ہے۔ نہیں مایا مجھے یہ سراپ نہ دو۔ میں تو تم سے اشیرواد لینے کے لیے اتنی دور آتا ہوں، تم شیام کی ماں ہو۔" میں نے اس سے کہا۔

ایسا ہی ملا جُلا سا رشتہ تھا میرا اور اس کا۔ میرا من اُلجھتا تھا۔ کبھی لگتا وہ دیوی ماں کی طرح مہربان ہے۔ ہنستے ہنستے وہ رک جاتی، اور بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگتی جن میں سوال ہوتے اور میں گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

کیا بات ہے من ہر تھک گئے ہو کیا؟ وہ بڑی بہن کے سے پیار اور توجہ سے پوچھتی
میں پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ بڑے ہوش رُبا انداز میں بازو پیچھے کی طرف
ٹیکے ان کے سہارے جھکی یُوں کہ اس کا سارا جسم اُوپر کی طرف تنا ہُوا ہے۔ بیٹھی ہوئی
ہوتی ہے پہلے پہل مجھے اس کی اس بے باکی سے بہت شرم آئی۔ پھر مجھے اُسے یُوں
دیکھنے کی عادت پڑ گئی۔ دیکھنے کی دعوت دینے کا یہ انداز بولتی ہوئی آنکھیں، ہنستے
ہوئے ہونٹ، مجسمے کی طرح اپنے کو بنانے والے کے فن کی داد طلب کرتا ہوا جسم
ان دنوں مجھے مصوّری اور آرٹ کسی کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ جتنی عورتیں بھی
زندگی میں آئی تھیں، انہوں نے اپنے جسم کو ختہ الوں کی طرح چھپایا ہی تھا۔ مایا کی
یہ اپنا آپ ظاہر کرنے کی خواہش مجھے اس کی طرف کھینچتی تھی۔ لگتا تھا میرے اندر
کوئی شے اتنی تنی ہوئی ہے جو ذرا سی حرکت سے ٹوٹ جائے گی۔

مایا نے خاص ریاض کیا تھا وہ ایسے ہی بُت کی طرح بیٹھی رہتی اور مجھ سے
باتیں کئے جاتی۔

اس کا باتیں کرنے کا انداز ہی تھا جو اس کے جسم کے خطوط میں دلآویزی،
آنکھوں میں جادو بنتا تھا۔ ہم دیکھی ہوئی پکچروں کی کہانیاں پھر سے دہراتے بحث
کرتے، وہ ہیروئن کی طرف داری کرتی اور میں ہیرو کی۔ اب مطمئن جانور کی طرح
جو پیٹ بھرنے کے بعد اپنے شکار کو سامنے دھرے پنجے چاٹتا ہے۔ وہ گوتم سے متعلق
بہت کم بولتی اور میں حیران تھا وہ اس دن روتی ہوئی المیوں کا ذکر کرتی ہوئی عورت
کیا ہوئی؟ میں اپنے کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی میں یہ سوچ
سکتا تھا کہ وہ میری وجہ سے مطمئن تھی۔

ایک شام گوتم کہنے لگا "مایا تم منوہر کو لے کر سیر کو کیوں نہیں چلی جاتی، میرے
ایک دوست نے ہاکس بے سے دور ہٹ بنائی ہے اسے کسی بڑے مصور سے پینٹ
کروایا ہے۔ مگر اس کی بیوی انڈیا چلی گئی ہے۔ اب قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے
وہ کچھ دیر اور آنہ سکے گی، وہ یہ ہٹ اسے تحفتہً دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بھی

دعوت دی ہے بلکہ کہا ہے کہ اگر چاہوں تو دو چار دن ایک ہفتے کے لیے جا کر رہوں۔ میری اپنی تمنا ہے کہ سمندر کے کنارے گھر بناؤں اور اسے سجاؤں۔ پھر مایا کے ارپن کروں۔"

کہنے لگی "اگر تم ایسی باتیں نہ بھی کرو تو کیا ہے؟"

گوتم میز پر سے جھک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرے بالوں کی سفیدی میں سیاہی گھلنے لگی ہے۔ مایا کم از کم تم اس عمر میں تو مجھے جھوٹا اور فریبی نہ سمجھو۔"

مایا نے کہا "تم غلط سمجھے ہو نہ میں تمہیں جھوٹا کہتی ہوں، اور نہ فریبی، مجھے معلوم ہے سوچنے کی حد تک تم مجھے وردپدی اور اپنے کو بھیم سمجھتے ہو۔ سورگ کے سبب سے بڑھیا اور خوشبودار پھول تم میرے بالوں میں سجانا چاہتے ہو۔ مگر بھیم کی طرح تم اس پھول کو لانے کے لیے نرک اور سورگ کے فاصلے نہیں ناپنا چاہتے تمہارے خیال بہت بڑھیا اور تمہارا جوش صرف سوچ تک ہی رہتا ہے۔"

"ہیر ہیر" گوتم نے تالی بجا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھتے ہو منوہر میری بیوی کتنی بڑھیا تقریریں کر سکتی ہے۔ اس کی نظر کہاں تک پہنچتی ہے۔ تم بھی بھگوان سے دعا کرو کہ ایسی عمدہ دھرم پتنی تمہیں ملے۔

مایا نے چڑ کر کہا "تم کو تو میری عمدگی برتنے کی فرصت نہیں ہوتی وقت نہیں ملتا کہ مجھ سے بات کر سکو تمہارا کام ہی تمہاری زندگی ہے۔ کیوں نہیں مجھے منوہر کو دان کر دیتے۔"

"بات تو بہت معقول ہے اچھا سوچیں گے۔ اگر منوہر اب کے اچھے نمبروں میں پاس ہو گیا تو انعام کے طور پر ہم اسے مایا دے دیں گے۔" گوتم نے خوش دلی سے کہا۔

میں دم سادھے چپ تھا اور چائے کی پیالی میں دیکھ رہا تھا۔

گوتم نے کہا "منوہر بھتیجے گھبرا گئے ہو۔ مایا کا انعام تمہیں قبول نہیں ہے کیا؟ تمہارا رنگ اڑا ہوا کیوں ہے؟

میں نے اوپر دیکھا مایا میری طرف دیکھ رہی تھی دلچسپی سے اور آنکھوں میں ہنسی لئے

گوتم نے اٹھتے ہوئے کہا، "بھئی دو چار دن کے لیے نہیں تو ایک آدھ دن کے لیے چلتے ہیں۔ میں بھی چلوں گا اس نے اپنے ہٹ کی تعریف میں اتنی باتیں کی ہیں کہ میرا بھی جی چاہتا ہے دیکھوں۔"

مایا کھل اٹھی، بولی "اس سے اچھی بات کیا ہے۔ ارے اگر تم چلو تو میں ہر جگہ جا سکتی ہوں، بھلا کوئی تفریح تمہارے بنا بھی ہو سکتی ہے۔"

گوتم اس کے قریب کھڑا تھا مایا اپنی کرسی پر اکڑی بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا۔ پوجنے کی حد تک اُسے چاہتی ہے، صرف اسے۔ اس کے متعلق میں نے جو اندازے اتنے دنوں میں لگائے تھے، سب ایک دم غلط اور میرے اپنے ذہن کی پیداوار لگے عورت ایک پہیلی ہے کسی سے نہ بوجھی جانے والی۔ میں میز چھوڑ کر بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔ اس گھڑی مجھے اپنا آپ اتنا اکیلا اور قابل رحم لگا۔ قابل رحم مٹی کا کھلونا جو سات رنگ والے پرندے نے اپنی چونچ میں پکڑا ہوا تھا اور جسے اس نے گرایا تو وہ بنا آواز کے ٹوٹ گیا تھا۔ پتہ نہیں، اور لوگ اتنے بڑھیا سپنے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اس گھڑی مجھے ماں اور گھر بہت یاد آیا۔ پیسوں کی خاطر اپنی چھٹیاں یہاں گزار رہا تھا۔ فضول۔ بیکار۔ ٹیپ ریکارڈ کھلا تھا اور گوتم ناچ رہا تھا۔ اس کا ترشا ہوا جسم کسی دیوتا کی طرح مضبوط اور مکمل تھا۔ اس کے نپے تلے قدم بڑے اعتماد سے موزیک کے اس فرش پر پڑ رہے تھے۔ مایا نہانے کے لباس پر ایک سنہری لبادہ پہنے آلتی پالتی مارے ننگے فرش پر بیٹھی اپنے پاؤں کے ناخنوں پر رنگ لگا رہی تھی۔ اس کے بال لہراتے پیچھے تک پھیلے تھے۔ ہم صبح یہاں آئے تھے۔ سمندر گہرا نیلا صحرا کی طرح خاموش اور اپنے اندر طوفانوں کو دبائے پھیلا تھا۔ یہ رنگ جو سپنے لاتا ہے۔ یہ نیلا ہٹ جس کو دیکھ کر لگتا ہے۔ آکاش نیچے اتر آیا ہے ہوا میں ابھی وہ زور نہیں آیا تھا جو ہر شے کو اپنے ساتھ اڑاتا ہے۔ چھٹیاں منانے والے اور لوگ دور دور کی ہٹوں میں آئے ہوئے تھے۔ ہاکس بے پر جو رونق آج کل ہوتی ہے۔ ان دنوں وہ تو نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھار تو لگتا ہم دھرتی کے آخری سرے پر آن پہنچے ہیں

گوتم نے کہا "بھتیجے تمہارا میرے ناچ کے متعلق کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا "مجھے ناچ کی کیا خبر ہمارے ہاں تو صرف لڑکیاں ناچ سیکھتی ہیں؟
اور وہ بھی ضرورت سے شادی نہیں ہو سکتی نا!"
گوتم کہنے لگا "تمہیں معلوم ہے مایا سے بھی میں نے اسی لیے بیاہ کیا ہے کہ سارے سندھ میں اس سے بہتر ناچنے والی اور کوئی لڑکی نہ تھی۔"
مایا بولی اگر سوائے اس کے تم نے میری اور کوئی خوبی بھی دیکھی ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔
گوتم نے کہا "ناچنا دیوتاؤں کا اپنا پسندیدہ مشغلہ ہے اور دیوتا کو خوش کرنے کے لیے دیو داسی میں اس سے بڑھ کر خوبی اور کیا ہو سکتی ہے۔"
مایا اٹھی اور خاموشی سے اس کے ساتھ رقص کے چکروں میں گھومنے لگی۔ گوتم نے نیا اور کسی طویل ناچ کا فیتہ بدل کر لگایا۔ مجھے پھر اکیلے پن کے دکھ نے ستانا شروع کیا
شیام کے چہرے پر ہوا آکر لگتی تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں آیا کی ساڑھی کا پلو اُڑ رہا تھا۔ اور اس کے سر سے بار بار اُتر جاتا تھا۔ شیام ہنس رہا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے گلفتی کے دانت سُرخ ہونٹوں میں سے دکھائی دیتے بڑے پیارے لگتے تھے۔
گول مٹول سا چہرہ، وہ ہاتھ مار رہا تھا۔ اور یونہی ہنس رہا تھا۔ اس کی ٹوپی کا ربن اس کی ٹھوڑی کے نیچے تھوک سے بھیگ کر چپکا ہوا تھا۔ میں پتھروں پر پاؤں دھرتا آہستہ آہستہ نیچے اُتر آیا اور نیلے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دُور تک اندر بجتے ہوئے ساز کی گت نے میرا پیچھا کیا پھر ہوا اسے مخالف سمت میں اڑانے لگی اور میں اکیلا رہ گیا۔
بے دھیانی میں جب میں سمندر کے اندر تک گئی چٹان کو پھلانگ کر دوسری طرف کودا ہوں تو ایک بدیسی جوڑا لیٹا ہوا تھا میں کھنکھارا ہوں مگر انہیں کچھ خبر نہیں ہوئی اور مجھے اپنے ننھیال میں گزاری چھٹیاں یاد آئیں جب میں اسی طرح گھومنے نکلا تھا اور دو سانپوں کو بیچ در بیچ لپٹے دیکھ کر خوف کے مارے میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ اپنے پاؤں میں لپٹے اس جوڑے میں سے ایک نے میری طرف دیکھا تھا

مجھے پلٹتے دیکھتا رہا تھا۔ مگر یہ جوڑا انہیں تو کچھ خبر نہیں تھی۔ شاید یہ ہنی مون منانے نکلے تھے۔ یہ ان کا اپنا گھر تھا۔

ہوا میں تندی آتی گئی۔ سمندر کا صحرا جھاگ کے ریت اڑاتا گوتم کے بازوؤں میں چھپی طاقتوں کی طرح ہوئے ہوئے اٹھا اور ناچ کے چکروں میں گھومنے لگا۔ پھوار پڑنے لگی۔ میرا جی چاہا میں واپس نہ جاؤں۔ اس لیے میں آگے آگے چلتا گیا۔ کہاں کہاں بنا منزل کے ساحل کے ساتھ ساتھ ایک دو اور غیر ملکی جوڑے تھے۔ ننگے پاؤں میں مچھلی کے پاؤں کے سے پتوار باندھے تیر رہے تھے۔ ربڑ کی کشتی کو پانی میں ڈال کر کم گہرے پانی میں چلا رہے تھے۔ ان کے ماں باپ سمندر کے اندر تک بنی ہوئی چٹانوں تک تیر رہے تھے۔ زمین پر آخری انسان۔ مجھے بھی نمی سے بھری نیلاہٹ سے بھیگی پھواروں والی اس ہوا کے جھونکے جو ہوش اڑائے دیتے تھے۔ بھلے لگے قدموں کے نشانوں کو جھاگ اڑاتی لہریں مٹا دیتیں۔ فاصلے لمبے ہونے گئے۔ میں آگے ہی آگے نکلتا چلا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے اس تنہائی سے خوف آنے لگا۔ مجھے لگا میں ہوں ہی نہیں۔ ایک ناچیز ذرے کی طرح پانی کے ایک قطرے کی طرح۔ ہیبت ناک خوفناک سفید جھاگ اور رنگ برنگ پتھروں کی چمک تھی۔ میں ایک پتھر کے کنارے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پتھر اتنا بڑا تھا کہ میں اس کے کنارے پر ایک کیڑے کی طرح چمٹا ہوا لگتا تھا۔ جو اڑ جانے کے خوف سے اس پر لگ گیا ہو۔

ریت پر پانی کا سانپ مرا پڑا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں کھلی تھیں جیسے سمندر کی جرأت پر حیران ہوں۔ ہر جاندار اپنے آپ کو دنیا کا محور سمجھتا ہے۔

پر حیران ہوں۔ ہر جاندار اپنے آپ کو دنیا کا محور سمجھتا ہے۔

جانے میں کب تک وہاں بیٹھا رہتا۔ اگر ہوا کے کندھوں پہ اڑتی ممی کی آواز مجھ تک نہ پہنچتی۔

گوتم نے کہا "بھتیجے۔ تم نے تو ہمیں چکرا دیا تھا۔ کہاں گم ہو گئے تھے؟"

مایا نے کہا "تمہارا کیا دنیا تیاگ دینے کا ارادہ تھا؟"

میں نے کہا: "یہ جادو کرتا ہوا سمندر مجھے اڑا کر جانے کہاں لیے جاتا تھا؟"
گوتم نے کہا: "تو تم نے بھی چیزوں کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ جاگنے لگے ہو!"

مایا بولی "تم میں یہی خرابی ہے گوتم۔ ہر ایک سے یہ توقع کرنے لگتے ہو کہ وہ تمہاری طرح سوچے، تمہاری طرح رہے۔ تم اپنے آپ سے اتنی محبت کرتے ہو کہ اپنے سوا باقی لوگ تمہیں سوئے ہوئے لگتے ہیں۔"

دیکھا تم نے منوہر، گوتم نے ٹفن کی ٹوکری کھولتے ہوئے کہا "مایا ایسا کوئی لمحہ جانے نہیں دیتی۔ جب یہ مجھ پر حملہ آور ہو سکتی ہو۔ بھوکی شیرنی کی طرح ہر وقت تاک میں رہتی ہے۔"

پھر اس نے ایک بڑا سینڈوچ میری طرف اچھال دیا۔ اگر میں بروقت اسے پکڑ نہ لیتا تو گر گیا ہوتا۔

یہ لو اس نے مایا کی طرف بھی ایک سینڈوچ اُچھالا۔ شاید سوچکا تھا اور آیا دوسرے کمرے میں تھی۔

ہوا کے زور سے غبارے کی طرح پھولتے لبادے کو سمیٹتے ننگے پاؤں خطرناک پتھروں کے کناروں پر رکھتی مایا، گوتم کے پیچھے تیرنے کے لیے نیچے اتر گئی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے پھر ان کے ساتھ ساحل پر آ گیا۔

یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ دونوں کتنے مکمل ہیں۔ گوتم کی نگاہوں کے سامنے مایا پھول کی طرح کھل جاتی۔ اس کی شخصیت ہی بدل جاتی وہ ہر بات میں تکمیل کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس لیے اگلی صبح جب گوتم شہر جانے کے لیے تیار ہوا ہے تو میں نے سوچا مایا کتنی اداس ہو گی؟

وہ اپنے دوست کی موٹر پر چلا گیا تھا۔ ہم شام کو اس سے ملنے والے تھے یہ سارا دن ہمارے سامنے تھا۔ لمبا دن جس کے گھنٹے بوجھل پتھروں کی طرح سینے کو مسلتے ہوئے گزریں گے۔ میں گوتم کے سامنے اپنے کو کتنا ناچیز نا سمجھ

اور کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا، میں اب جاگ رہا تھا۔
جب دھول اڑاتی موٹر فاصلے میں گم ہو گئی تو مایا نے کہا۔
"آؤ ہم ساحل پہ دوڑ لگائیں۔ تم مجھے پکڑو۔"
میں نے کہا "بھر بھری ریت میں پاؤں دھنس جاتے ہیں۔ بھاگنا آسان نہیں"
اس نے کہا "تم بھاگو تو سہی۔ میں تمہیں پکڑتی ہوں۔"
"کل تو تم نے ایسا نہیں کیا۔ سنجیدہ باوقار گھریلو عورت کی طرح ناچتی اور تیرتی رہیں۔ یہ بچوں کا سا کھیل کھیلنے کے لیے میں رہ گیا ہوں" میں منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا
میرے کندھے سے پکڑ کر اس نے مجھے اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا "کل گوتم ہمارے ساتھ تھا اور میں اس کی ستی وساوتری بیوی تھی۔ آج تم میرے ساتھ ہو۔ ساحل اکیلا ہے اور ہوا میں نمی اور نشہ ہے تمہیں بتاؤں مجھے ہر روز مکمل بیوی کا پارٹ ادا کرنا اچھا نہیں لگتا" پھر میرے کندھے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔
اچانک میں نے اسے چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ میں اس چٹان کو پھلانگ کر کودنے ہی والا تھا جب اس نے مجھے آ لیا۔ ہم ایک ساتھ کودے اور وہ میرے اوپر گری میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے اٹھنے نہیں دیا۔ یہ وہی جگہ تھی۔ جہاں اس سے پہلے دن ایک بدیسی جوڑا ہنی مون منا رہا تھا۔ ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں بجانے لگی۔ طوفانی لہریں مجھے ڈھانپنے کے لیے بڑھنے لگیں، اور ماتمی راگ جیسے موت اور ابدیت کے ہوں میرے گرد گھومنے لگے۔ میں من۔ برہما اور سمندر کی نیلاہٹ مجھے پکار رہی تھی۔ کائنات کے اندر آوازیں مجھے بچانے کی ناکام کوشش میں مجھے پکار رہی تھیں۔ مجھے مایا سے کون بچا سکتا تھا؟ گوتم نے ٹھیک ہی کہا تھا وہ ایسی شیرنی تھی جو ہر وقت شکار کی گھات میں رہتی تھی۔
مجھے بھی اس نے شکار کر لیا۔ میں فنا ہو گیا تھا۔ میرا اپنا آپ کہاں تھا؟
جب ہم لوٹے ہیں تو بادل ہوا کے ساتھ ادھر ادھر سے اکٹھے ہو رہے تھے میرے منہ کا مزہ کڑوا تھا۔ میرے بالوں میں ریت بھری تھی اور دل کے اندر لہو کے

فوارے سے چھوٹ رہے تھے۔ میرا رواں رواں رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکلی ہوئی تھی۔ میں اپنے اس مردہ ناکارہ وجود کو گھسیٹ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنے آپ کو اس نیلاہٹ کے حوالے کر دوں۔ مگر اپنے اس وجود کو کیسے اس پانی کے حوالے کر دوں جو کتابوں میں لکھا تھا، دیوتاؤں کا ہے؟

میں فرش پر اوندھا لیٹا تھا اور وہ دوسرے کمرے میں اپنے بچے کے ساتھ ہنس رہی تھی۔ اس سے کھیل رہی تھی۔ میں دانت پیس رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھ پر ہنس رہی ہے۔ میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ ہوا باہر اتنی تیزی و تندی کے ساتھ چل رہی تھی کہ لگتا تھا اس ارمانوں سے بنی ہٹ کو تنکوں کی جھونپڑی کی طرح بکھیر دے گی۔ پھر بارش ہونے لگی۔ بوندیں طوفان مچاتی، ناچتیں رہیں۔ سمندر پھنکار رہا تھا۔ زخمی اژدھا کی طرح وہ اپنے دشمن کو فنا کرنا چاہتا تھا۔

پھر میں نے مایا کے ننگے قدموں کی چاپ سنی۔ اس نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ آہستہ سے پکارا "من ہر"۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"من ہر میری بات سنو، میری طرف دیکھو من ہر۔ میں تم سے معافی مانگنے تمہارے قدموں پر سر رکھنے آئی ہوں، من ہر اٹھو تو سہی، میری طرف دیکھو من ہر۔ بھگوان کے لیے میری طرف نہ دیکھنا، سیدھے تو ہو جاؤ۔ دیکھو اس پلنگ پر لیٹو۔ اٹھو تو سہی"۔

میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی دروازہ بند ہو گیا۔ جب اکڑے ہوئے جسم کو سیدھا کرنے کے لیے میں نے باہوں کے حلقے سے اپنا سر اٹھایا ہے، اور ارد گرد نظر کی ہے تو مایا جل پری کی طرح بال کھولے اپنے عکس کو بڑے آئینے میں گھور رہی تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

" اٹھو دیوتا" اس نے میری طرف مڑ کے ہنس کر کہا۔ "لگتا ہے تم اپنی آنکھیں میری

کمان سے ہٹا ہی نہیں سکتے۔ آخر ہم باہیں اور چہرہ ننگا رکھ سکتے ہیں۔ تو باقی جسم میں کیا کیڑے پڑے ہوتے ہیں؟"

مُڑ کر اُس نے کہا "تم مجھ سے بدتر کسی عورت سے آج تک نہیں ملے ہوگے، ہیں نا؟"

"دُور پرے گاؤں کے گنوار لڑکے ہو۔ میں نے تمہارا دماغ بگاڑ دیا ہے جو سبق تم کو ساری زندگی کوئی نہ سکھاتا، وہ میں نے سکھا دیئے ہیں" اس کی آواز میں غصہ تھا۔

اسے کسی شرم کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا وہ اپنے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھی ہے۔ میں نے کہا "تم حد ہو۔ تم سے پرے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ٹھیک کہتے ہو من ہر۔ بھلا اس سے مکمل جسم کہیں ہو سکتا ہے۔ میرا رواں رواں دیوتاؤں نے خود اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ سنہری کھال ریشم کی طرح ہاتھوں کے نیچے سے پھسل جانے والی کہیں فالتو گوشت ہے؟ شعلے کی طرح دمکتا ہوا رگوں میں بہنے والا خون۔ دروپدی بھی مجھ سے زیادہ مکمل نہیں ہوگی۔ پانچ بھائیوں کی بیوی تھی۔ پھر ہنس کر کہنے لگی "من ہر! کیا تم گوتم کے ساتھ مجھے بانٹنا پسند نہیں کرو گے؟"

اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا ہی رہا۔

گوتم ٹھیک کہتا تھا۔ مایا صرف اور محض عورت تھی۔ گوتم کی نگاہیں، کہاں تک دیکھ سکتی تھیں، اور وہ کیا جانتا تھا؟

ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ میں اس کھیل سے تھک چکا تھا۔ ہر وقت پکڑے جانے کا خوف گوتم کے احسانوں کا بدلہ میں چکا رہا تھا کہ اس کی چوری کر رہا تھا۔ دل اندر ہی اندر دہکنے والے انگارے کی طرح سینے میں ہر وقت جلتا رہتا تھا۔

یہ ہر وقت میں نے غلط کہا ہے۔ کیونکہ ایسی گھڑیاں بھی ہوتیں، جب میں مایا کے پاس ہوتا، اور اس سے بڑھ کر جوش و خروش سے اس کا ساتھ دیتا۔ ہم

نے اس کمرے کو نئے سرے سے سجایا تھا۔ وہ ملکہ تھی، اور میں اس کا غلام اور پھر بھی وہ میری راہ دیکھا کرتی تھی۔ ہفتے کی شام میں ہوسٹل سے آجاتا۔ ہم دونوں کبھی گوتم کے ساتھ اور کبھی شیام کو لے کر سمندر کی سیر کو نکل جاتے۔ ہم ساحل پر گھوم رہے ہیں۔ یکایک وہ کہتی۔

"من ہر" میرا جی چاہتا ہے تم اور میں کہیں چلے چلیں۔

میں نے کہا "مجھے بتاؤ آخر یہ کس طرح ممکن ہے۔ مجھے تو ہفتے کی رات تمہارے ہاں گزارتے ہی ڈر لگتا ہے۔ کیا ہو اگر گوتم جاگ جائے اور ہمارے کمرے میں گھس آئے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا جی اب مجھ سے بھر گیا ہے۔ تم میرے لیے اتنا سا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔"

"یہ اتنا سا خطرہ ہے۔ دوسرے کی بیوی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور پھر گوتم کی بیوی۔"

میں نے کانپ کر کہا۔

"گوتم سے ڈرتے ہو۔ میرے لیے اتنا سا کرنا بھی تمہیں بہت لگتا ہے، اور میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔" مایا نے بڑے دکھ سے کہا۔

"میں کسی قابل ہی کہاں ہوں، میں تو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے کیا کروں گا۔ میرے ساتھ جو پہلے بندھے ہیں، ان سب کا انجام ایسا ہی ہوا ہے تم نے میرے ساتھ کوئی سپنا نہیں سجایا۔ اچھا کیا۔ میری ماں نے جانے کتنے خواب دیکھے ہیں اور میں نے ان کا کیسے منہ چڑایا ہے۔"

"تم مجھے الزام دیتے ہو۔ سمجھتے ہو۔ میں نے تمہیں خراب کر دیا ہے۔" وہ تیز تیز چل رہی تھی۔

"کیا سمندر کے پار تک جانے کا ارادہ ہے۔ کہاں بھاگی جاتی ہو" میں نے یونہی کہا۔

"میرے لیے کہیں بھی ٹھکانہ نہیں ہے۔ من ہر۔ میں کہیں بھی چلی جاؤں۔ میرا نرک میرے ساتھ ہے۔"

اس لمحے میں اس کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی، اس کا نرک اس کے ساتھ تھا۔

"میں نے سدا سوچا تھا۔ من ہر میں ہر طرح سے مکمل عورت بنوں گی۔ ہمارے گھر میں میری دو بہنیں پہلے ہی روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری ماں ان کے بچوں کو کوستی تھی اور اپنے نصیبوں کو روتی تھی۔ میں نے بچپن سے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے جی میں کہا تھا۔ اگر میرا بیاہ ہوا تو میں کبھی روٹھ کر گھر نہیں آؤں گی چاہے کسی بُرے سے بُرے آدمی کے ساتھ نبھاہ کرنا پڑے کروں گی۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار سال میں ہی مجھے اپنے سے کیے ہوئے وعدے دیوانے کی بڑ لگے۔ بھلا جو تمہیں عورت ہی نہ سمجھے اس سے نبھاہ کا کیا سوال۔ کبھی کبھار گوتم کا سلوک مجھے ناقابل برداشت لگتا تھا۔ اسے میری رتی برابر پروا نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے لیے زندہ ہے، اپنے غرور کے لیے زندہ ہے۔ اسے اپنے آپ سے محبت ہے۔"

میں نے کہا "نہیں تمہارا خیال ہے اگر اسے تم سے لگاؤ نہ ہو تو وہ تمہاری خوشی کی خاطر روز روز ریل اپارٹ سے مجھے کہے نہیں کہ گھر آؤ۔"

"اوں" مایا نے سخت نفرت سے کہا "میری خوشی اس کی جوتی؟"

میں نے کہا "تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔"

مایا نے جو جواب دیا۔ اس نے میری رگوں میں خون منجمد کر دیا۔ سن سن کر خون میرے سر کی طرف چڑھنے لگا۔ مجھے لگا میں کانپ کر ابھی گر جاؤں گا۔

"اسے پتہ ہے کہ میں تمہاری مسٹریس ہوں۔"

"نہیں مایا نہیں" میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے تم مجھے کیوں جھنجھوڑتے ہو چھوڑو میرے کندھے ہلا کر رکھ دو گے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ تم اس کے بچے کی ماں ہو۔ اس کی بیاہتا بیوی ہو" میں نے زور سے اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے، مجھے کہتا ہے "تمہیں نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ مایا جاؤ اپنے من بھر سے باتیں کر لو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔"

"وہ سوچتا ہوگا شاید ہم باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جیسے گوتم کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ جیسے وہ بچہ ہے۔ جو ایسے کھلونوں سے بہل جائے گا۔ اس کی نگاہ جو دلوں میں چھید کرتی ہے۔ برمے کی طرح سینے کے اندر اتر جاتی ہے۔ وہ نگاہ کیا کچھ نہیں جان لیتی۔ کیا کچھ نہیں دیکھ لیتی۔ گوتم سے کیا چھپا ہے؟ وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آتا یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا" میں نے ہولے سے کہا۔

"تمہیں یقین کرنے پر مجبور کون کرتا ہے اور یقین کر لو تو اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک عجیب مذہب رکھتا ہے جس میں کوئی رشتہ کسی پر مجبوری سے نہیں لادا جا سکتا۔ مگر یہ صرف میرا خیال ہے۔ اس نے مجھ سے اتنی باتیں کب کی ہیں۔ ان آٹھ سالوں میں اس کے دل کی کوئی بات نہیں جان سکی۔"

"میرا خیال تھا تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ یہ شاید پسند کی شادی تھی، تمہاری یا اس کی" میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تماشہ دیکھنے والے کو کوئی ناچتی ہوئی پتلی پسند آ جائے اور وہ اسے اپنے کمرے کے ایک کونے میں سجا دے تو تم اسے شادی کہو گے۔ ہندو لوگوں میں یہ کہنا بڑا ظلم ہے کہ لڑکی کو پسند کروانے کے لیے لڑکے والوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے چار سال ناچنے کی تربیت حاصل کی ہے۔ گوتم بہت بڑا رقاص ہے۔ بس یہی بنیاد تھی۔"

"گوتم تمہاری بہت قدر کرتا ہے مایا" میں نے تسلی دینے کی خاطر اسے کہا۔

"قدر میری نہیں، میرے فن کی ہے۔ سال میں ایک آدھ بار جب اس پر ناچنے کا دورہ پڑتا ہے اُسے کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ایسے شخص کی جو محض تماشائی نہ ہو۔ فن کو جاننے والا ہو۔ اور اس کے فن کی داد دے سکے تو وہ میری طرف پلٹتا ہے۔ اسے مغربی ڈانس سے نفرت ہے وہ ہندوستان کے پرانے ناچ پسند کرتا ہے۔ ان کا ماہر ہے اور میں بھی کچھ شُد بُد رکھتی ہوں۔"

"تم ڈانس اکیڈمی کھول لو۔ مصروف بھی رہوگی، اور یہ فن دوسروں تک بھی پہنچا سکوگی۔"

"ڈانس اکیڈمی ڈاکٹر گوتم سہائے کی بیوی" وہ سر پیچھے ڈالے زور زور سے ہنس رہی تھی۔ جیسے پاگل ہوگئی ہو۔

کئی ہفتوں ان کے گھر نہیں گیا۔ عجیب کیفیت تھی میری — نشے کے عادی کو اگر مارفیا نہ ملے تو اس کا جسم ٹوٹتا ہے۔ اور وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا میں بھی لیکچر سننے میں گم ہوجاتا مجھے مایا یاد آتی۔ کوئل کی کوک کے سائے میں سکوٹر سے کھڑا وہ گھر یاد آتا۔ لگتا بالکنی میں سے جھک جھک کر وہ میری راہ دیکھ رہی ہے۔ شیام کا ہنستا ہوا چہرہ یاد آتا گوتم سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کی شکل یاد آتی بھی تو میں یاد نہ کرتا۔ مایا یوں چپ تھی۔ مانو میں اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں

ایک شام میں دیر تک نوٹس بناتا کالج میں ہی بیٹھا رہا۔ مجھے آجکل اکیلے کرنے اور تنہائی پسند آتی تھی۔ قلم ہاتھ میں لیے دیر تک میں یونہی سوچتا رہا۔ ہا کس بلے کا وہ دن گھوم پھر کر مجھے اپنے قبضے میں کر لیتا۔

"منوہر۔ منوہر" کسی نے مجھے پکارا۔

جیسے چوری کرتے میں پکڑا جانے والا گھبرا جائے۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا

"کون ہے؟"

"ارے بھئی تمہارے بابا آئے ہیں دوپہر سے کمرے میں تمہاری راہ دیکھ رہے

تھے، اور تم پہنچے ہی نہیں!" میرا ساتھی تھا کیلاش۔

"بس یہاں ہی اچھا لگ رہا تھا، کتنا ہی کام باقی تھا بیٹھ کر کرنے لگا؟"

کتابیں سمیٹ کر میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

راستے میں اس نے کہا "تمہارے بابا پوچھ رہے تھے۔ کیسا پڑھتا ہے جی کیسا ہے۔ کب سے اس نے گھر خط نہیں لکھا اس کی ماں نے گھبرا کر مجھے بھیجا ہے؟" تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تین چار ماہ سے گھر خط نہیں لکھا بھلا سپنے دیکھنے والے بھی خط لکھ سکتے ہیں۔ سوئے ہوئے آدمی سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ بابا پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا۔ گھر خط کیوں نہیں لکھا تھا میں نے؟ لکھنے کو بھی کیا تھا۔

بابا کہنے لگے "میں گوتم کے ہاں نہیں گیا۔ سیدھا یہاں ہی آیا ہوں۔ تم تو بڑے ذمہ دار تھے یہ کیسے ہوا کہ اتنے بدل گئے ہو۔ تمہاری ماں اتنی پریشان تھی کہ میں سیدھا یہاں آیا ہوں۔"

"ماں کیسی ہے؟" میں نے ہولے سے پوچھا۔

کیسی ہوتی؟ جس کا بچہ تین ماہ سے اسے بھلائے بیٹھا ہو۔ اس کی کیا کیفیت ہو گی۔

"کہتی ہے بڑا شہر ہے کہیں میرا بچہ گم نہ ہو گیا ہو" بابا ہنس کر کہنے لگے۔

انہیں کیا پتہ ان کا بچہ گم ہو چکا تھا، وہ بیٹا جس کو انہوں نے اسٹیشن پر الوداع کہا تھا۔ کہیں نہیں تھا۔

میں گوتم کے ہاں بابا کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بابا کہنے لگے "میں احسان فراموش نہیں ہوں بیٹے۔ گوتم میرے چاچا کا بیٹا ہے۔ اس نے تو سگے بھائیوں سے بھی زیادہ بڑا احسان مجھ پر کیا ہے۔"

میں سر جھکائے سنتا رہا۔ گوتم کا مجھ پر احسان تھا تو سہی۔

بابا سے میں نے کہا "آپ گوتم کے کلینک چلے جائیں وہ رات کے تقریباً گیارہ بجے تک وہاں ہی ہوتے ہیں۔"

بابا کہنے لگے "نہیں! میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بچّے کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں، اس کی بیوی کو تمہاری ماں کے بھیجے تحفے دینا چاہتا ہوں۔"

اس رات گوتم کلینک سے جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کا جی اچھا نہیں تھا۔ مایا آ مجھے دیکھتے ہی سفید پڑ گئی۔ جیسے کسی نے اس کے چہرے کی رنگت نچوڑ لی ہو۔ بابا گوتم کے پاس بیٹھ گئے۔ میں شیام سے کھیلتا رہا۔

وہ دونوں اپنے پُرکھوں کی اور جانے کا ہے کی باتیں کر رہے تھے۔ جن میں نہ مجھے دلچسپی تھی، اور نہ ہی میں جاننا چاہتا تھا۔ یہ باتیں وہ ماں سے بھی کرتے تھے۔ نسل پر ناز آدمی کا کُل ورثہ تو نہیں ہو سکتا۔ رگوں کے اندر کیسا خُون ہے۔ نیلا یا سُرخ اس کی کون پروا کرتا ہے۔ آج کل کا زمانہ تو طاقت کا زمانہ ہے۔ طاقت روپے سے حاصل ہوتی ہے، اور روپے کمانے کی لاکھوں راہیں ہیں۔

گوتم کہنے لگا "رات یہیں پر رُک جاؤ۔ ہوسٹل میں جاکر کیا کروگے!"

میرا جی اس کمرے میں عجیب گھٹن سی محسوس کرتا تھا۔ جیسے بیتے دنوں کی یادیں میرا گلہ دبا رہی ہوں۔ اپنے دکھائی نہ دینے والے پاؤں سے گدگدے لگاتی پھرتی ہوں۔

بابا سوگئے تو میں چپکے سے اٹھا اور پچھلی سیڑھیوں سے اُوپر چھت پر چلا گیا ہوا بالکل بند تھی۔ پتّہ تک نہیں ہل رہا تھا۔ حبس تھا۔ پھر میں نے باہر کی دیوار کے ساتھ کھڑی مایا کو دیکھا۔ وہ پلٹی نہیں میرے قدموں کی چاپ سُن کر بھی اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔

رات کو رہنے کی جرأت میں نے پھر کبھی نہیں کی، کیونکہ مجھے مایا پر اعتبار نہیں تھا۔ گوتم سے کبھی آمنا سامنا ہوتا تھا تو کہتا۔

"بھتیجے تم نے ہمیں بھلا دیا ہے بہت کم آتے ہو، مگر تم تو بہت مصرُوف ہوگئے ہونا۔ یہ ہمیشہ ہی سے ایسا ہے کہ آدمی کا اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ میری تو منّتا ہے تم خُوب محنت کرو۔ بڑے قابل ڈاکٹر بنو۔ عام سطح سے اُونچے اُٹھنا

تو ضروری ہے۔ اگر تم سڑک پہ چلنے والے ہر دوسرے آدمی کی طرح ہوتے تو کیا ہوتے؟"

میں سڑک پر چلنے والے ہر دوسرے آدمی کی طرح تو نہیں تھا۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مایا نے ایک ڈانس اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔

جس طرح میری زندگی کا راستہ مایا کی زندگی کے اندر سے ہو کر نکلتا ہے اسی طرح اس کے ڈانس اسکول کا راستہ بھی میرے کالج کی راہوں کو کاٹتا گزرتا تھا۔ شام کے وقت گوتم اسے جاتے ہوئے پاس کے کسی چوراہے پر چھوڑ دیتا وہ خراماں خراماں جیسے اچانک ہی مجھے مل جاتی۔

"جب گوتم کو تمہارے اور میرے متعلق پتہ ہے پھر بھی تم اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہو، تمہارے درمیان کوئی دیوار نہیں آئی۔" میں نے کتنی بار یہ سوال پوچھا تھا۔

پہلے پہل ہم آج یہاں اور کل وہاں اُٹھائی گیروں کی طرح پھرتے رہتے پھر مایا نے ایک جاننے والی کے گھر کے اُوپر کی منزل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ ہولے ہولے وہ پردے اور پلنگ اور ایسی ہی دوسری چیزیں لے آئی۔

میں نے پوچھا "تم کو یہ جاننے والی کچھ کہتی نہیں، تم سے پوچھتی نہیں؟"

کہنے لگی یہ غیر مطمئن زمانہ ہے اور پُرانے سوال کوئی نہیں پوچھتا۔ ہر کسی کا اپنا کوئی نہ کوئی چکر ہے۔ یہ جاننے والی یوں دیکھنے میں کسی اعلیٰ افسر کی بیوی ہے۔ مگر اصل میں یہ کوئی اور دھندہ چلاتی ہے۔ مجھے کیا کہے گی؟"

مایا کہتی تو ٹھیک تھی۔ اگر پُرانے سوالوں کے پُوچھنے کا وقت ہوتا تو گوتم مجھ کو اپنے گھر آنے سے تو منع کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا جیسا کہ آج بھی ہے کہ گوتم کو مایا اور مجھ پر وشواس تھا۔ جانے کیوں مایا نے جھُوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا وہ یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے۔ میرے لیے کتنے آگ کے

دریا پار کر رہی ہے۔

اب میں بہت بڑھیا سُوٹ پہننے لگا تھا، جو اگر میرے بابا دیکھتے تو ضرور پُوچھتے کہ کہاں سے آتے ہیں، مجھ پر دولت کی بارش کہاں سے ہو رہی تھی؟ پہاڑی علاقوں سے آیا ہُوا تہذیب کے مرکزوں سے سینکڑوں میل دور کا باسی کراچی میں من ہر بنا تو کتنا بدل گیا تھا۔

مایا میرا دُلار بھی تو بہت کرتی تھی۔ شیام کی طرح وہ مجھے بگاڑ رہی تھی۔ ہر بار کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ لاتی۔ میں نے اسے کتنی بار منع کیا تھا۔" بھلا تحفے لانا کیا ضروری ہے؟"

" تم مجھے منع مت کیا کرو۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اس دن کی طرح کھڑی میری نگاہوں کو اپنے جسم پر رینگتے محسوس کرتی۔ کھُلے بال اس کی کمر کے نیچے تک پہنچ رہے ہوتے۔ سڈول ٹانگیں کتنی خوب صورت تھیں۔ اسے دیکھتے ہی مجھے نشہ سا ہونے لگتا۔

ایک شام ملی تو کہنے لگی، آج ہم ڈانس اسکول کے فنکشن میں شریک ہیں۔ میں گوتم سے کہہ آئی ہوں کہ وہ پریشان نہ ہوں میں اگر نہ آسکی تو وہیں رہ پڑوں گی، وہ تھکا ہوا ہوگا، آ کر سو جائے۔"

" جانتے ہو کیا ہُوا؟ گوتم نے پہلی بار کہا کہ" رات باہر رہنا کیا ضرور ہے۔ میں تم کو جس وقت کہو لینے آؤں گا۔" مایا کا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔

" تو پھر تم ڈانس اسکول چلی جاؤ۔ یوں گوتم کی سوئی ہوئی غیرت کو جگانا کیا ضرور ہے؟" میں ڈر رہا تھا۔

کہنے لگی" من ہر جہاں تک میں آگئی ہوں، اس کے بعد لوٹ کر جانا ممکن ہی نہیں۔ آج رات ہم ہاکس بے پر گزاریں گے۔ ہٹ کے لیے میں نے ہوٹل والوں کو فون کر دیا تھا۔

مایا یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ سنبھل کر قدم رکھو۔ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ بابا

مجھے کبھی گھر گھُسنے نہ دیں گے۔ ماں میرا مُنہ نہ دیکھے گی۔ تمہیں پتہ ہے۔ اب کے چھٹیوں میں مَیں گیا ہوں تو ماں کہنے لگی "منوہر تم بہت بدلے بدلے نظر آتے ہو۔ مجھے تو بڑے شہروں کا کچھ پتہ نہیں کیا ہر کوئی ایسا ہی ہوجایا کرتا ہے؟"

میں نے ماں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی مایا۔ اس جگہ میں اپنے آپ سے اتنی نفرت کرنے لگا تھا۔ اتنی نفرت کہ بہن بھائیوں کے ساتھ بات کرتے بھی مجھے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ بہنوں نے سوچا بھائی پردیس کے پانی سے بدل گیا ہے۔ مگر ماں کی نگاہیں میرے سینے کے اندر اتر گئیں۔ مانتی اب ان سالوں میں ذرا سیانی ہوگئی ہے۔ مگر پھر بھی میری گود میں تو بیٹھ سکتی تھی۔ میں نے اسے چھُوا تک نہیں مجھے اپنا شریر اتنا گندہ لگا ہے جیسے ......

مایا نے ہنس کر کہا "یہ سب بچپن میں سُنی کہانیوں کا اثر ہے جو تمہاری ماں یا نانی نے سُنائی ہوں گی۔ بھلا جیون میں کیا گندگی ہو سکتی ہے۔"

"تو یہ جیون ہے جو میں اور تم گذار رہے ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"چوراہے پر کھڑے ہو کر مجھ سے سوال نہیں کرو۔ کوئی سواری پکڑو پھر شام گہری ہوجائے گی۔"

اس رات سمندر کی طرح مایا نے اپنی مُہیب لہروں میں میری ہستی کو بہا لیا۔ وہ مجھے اپنی تاریکیوں میں لے جانا چاہتی تھی۔ جہاں وہ اکیلی تھی جنم جنم سے پیاسی اس کی آتما مجھ سے پرے کسی اور رشتے کی کھوج میں تھی جو مکمل ہو۔ وہ میری ہستی سے اپنی تکمیل کرنا چاہتی تھی، کیسی ناقابلِ عمل بات تھی۔

جسم کے صحراؤں میں گھُومنے والے جانتے ہیں کہ اس سفر میں اپنا آپ کھو کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ آدمی صدیوں اس میں پھرتا پھرے انجام کار اس کے دامن خالی رہتے ہیں۔ یہ کسی کے شراپ کی وجہ سے نہیں یونہی شرمندگی اور بربادی اس سفر کا مقدر ہوتے ہیں۔ پیالے کی تلچھٹ تک پی جانے والے آخر میں خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ نہ کوئی خوشی نہ کوئی نئی بات نہ کوئی انکشاف یوں ہوتا ہے کہ جینا

پھر چند ہچکی ہچکی تیز سانسوں اور طبیعت پر بار گزرتی ہوئی متعفن راہوں پر چلنے کا نام رہ جاتا ہے۔ راہیں جہاں پر نہ خوشبو ہے اور نہ ہی کوئی خوشی۔ رگوں میں سرایت کر جانے والے جذبوں سے خالی جسم کی اوپری سطح کو ٹکرا کر مرنے والی وقتی راحتوں سے عبارت یہ محبتیں نہ کسی کا بھگوان بن سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کی یاد۔ اتنے زمانوں بعد میں جو وقت کے ٹوٹے مجسمے کو پھر سے جوڑ رہا ہوں۔ سوائے افسوس کے میرے دامن میں اور ہے کیا؟

مایا اور میں اس رات سمندر کی پُرشور لہروں کی طرح آپ سمندر تھے اور آپ ہی لہر۔ وہ اتنی کمزور اور دھان پان سی تھی کچی مٹی کی بنی ہوئی۔ لگتا تھا ذرا زور سے پکڑنے سے ٹوٹ جائے گی۔

کہنے لگی "کیا ہوتا ہے جو تم کوئی خوب صورت نظم لکھ سکتے۔ اصل میں مجھے ڈاکٹروں اور انجینئروں سب سے نفرت ہے نرم و نازک جذبات کو سمجھ نہیں سکتے۔ کبھی تمہارا جی نہیں چاہا کہ مجھے پا کر تم خوشی کا اظہار شعروں میں کرو۔ ہم ہوٹل کے کمرے سے باہر پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے جہاں موجیں آ کر اپنا سر ہمارے پاؤں پر پٹک رہی تھیں۔

مایا "اصل میں تم رومان کی کھوج میں ابھی تک گھوم رہی ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم اپنی کھوج کے انت تک کبھی نہیں پہنچ پاؤ گی میں نے اپنا سر اس کی گود سے ذرا سا اٹھا کر کہا "لیٹے رہو یونہی اسی طرح کہ زمانے ہم پر سے بیت جائیں۔ تم اور میں یہیں پر بُت بن جائیں پھر صدیوں بعد جب کوئی ہمیں یہاں سے اٹھائے تو کون جانے کس دیوی اور دیوتا کی مورتی ہے؟" مایا نے سرگوشی سے کہا۔

سمندر کے کنارے رات گزارنا ایک الگ تجربہ ہے۔ مگر اس گھڑی تو میں صرف مایا کی بات کرنا چاہتا ہوں۔

اگلے دن مجھے چھٹی تھی۔ مایا کی خواہش تھی کہ ہم وہ دن بھی یہیں گزاریں رجانے وہ کیوں اتنی دلیر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس کی بہادری سے خوف آنے لگا تھا۔ اس

کا کیا بننے والا تھا، اور پھر میرا آخری امتحان بھی سر پر تھا۔

صبح کے قریب جب میں اپنے ہوسٹل میں گھسا ہوں تو برابر والے کمرے کے لڑکے نے مجھے ایک تار تھما دیا۔ ماں سخت بیمار تھی! بابا نے مجھے بلایا تھا میرے سر میں خیالوں کی ہائے وائے مچی تھی۔ ماں بیمار تھی اور مایا جانے کو تم مایا سے کیا کہے اس رات کی غیر حاضری کا جواب وہ کیا دے گی۔ گو تم اگر اس کی کھوج میں مجھ تک آ گیا تو؟ عبدل سے میں نے پوچھا کوئی رات مجھے پوچھتا ہوا بھی آیا تھا؟"

"ہاں تمہارے وہی چچا جو ڈاکٹر ہیں آئے تھے۔ انہوں نے تمہارے دروازے پر تالا دیکھ کر مجھ سے کہا تھا، منوہر کہاں گیا ہے؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" میں نے ڈر سے تقریباً کانپتے ہوئے پوچھا۔

"کیا جواب دیتا بھئی تم شروع سے ہی کسی چکر میں ہو۔ اسی میں کہیں گے ہو گے" اس نے ہنس کر گردن کو کھجاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا کسی کو قتل کر کے آئے ہو؟"

امتحان سر پر ہے اور ماں کی بیماری کا تار آیا ہے۔ "پر تم نے یہ نہیں بتایا گو تم سے کیا کہا تھا؟"

"میں ان کی نظروں میں تمہاری عزت خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر تم میرے ہمسائے ہو۔ میں نے کہا کسی دوست کے گھر گیا ہے۔ دونوں مل کر امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔" عبدل کی نیند سے بند ہوتی آنکھوں نے میرے گالوں پر اطمینان کی خوشی نہیں دیکھی تھی۔

"تمہارے چاچا تھوڑی دیر کھڑے رہے، سوچتے رہے۔ موٹر کی چابی کو انگلی کے گرد گھماتے رہے اور پھر چلے گئے۔"

میں نے عبدل کو زور سے اپنے سے لپٹا لیا۔

اب کے بھی میں چھوٹ گیا تھا بھگوان اور سب دیوتا میرے ساتھ تھے۔ میرے اور مایا کے ساتھ اپنے خواب میں سنساہٹیں لیے پہلی گاڑی سے میں گھر کے لیے چل پڑا۔

پندرہ دن بعد جب لوٹا ہوں تو ماں کے دُکھ کے ساتھ امتحان کا فکر میرے ہوش اڑائے دیتا تھا۔ اس گھڑی جب میں نے سمجھا تھا بھگوان اور دیوتا میرے ساتھ ہیں، وہ میرے ساتھ ہیں، وہ میرے ساتھ نہیں تھے۔ مجھ سے منہ موڑے تھے۔ یہ کتنی بڑی سزا تھی کہ جب میں اُس چوراہے پر پہنچنے والا تھا جہاں سے کامیابی اور سربلندی مجھے اپنی طرف بلا سکتی تھی۔ وہ نہ رہی تھی جو آنکھوں میں غرور لیے میرا ذکر کرتی چمپا کے سے رنگ والی دھیرج سے بات کرنے اور دل کے اندر جھانکنے والی آنکھیں رکھنے والی ماں نہ رہی تھی۔

ایک چھٹیوں میں جب مایا کا خیال میری آتما بنا ہوا تھا اور میں گھر گیا تھا تو ماں نے کہا تھا۔

"چوری کا پھل پہلے تو میٹھا لگتا ہے پر جب اس کا رس رگوں میں اترتا ہے۔ تو جی کو افسوس ہوتا ہے۔"

اُس دن میں اُداس سا لیٹا تھا اور آکاش کو بھرنے والی دھوپ کی سفیدی میری جان میں دکھن بن کر اتر رہی تھی۔

ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا "منوہر گھومتے پھرتے نہیں ہو۔ کتابیں پڑھتے ہو یا لیٹے رہتے ہو۔ جاؤ دوستوں سے ملو۔ ندی نالوں کو پھلانگو۔ کیا سوچتے رہتے ہو۔ ہمارے گھر کے قریب پچھواڑے کی پہاڑی میں سے ایک نیا چشمہ پھوٹا ہے۔"

"چشمے کا پانی ٹھنڈا نہیں ہوگا ماں"۔ میں نے کروٹ بدل لی۔

وہ یونہی کتنی دیر میرے قریب سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی، پھر کہنے لگی۔

"بیٹے تو میری پہنچ سے باہر اور بڑا ہو گیا ہے۔"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے ماں کہ تمہارا بیٹا بڑا ہو رہا ہے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

یکایک ماں نے پوچھا تھا "مایا اور گوتم میں سُنا ہے بہت فرق ہے۔ میرا مطلب ہے مایا گوتم سے بہت چھوٹی ہے۔"

"ہے تو سہی، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ میں نے تیزی سے کہا۔

ماں نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ گوتم نے غلطی کی

بڑے آدمی اکثر غلطیاں کرتے ہیں۔ سبھی کرتے ہیں۔ غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے، اور آدمی بھگوان نہیں ہے، وہ مجھ سے زیادہ اپنے سے بات کر رہی تھی۔

"مگر ماں وہ دونوں تو بہت خوش ہیں۔ مایا تو اپنے پتی کو پوجا کرنے کی حد تک چاہتی ہے۔" میں نے مایا کی وکالت کی۔

"تم نے تو دیکھا ہوگا کبھی اس کے میکے سے کوئی آیا کرتا ہے؟" ماں نے یونہی پوچھا۔

"میں ہوسٹل رہتا ہوں، پڑھنے سے فرصت نہیں ہوتی۔ پہلے دنوں کے سوا اب تو بس کبھی کبھار ہی جاتا ہوں، مگر جب بھی میں گیا ہوں، میں نے اس کے میکے کے کسی آدمی کو نہیں دیکھا۔ مگر تم کیوں پوچھتی ہو؟"

"یونہی،" پھر ہنس کر بولی۔ "وہ میری دیورانی ہے۔ تمہاری چاچی ہے۔ آخر رشتہ داروں کی بات تو ہر کوئی پوچھتا ہے۔ تم سے کیسا سلوک کرتی ہے؟"

"بہت اچھا کرتی ہے۔" میں خوش تھا کہ ماں مایا میں اتنی دلچسپی لے رہی ہے۔

"اس کا بیٹا تو تم سے خوب ہلا ہوا ہوگا۔" ماں نے بے دھیانی میں پوچھا۔ مالتی چولہے کے پاس منڈلا رہی تھی۔ بڑی بہن کو ستا رہی تھی۔ روٹی پکانے کے لئے ضد کر رہی تھی۔

"مالتی" ماں نے پکارا "دیکھو بھیا کے ساتھ باہر جاؤ۔" منوہر اسے گھما لاؤ، جب سے تم آئے ہو اس کی طرف ذرا توجہ نہیں دیتے۔ اس سے یہ بہت چڑچڑی اور لڑاکا ہو گئی ہے۔ پہلے جو تم اس کا بہت دلار کرتے تھے۔ اس سے یہ اب بھی تمہاری توجہ چاہتی ہے بچوں کو کیا پتہ ہوتا ہے بڑے کتنا بدل جاتے ہیں۔"

ماں کے بات کہنے کا انداز ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی بات بھی کہہ دے تو کوئی برا نہیں مناتا تھا اور اب مالتی اتنے سالوں میں کافی بڑی ہو گئی تھی۔ اسکول جاتی تھی اور لگتا تھا میرے اور اس کے بیچ جو ناطہ تھا وہ نہیں رہا۔ وہ مجھ سے بہت کم بولتی تھی۔ دوسری بہنوں کی طرح بھاگ کر میرے کام بھی نہ کرتی۔ عجیب طرح سے گم سم سی رہتی۔

ماں نے مرنے سے بہت پہلے کہا تھا "منوہر ہر جیون کا انت یہی ہوتا ہے۔ جو یہاں آتا ہے اسے جانا بھی پڑتا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ جو آتما پوتر ہوتی ہے

اُس کے کشٹ اور پاپ جنم میں رہ جاتے ہیں بھگوان میرا انت سپھل کریں۔"

بابا جو اس کے پاس بیٹھے گیتا کا پاٹ کر رہے تھے" ماد تھوری بولو نہیں، ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔"

سانس کی تکلیف بہت بڑھ گئی اور اس کا چمپا کا سا رنگ مدھم پڑنے لگا، آنکھوں کی پتلیاں پگھلی پگھلی لگنے لگیں۔ اُسے کم نظر آتا تھا اور وہ گھبرا کر ہماری صورتوں کو جو دھندلی لگتی تھیں۔ دیکھنے کے لیے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلاتی تھی اکھڑے ہوئے سانس کی وجہ سے بات کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لمحے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کا وہ سر اپنی گود میں رکھوں، اس سے لپٹ جاؤں، مگر میں اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے سخت نفرت محسوس ہوتی تھی۔ ماں کو ہاتھ لگاتے اسے چھوتے، اس کے قریب ہونے کے قابل کہاں تھا۔ ماں کا انت آپہنچا تھا۔ میں اتنے دنوں اُس سے دُور رہا تھا۔ اور اب وہ مجھ سے دور ہو جائے گی۔ یہ صورت یہ چاہنے والا دل یہ معاف کر دینے اور سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنی رہنے والی اب نہیں رہے گی۔

بابا نے کہا بھی منوہر ماں کو سہارا دے کر اسے ذرا اٹھا کر بٹھاؤ۔ مگر میں اسی طرح کھڑا رہا۔ میری بہنوں اور چھوٹے بھائی نے بابا کے ساتھ مل کر اُسے پوتر کی ہوئی جگہ پر اتار کر نیچے لٹا دیا۔

پھر اس کی آتما نئے جنموں کے چکر دل میں گھومنے کے لئے چاندی سا شریر چھوڑ کر آگے کے سفر پر نکل گئی۔

واپس آیا ہوں تو گوتم اور رمایا دونوں میرے ہوسٹل آئے۔

گوتم نے کہا "بھتیجے تم مجھے بتائے بنا چلے گئے تھے۔ بہت دنوں پتہ ہی نہیں چلا پھر ایک دن میں تمہارے دوست عبدل سے کلفٹن پر ملا۔ اس نے بتایا تم گھر گئے ہو۔ میں خط لکھ کر بھابی کی خیر سکھ پوچھنے ہی والا تھا کہ بھائی صاحب کا خط آیا۔"

میں خاموش رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ صرف دل میں افسوس

تھا جو بابا کو اپنے سامنے دیکھ کر نئے سرے سے اور زیادہ زور سے مجھے دبا رہا تھا۔

بابا نے کہا "من ہر! مجھے بھابی کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ افسوس وہ ایک بار بھی یہاں نہ آئیں۔"

گوتم نے کہا "اب دکھ کو اپنے اوپر سوار نہ کرو۔ تمہیں پتہ ہے یہ دنیا ہم تک یونہی پہنچی ہے۔"

"منوہر! تمہارا امتحان قریب ہے خوب پڑھو، اگر تمہارے نمبر اچھے ہوئے تو میں کوشش کر کے تمہیں باہر بھجوا دوں گا۔"

میں نے بہت غور سے اُسے دیکھا، کیا وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مگر اس گھڑی ساری کامیابیاں جھوٹی اور بیکار لگتی تھیں اور باہر جانا یا ملک میں رہنا میرے لیے کسی خوشی کا باعث نہ تھا۔

بابا نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔

گوتم نے جاتے ہوئے کہا "شیام تمہیں یاد کر رہا تھا، مگر میں تمہیں امتحان سے پہلے آنے کی صلاح نہیں دوں گا۔ ہم لوگ بھی اب تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔ امتحان میں کل پندرہ دن ہی تو رہ گئے ہیں۔"

بابا ذرا سی دیر کے لیے گوتم کے پیچھے جاتے ہوئے رُکی اور دروازے میں سے اس نے بڑی گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ نگاہ جو ننگی تھی اور ایسے افسوس کے موقع پر سارے انسانوں کی اہانت لگتی تھی۔ سارے جذبوں کی بے عزتی لگتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے اور میرے ناطے کی بھی ہنسی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

پھر وہ گوتم کے ساتھ چلی اور میں نے کتابوں کے ڈھیروں کی طرف بڑے دکھ سے گھورا۔ امتحان سر پر آ ہی گئے تھے۔ امتحان جو میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے لوگ جو کہتے ہیں کہ ان دیکھی طاقتیں اور آکاش پر رہنے والے دیوتا کچھ نہیں ہیں۔ مرنے کے بعد آتما فوراً ہی اگلے جنم کے چکروں میں گھومنے کے لئے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جون میں جنم لے لیتی ہے۔ غلط کہتے ہیں، اور میں جو بہت کم سپنے دیکھتا ہوں، سپنوں پر وشواس

کرنے لگا ہوں۔

امتحان کے دنوں میں روز رات کو میری ماں مجھے دکھائی دیتی۔ آنکھیں مجھ سے ملا کر بات نہ کرتی ہوئی وہ فوراً ہر کتاب کو کھولتی اور اگلے پرچے کے لئے ان جگہوں کی طرف اشارہ کرتی، جہاں سے سوال پوچھے جانے والے ہوتے۔ پہلے دن میں نے سوچا "شام میں نے ماں کو بہت یاد کیا تھا نا۔ اس لئے وہ مجھے سپنے میں دکھائی دی ہے۔ معمولی شُدبُد رکھنے والی گھریلو عورت کو ڈاکٹری کی کتابوں کا کیا پتہ؟ اُسے کیا پتہ تھا میں کیا پڑھتا ہوں۔ مگر اس رات وہ بہت سفید ساڑھی باندھے تھی اور ایسی تھی جیسے وہ اپنی جوانی کے دنوں میں ہوگی۔ چمکتی ہوئی دودھیا جلد کہ پانی بھی پئے تو حلق میں سے دکھائی دے۔ گھرداری کے بوجھ سے جھکی ہوئی نہیں۔ بس ایسے ہی جیسے میری بڑی بہن کہتی تھی۔ جب اس کا بیاہ ہوا ہے۔ کمرے کے اندر آکر اس نے پاس پڑی کتابوں کو اُلٹا پلٹا مگر بولی کچھ نہیں۔ پھر اس نے ورق پلٹے اور اشارہ کیا کہ میں یہاں سے یاد کروں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ابھی اندھیرا ہی تھا۔ رات کا آخری گجر بجا تھا اور سویرا کہیں قریب ہی تھا۔

پرچے کے وقت میرا دل ہولے ہولے دھک دھک کر رہا تھا۔ میری ماں نے سچ مچ میری مدد کی تھی۔ اس نے مجھے آشیرواد دی تھی۔ میرا پاس ہونا بس ضروری ہو گیا تھا۔ امتحان کوئی ڈیڑھ مہینہ چلا۔ میرے ہم جماعت مجھ سے کہتے "منوہر لگتا ہے پرچے کچھ تسلی بخش نہیں ہو رہے۔ تمہارے کیسے وقت تمہاری ماں نے تمہارا ساتھ چھوڑا۔ خیر کوئی بات نہیں، اگر کچھ پرچوں میں کمی رہ گئی تو سپلیمنٹری میں دے دینا۔"

فارغ ہو کر میں نے فوراً گھر جانے کا سوچا۔ بہنوں کے لئے بازار سے سوغاتیں خریدیں اور گاڑی کے وقت سے ذرا پہلے گوتم کو اس کے کلینک ملنے گیا۔

گوتم بہت مصروف تھا کسی نہایت سیریس مریض کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "تم کچھ دنوں رُکتے۔ ہمارے ہاں رہتے تو اچھا تھا۔"

میں نے کہا "دل بہت اداس ہے۔"

معائنے کی میز کو ایک ہاتھ سے پکڑے پکڑے اس نے کہا "ماتا سے نہیں ملے

اس پر پھر بوریت کا دورہ پڑا ہے۔ چپ بیٹھی رہتی ہے۔ مجھ سے بھی نہیں بولتی۔"

میں نے کہا "گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔"

گوتم نے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "جب رزلٹ نکلے گا تو دیکھیں گے۔ تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ مایا سے میں کہہ دوں گا کہ تم چلے گئے ہو۔" اور اس سے پہلے کہ میں دہلیز پار کرتا وہ پھر اپنے مریض پر جھک گیا تھا۔ کراچی کے چند ہم جماعت اسٹیشن پر مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ رزلٹ تک دو تین ماہ سب کے پاس فالتو تھے۔ کوئی کسی جگہ ملنے جانے والا تھا اور کوئی کام شروع کرنے والا تھا۔ زندگی کی ہماہمی سے پُر یہ دن۔

میں بابا کے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس کام کرنے لگا تھا اور اس مصروفیت میں ماں کی یاد مجھے اتنا نہ ستاتی تھی۔ سادہ دل لوگ تھے پیچیدہ مرض جن کو شہر والوں کی طرح ابھی اپنے شکنجے میں نہیں جکڑتے تھے۔ ڈاکٹر کہتا "میں سوچتا ہوں کسی بڑے شہر میں جا کر پریکٹس کروں۔ یہاں تو سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ اس ڈگری کا کیا فائدہ؟ یہاں تو کوئی معمولی کمپوڈر بھی ان کے لیے کافی ہے۔"

"پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا ڈاکٹر۔" میں ان دنوں مٹ جانے والی دنیا سے کوئی محبت محسوس نہیں کرتا تھا۔

"تو پھر تم اور کس شے کی کھوج میں ہو۔ تم نے اتنے سال یونہی گنوائے ہیں۔ جب کوئی منزل نہ ہو۔ آدمی کو کہیں جانا نہ ہو تو یہاں اور وہاں برابر ہے۔ زیادہ اور کم تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ سادہ دلی سے آدمی کہیں پر بھی گذر بسر کر سکتا ہے۔ میں تو روپے کمانا چاہتا ہوں۔ دنیا میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے کلینک کے سامنے فیس کی جو تختی لگی ہو۔ وہ لوگوں کے ہوش اڑا دے۔ صرف بہت اونچے لوگ ہی مجھ تک پہنچ پائیں اور وہ ڈرتے جھجکتے ہوئے ہوں۔ ان جاہل لوگوں کی طرح وہ مجھ سے بحث تو نہ کریں۔"

میں نے کہا "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں کبھی کبھار ان کو سمجھانا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"تم خاصا مشکل کہتے ہو، میں کہتا ہوں ناممکن ہے قطعی ناممکن ہے انہیں سمجھانا۔"

ڈاکٹر نے دور سے مریض کو دیکھا اور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بابا کا خیال تھا امتحان پاس کرنے کے بعد میں بھی یہیں پر کلینک کھول لوں، اور بہنوں کے پاس ہی رہوں اور کام بھی چل نکلے گا۔ ان کے ارادے ایسے ہی تھے وہ ہر شام جب کھانے سے فارغ ہو کر گھڑی دو گھڑی بیٹھتے تو یہی کہتے۔

"منوہر تمہارا نتیجہ نکل آئے۔ میرے پاس کچھ پیسہ ہے تمہیں کلینک کھول دوں گا۔"

اپنے چاچا ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں پر کام چلنا مشکل بلکہ نہیں چلنے والا تھا۔ ایک وہ لوگ تھے جن کو مریض دیوتا جانتے تھے۔ جن کے دیئے ہوئے زہر سے بھی وہ ٹھیک ہو جاتے تھے مگر سب تو اس درجے تک نہیں پہنچ پاتے۔

میں دن گن رہا تھا اور سوچتا تھا رزلٹ نکلنے کے بعد ہی بابا کے سوال کا جواب دے سکوں گا۔

جب برف پڑنے لگی تھی اور نلوں میں پانی جمنے لگا تھا تو ہمارا نتیجہ نکل آیا۔

گوتم نے مجھے تار دیا مبارک باد کا۔ میری سارے کالج میں دوسری پوزیشن تھی۔

کاش کوئی ہوتا جو غرور سے سر اونچا کر کے چل سکتا۔ اُس دن میری بہنیں چھپ چھپ کر روتی رہیں، اور میں رات گئے تک برف سے ڈھکے، غیر آباد راستوں پر یونہی چلتا رہا۔ جانے میں کتنا چلا ہوں گا کہ گھر آ کر تھکا ہوا سو گیا۔ میں نے اس رات چاہنے کے باوجود کوئی سپنا نہیں دیکھا۔

تقریباً سوا سال کے بعد میں پھر کراچی کے اسٹیشن پر آ کر اترا تھا۔ رزلٹ نکلنے کے بعد میں نے ہاؤس سرجن ہونے کا تمام عرصہ کوئٹہ کے ہسپتال میں گزارا تھا اور گوتم سے بھی خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ اس نے میرے لیے بہت کوشش کی تھی۔ بہت سے بھاری پتھر اٹھانے تھے، اور آخر میں ایک بینک کے غیر سرکاری وظیفے پر میرا امریکہ جانے کا بندوبست ہو سکا تھا۔ انٹرویو کی تاریخ چار دن بعد تھی۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ آ کر بھاری قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ جب میں نے اس شہر کے نیچے قدم

دھرا ہے تو کوئل کی کوک نے میرا سواگت کیا جانے کیوں بیتے دنوں کے خیال سے میرا جی بھر آیا۔ جب میں نے گوتم کے نام کی تختی دیکھنا چاہی تو وہ مجھے نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا گھنٹی بجالوں۔ اس نے اپنے خط میں ذکر نہیں کیا۔ شاید انہوں نے مکان بدل لیا ہو۔

نوکر نے پوچھا "آپ کس سے ملیں گے؟"

"ڈاکٹر گوتم یہیں رہتے ہیں کیا؟"

"جی حضور یہیں رہتے ہیں۔ آج ان کا جی اچھا نہیں ہے۔ کلینک نہیں گئے آپ نام بتائیں، انہیں خبر کروں"۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا "خبر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اس نے میرا بکس اٹھا لیا اور دوسرے ہاتھ میں وہ بڑی ٹوکری بھی جو بابا نے گوتم کے لیے بھیجی تھی۔

گوتم نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا، پھر کہنے لگا "مایا دیکھو تو کون آیا ہے"۔

مایا آکر دہلیز پر کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ ایک دم سفید ہو گیا۔ میں بھی یونہی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا کچھ نہیں۔

"اندر آؤ بھئی وہیں سے کھڑی کیا گھور رہی ہو۔ اب اس سے پوچھو نا تم سے ملے بنا کیوں چلا گیا تھا"۔ گوتم کی آواز اپنی پرانی گمبھیرتا کے ساتھ محبت کرنے والے کی سی نرم تھی۔

مایا ہولے ہولے چلتی اندر آئی پھر مڑ کر گوتم سے کہنے لگی "تمہارا جی کیسا ہے؟"

"دیکھا تم سے ابھی تک روٹھی ہوئی ہے"۔ گوتم نے ہنستے ہوئے کہا "تم اس سے معافی مانگ لینا بھئی منوہر بلکہ ابھی مانگو"۔

"تم ناشتے میں دلیہ کھاؤ گے یا انڈا" وہ بدستور اسی کی طرف مخاطب تھی۔ "مایا تمہارے اخلاق کتنے خراب ہیں۔ بھئی گھر آئے مہمان سے تو اس طرح بے نیاز نہیں ہوتے" گوتم نے پھر کہا۔

"بیٹھو منوہر" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "مگر یہاں بیٹھ کر کیا کرو گے۔ اپنے

اُسی پرانے کمرے میں جاؤ۔ نہا دھو کر کچھ آرام کرو۔ لگتا ہے آج بولان میل اپنے وقت پر آیا ہے۔ ریلوے والے بھی وقت کے کتنے پابند ہوتے ہیں۔"

میں تھکا تھکا سا سیڑھیاں چڑھتا اُس بالکونی کی طرف بڑھا۔ لکڑی کی سیڑھیوں کا رنگ و روغن اتر چکا تھا اور وہ چرچرا رہی تھیں۔ کتنی ہی دیر میں بالکنی میں کھڑا سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ موٹروں کا دریا رواں تھا۔ بڑ کے پتے اُسی طرح کمرے کے اندر تک جاتے تھے اور چمک رہے تھے، ہوا ویسے ہی سرسراتی ہوئی شاخوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور سمندر کی نمی سے بھرے جھونکے بڑے خوشگوار لگ رہے تھے۔

ہر شے یونہی تھی میرا اور مایا کا کمرہ بھی پردے بھی ڈریسنگ ٹیبل پر میری کنگھی تک رکھی تھی۔ بستر کے ساتھ میرے سلیپر تھے۔ مجھے لگا یہ وقت نہیں بیتا، میں سونے سے جاگا ہوں اور مایا ابھی ابھی میرے پاس سے اٹھ کر گئی ہے۔ میری پسندیدہ خوشبو تک ارد گرد ڈول رہی تھی۔ خوشبو جو اس کے جسم کی بھی نہیں، اس کے بالوں کی بھی نہیں، اس کے سانس کی تھی۔

جب دوپہر بیت گئی میں آرام کر چکا تو نوکر نے کہا "ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

گوتم کرسی پر بیٹھا تھا اور صبح سے زیادہ بشاش لگتا تھا۔

مایا دوپہر سے اپنی کسی جاننے والی کے ہاں گئی ہے۔ شاید کسی دعوت وغیرہ میں۔ بچے یہیں ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئی۔ تم جانتے ہو۔ تمہاری غیر موجودگی میں ہمارے ہاں ایک اور اضافہ ہوا ہے۔" پھر اس نے آواز دے کر کہا آیا کو کہو بے بی کو لائے۔

"تم دیکھو گے کہ روپی بالکل تم پر پڑی ہے۔" گوتم کی آواز میں نہ طنز تھا اور نہ ہی شرارت۔ وہ نہایت ایمانداری سے یہ کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے کی طرف تھی۔ ورنہ وہ میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ تو دیکھ سکتا۔ میرا اڑا ہوا رنگ تو اُسے ضرور نظر آتا۔

آیا دہی تھی۔ شیام اور روپا دونوں آئے تھے۔ شیام تو آنے کے ساتھ ہی میری گود میں چڑھ گیا۔ بچی کو گوتم نے اٹھا کر میری طرف کیا۔ دیکھتے ہو کیسے تم پر پڑی

ہے۔ وہی نقشہ ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ماں باپ میں سے کسی سے مشابہ نہیں ہوتا کسی دور پار کے رشتہ دار جیسا ہو جاتا ہے۔ روپا دیکھو تمہارے بھائی آئے ہیں۔"

اپنے سفید ہوتے چہرے کو گوتم سے چھپانے کے لئے میں نے روپا کو اس سے لے لیا۔ دوسرے گھٹنے پر اُسے بٹھالیا۔

"تو یوں مایا نے مجھے قید کر لیا ہے سدا کے لئے۔ ایک ویرانی کے احساس سے میرے وجود کو ڈسنے کے لئے اس نے میرے منہ پر روپا کو مارا ہے۔"

سوچیں میرے جی کو پریشان کرتی رہیں۔

سمندر کے کنارے دیر تک ٹہلتے ہوئے ایک ہی خیال بار بار ڈھیٹ بھکاری کی طرح میرے دماغ کے دروازے پر کھٹ کھٹ کرتا رہا۔

"مایا کو اب گوتم سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ میرا اخلاقی فرض تھا کہ میں مایا اور روپا کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ جب تک مایا میرے ساتھ جانے کے لئے ہاں نہیں کرتی، میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں گوتم سے کہہ دوں گا۔ میں اُسے مزید دھوکا نہیں دینا چاہتا۔" ایسے ہی خیال جو سوال بھی خود ہی تھے اور جواب بھی خود ہی۔

جب کمرے میں گھسا ہوں تو میرا ارادہ تھا اگر گوتم جاگتا ہو، اس سے اسی وقت بات کروں گا۔ مگر سارا گھر چپ کے جادو میں قید تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور بہت کم شور کیا۔ چاند کھڑکی کے سامنے تھا اور ریتوں میں سے چھن چھن کر روشنی اندر آ رہی تھی۔ جب میں بستر پر لیٹا ہوں، تو لمبے سیاہ بال تکیے پر بکھرے تھے اور اندھیرے میں مایا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"من ہر۔ من ہر! اس دیوانے خیال کو جی سے نکال دو۔ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔ کیا گوتم کو چھوڑنا اتنا آسان ہے؟ روپا کو تو تم لے جاؤ گے پر شیام شیام کا کیا بنے گا۔ اس سیاہ داغ کے ساتھ میں شیام کا جینا پسند نہیں کروں گی اس کے ماتھے پر یہ لکھا ہو کہ اس کی ماں اس کو چھوڑ گئی۔ نہیں من ہر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"روپا مجھے دے دو" میں نے پریح ہوتے ہوئے کہا۔

"گوتم کو کیا کہوں۔ میں روپا من ہر کو کیوں دے رہی ہوں! ابھی تو اُسے ذرہ برابر شک نہیں ہے۔"

"سوال پھر کرشن شیام کا آجاتا ہے۔"

"تو تم گوتم کو نہیں چھوڑ سکتیں۔" میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا "ہولے بولو، میں دو بچوں کی ماں ہوں۔"

"مگر دن کے وقت مجھے کیا کہہ سکو گی۔ جب میں گوتم سے ساری بات خود کہوں گا" میں نے اس کا ہاتھ اپنے منہ پر سے پرے کیا۔

"گوتم کا غصہ بہت سخت ہے اور وہ غصے میں جن سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔" مایا نے اپنا بازو میرے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہٹاؤ، چلی جاؤ یہاں سے تم قابلِ نفرت ہو۔ میں تمہارے منہ پر تھوکتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مایا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔ من ہر تم میرے رات کے مالک ہو۔ دن پر تمہیں اختیار نہیں۔ دن کو میں گوتم کی ہوں، اور میں اجازت نہیں دوں گی کہ تم اس کے سکون اور اس کی جمی جمائی زندگی میں کھنڈت ڈال سکو۔ رات کو میں تمہاری دلہن ہوں اور دن کو گوتم کی۔"

"تم یہ سب باتیں کیسے سوچ سکتی ہو۔ کتنے آرام سے کہہ سکتی ہو۔" میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"من ہر تم اندھیکار کے دیوتا ہو۔ تمہارا میرا ملاپ ہی رات ہے۔ رات اور اندھیرا جن کے اندر سے دن پیدا ہوتا ہے۔" وہ بہت ہولے ہولے یہ سب باتیں کہہ رہی تھی۔

"میں اس گھر میں ایک گھڑی نہیں ٹک سکتا۔" میں بدستور غصے میں تھا۔

"کیوں اس گھر کو کیا ہوا ہے۔ تم سمجھ کیوں نہیں سکتے کہ میں بھی دروپدی کی طرح تم

دونوں کے درمیان اپنے آپ کو بانٹ رہی ہوں۔" مایا نے اسی نرمی سے کہا۔

"دنیا میں آج تک ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ یہ صرف تمہاری رومان پسندی ہے۔ تمہارے دلواتے سپنے ہیں۔" میں بہت خفا تھا۔

"چلو دلواتے سپنے ہی سہی جو تم کہو میں مان لیتی ہوں۔ میں تمہاری تپونوں کی دھول بھی اسی طرح ماتھے پر چڑھاتی ہوں جیسے گوتم کی۔ تم نہیں سمجھتے گوتم کی ساری کمیاں تم میں پوری ہوتی ہیں۔ تم دونوں مل کر میرے سپنے بنتے ہو۔

"عجیب منطق تھی۔"

روپا کو کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ میں اس کا کون ہوں۔" میں نے دکھ سے کہا۔

مجھے تو معلوم ہے کہ تم اس کے کون ہو۔ تمہارے لیے وہ اتنی ضروری کیوں ہے؟

روپا مجھ سے ہے۔ میں روپا سے نہیں ہوں۔

"میری ذمہ داریاں میرا اخلاقی فرض ان سب کا کیا بنے گا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ تم سب مجھ پر چھوڑ دو۔ اب جانے والے ہو۔ اپنا دل کیوں میلا کرتے ہو تمہیں بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ پوری توجہ سے انٹرویو دو۔ میں ہر وقت بھگوان سے تمہارے لیے پرارتھنا کرتی ہوں۔ تمہاری کامیابی میری کامیابی ہے تمہیں نہیں پتہ تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو۔"

وہ اسی طرح کی باتیں کرتی رہی اور رات بیت گئی اور پھر اور کئی راتیں اسی طرح گذر گئیں۔

آدمی دکھ سکھ سے آخر سمجھوتہ کر ہی لیتا ہے۔

انٹرویو ہوا میرے جانے کی تاریخ طے ہوئی۔ بابا آئے اور کئی چھوٹے بڑے کام نمٹا کر جب میں جہاز کے اندر بیٹھا تو ایسا لگا کہ میں اپنا ایک وجود پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں ایک زمانہ یہاں رہ گیا ہے۔ میرا بچپن میری جوانی۔ میری محبت، میرے سپنے اور روپا۔

مایا ان دنوں مجھ سے دور ہی دور رہی تھی اور چونکہ شیام کا جی اچھا نہیں تھا وہ مجھے الوداع کہنے بھی نہیں آئی۔

گوتم اور بابا باتیں کر رہے تھے۔ گوتم مجھے بیچ بیچ میں نصیحتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ بابا

تاکید کر رہے تھے کہ خط لکھوں انہیں بھول نہ جاؤں۔ سیڑھی ہٹالی گئی اور میں انجانی دنیاؤں کی طرف اجنبی لوگوں کے درمیان رہنے کے لیے چلا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ہم دو کے بعد میری اور گوتم کی درو پدی جانے اور کتنے لوگوں کو رجھائے گی۔

مجھے کسی ملنے والے نے بتایا کہ مایا کی صحت گر گئی ہے وہ یوں دیکھنے میں اچھی بھلی لگتی ہے مگر اصل میں بیمار رہتی ہے۔ اُسے نیند نہیں آتی۔ بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے اور چپ رہے تو دنوں بات نہیں کرتی۔ کبھی جوگن کا روپ دھار لیتی ہے۔ ننگے پاؤں مندر جانے کی دھن سما جاتی ہے گھر میں پوجا کا علیحدہ کمرہ بنا لیتی ہے۔ سارے دیوی، دیوتا اور بھگوان طاقتوں میں بھاگران کے آگے ماتھا ٹیک رہی ہے۔ جی میں آیا تو زرنگار سُرخ ساڑھی پہن کر مانگ میں سیندور بھرے موٹر لے کر اکیلی ہی گھومتی پھرتی ہے۔ ناکس بے جا کر پہروں سمندر کو تکے جاتی ہے۔ پہلے گوتم اس کے پیچھے بہت بھاگا۔ ہر جگہ اس کے علاج کے لئے گیا۔ مگر مایا نے اس سے بار بار کہا ''گوتم میں بالکل اچھی طرح سے ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ اگنی کی طرح کئی روپ بدلتی ہوں در اصل میں اسی جنم میں بار بار جنم بدل رہی ہوں۔ تم کیوں گھبراتے ہو۔'' تو وہ بھی کچھ سمجھ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ مگر جب وہ اس طرح سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مگن ہے تو ہر کسی سے اس کی شکائت کرتی ہے کہتی ہے۔

''میں مروں یا جیتی رہوں، گوتم سے کیا۔ اسے تو مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں۔''

دوست تو سمجھتے ہیں کہ یہ بیمار عورت ہے مگر دوسرے لوگ کم جاننے والے ہر کوئی تو مایا کی طبیعت سے واقف نہیں ہو سکتا؟ اور جب ایک بظاہر ہوشمند عورت اس طرح سے رونا روئے گی تو شک کرنے کی بجائے لوگ اُسے بہت دُکھی سمجھیں گے۔ اگر کوئی کہہ دے کہ تم تندرست ہو۔ اب تو تمہارے چہرے پر رونق ہے۔ وہ کھوئی کھوئی ہوئی نگاہیں نہیں ہیں، تو گالیاں دینے لگتی ہے۔ بیک وقت وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ اُسے بیمار نہ سمجھا جائے، اور وہ بیمار رہنا بھی چاہتی ہے۔''

میں اور گیتا کسی دوست کے ہاں آئے ہوئے تھے جو ابھی ابھی کراچی سے واپس آیا تھا

وہ یونہی گوتم سے ملا تھا اور گوتم اسے گھر لے گیا تھا۔ وہاں پر وہ کھانے کے لئے رکا تھا اور اس نے مایا سے بات کی تھی۔

"پہلی نظر میں تو لگا کوئی جوگن ہے۔ سفید ساڑھی باندھے کھڑا دیں پہنے" گوتم نے کہا "یہ میری دھرم پتنی ہے۔ اس کا نام مایا ہے۔"

"میں نے جھک کر سلام کیا۔" وہ بیٹھی رہیں، اپنے سامنے تکتیں رہیں۔

گوتم نے کہا "مایا، میں ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، جو کسی ریستوران میں ممکن نہیں تھیں۔ کیا ہمیں بہت بڑھیا کھانا مل سکے گا۔"

"سوچوں گی۔" مایا نے اسی طرح سامنے تکتے ہوئے کہا۔

گوتم نے پھر کہا تمہاری خاص ڈش ہے نا وہ حلوہ اور پوریاں اور سندھی اچار اور جانے کیا کیا۔ میں نے ان چیزوں کا وعدہ کیا ہے ان سے۔ یہ بہت زمانوں بعد امریکہ سے آئے ہیں، منوہر کے دوست ہیں، اور ایک دو دن میں واپس بھی جانے والے ہیں۔"

"پھر" میں مضطرب تھا اور نہیں چاہتا کہ میرے نام سے مایا کے چہرے پر جو تبدیلی ہوئی۔ اس کے متعلق گوپال کوئی بات گیتا کے سامنے کہے۔ مگر گوپال نے کوئی بات نہیں کہی۔ کم از کم ایسی کوئی بات نہیں کی۔ جس سے میں گیتا کو جواب دینے اور قابل اعتراض ہونے کی توجیہہ پیش کرتا۔

"کھانے پر وہ بہت بدلی ہوئی اور یکسر دوسری عورت لگتی تھی۔ گوپال کہانی کہنے والے کی طرح اب خود بھی اس سارے واقعے سے متاثر ہوتا دکھائی دیتا تھا۔

گوپال کی بیوی دیا اور گیتا دونوں حیرت سے منہ کھولے سن رہی تھیں، اور کہانی میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

گوتم اور میں اتنے عرصے میں مایا کی بات ہی کرتے رہے۔ اس نے مجھے اس کی بیماری کے متعلق بتایا اور بہت دیر تک ہم اپنے اپنے تجربے سے اس کیس کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے اس سے کہا تھا مجھے مایا سے بات کرنے دو، مگر گوتم نے سر ہلا کر کہا "یہی تو اس بات کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ مایا نہ کسی ماہر نفسیات کے

پاس جاتی ہے اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے بات کرنے کو تیار ہے۔ وہ کہتی ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ سوچتی ہے وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ اب پچھلے دنوں میں وہ لوگوں سے کیا اپنا دکھ کہتی پھرے؟" اور پھر میں کوئی بیمار ہوں، نیند نہیں آتی نا! بس کیا ہوتا ہے۔ اس سے آنکھیں بند کر کے میں پچھلے گزرے جنموں کی بیتی باتیں سوچتی ہوں۔ فلم کی طرح ہر واقعہ سامنے سے گزرتا ہے۔"

"ایسے مریض کا تم کیا علاج کر سکتے ہو، جو اپنا علاج خود نہ کرنے دے۔" گوتم تھکا ہوا لگتا تھا اور بوڑھا جیسے کسی اچھے بھلے درخت کو گھن چاٹ رہا ہو، اور وہ وقت سے پہلے گرنے والا ہو۔

"میں نے کہا تم مجھے اس سے الگ سے بات تو کرنے دو۔"

گوتم نے کہا "میں یہ شعبدہ کئی بار کر چکا ہوں۔ ماہر ڈاکٹروں کو گھر لاتا ہوں وہ اس سے علیحدگی میں بات کرتے ہیں مگر تمہیں پتہ ہے وہ میری عدم موجودگی میں ان سے میری بے وفائی کا رونا رونے لگتی ہے۔ اسے کلینک میں ہر آنے والی عورت اور کام کرنے والی نرس پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے تعلقات بڑھا رہی ہیں۔ کئی بار وقت بے وقت میرے کلینک پہنچ جاتی ہے۔ اگر میں کسی مریض عورت کی طرف توجہ سے دھیان سے مخاطب ہوتا ہوں، اس کا حال پوچھتا ہوں تو غصے سے مایا کا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ وہیں پر لڑنے لگتی ہے۔ اس سے میری پریکٹس پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ میں لوگوں سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میری بیوی ذہنی مریض ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی آزما لینے دو" اور پھر ہنس کر میں نے کہا ہو سکتا ہے تمہاری چند غلطیاں مایا کی وجہ سے مجھے بھی معلوم ہو جائیں۔"

گوتم نے کہا "اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ میرے دوست میرے لیے دعا کرو۔"

کھانے پر میں نے دیکھا مایا نے سرخ ساڑھی پہنی تھی۔ وہ بطور خاص اس دعوت کے لئے تیار ہوئی تھی۔ اس نے مانگ میں خوب بڑی دھاری سیندور کی لگائی تھی۔ ماتھے پر بندیا تھی۔ خون کی طرح سرخ بالوں میں پھول تھے وہ ہنس ہنس کر باتیں

کر رہی تھی۔ میں ہولے ہولے کھانا کھاتا رہا۔

دیا نے کہا "تم نے اس کی تعریف نہیں کی؟"

گوپال نے کہا "میں نے کھانے کی بہت تعریف کی۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ مایا بات بات پر ہنس رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں وہ بھٹکی ہوئی سی کیفیت تھی۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اور وہ پلکیں بہت جھپکتی تھی۔"

گوتم کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا تو وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سانس روک روک کے کہا۔ "مایا دیوی آپ تو بہت بدلی ہوئی اور بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ دو گھنٹوں میں آپ کتنا بدل گئی ہیں۔"

مایا کے ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی اور اس نے میری طرف جھک کر کہا "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

دیا نے کہا "تو یہ ہے گوپال کیا ڈرامہ بنا رہے ہو، بات سنا بھی چکو۔"

گوپال نے کہا "یوں مایا کی طرح گھبرا کیوں رہی ہو۔ سنا تو رہا ہوں۔ اچھا تو پھر ایک لڑکی کمرے میں آئی۔ مایا نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور نفرت سے پوچھنے لگی "روپا کیا ہے۔"

"میں نے روپا کو دیکھا بہت پیاری لڑکی ہے۔" گوپال نے آہستہ آہستہ کہا اور میری آنکھوں میں دیکھا، جیسے میرا راز جانتا ہو۔

میرا دل کانپ گیا۔ اب اگر اس نے روپا کی شکل کا بتایا۔ مگر نہیں وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ روپا کی اور میری شکل کے ملنے کو محض اتفاق نہیں سمجھتا تھا، اسے میرا راز معلوم تھا۔

دیا نے کہا کیا وہ لڑکی جوان تھی۔"

"یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔" گوپال نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"اس نے ماں کے یوں سختی سے بولنے کا برا نہیں منایا۔" گیتا نے پوچھا۔

"نہیں وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ آکر ماں کے پاس کھڑی ہوگئی اور ہنس کر

کہنے لگی: "ماں میں تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔ بابا سے کوئی ملنے آیا ہے۔ شاید کوئی مریض ہے۔ میں نے سوچا "آپ اکیلی ہوں گی"۔

مایا کے چہرے پر نرمی سی اُمنڈ آئی۔ اس نے روپا کو اپنے قریب کر لیا۔ کہنے لگی، "گوپال صاحب میری بیٹی کو میرا بہت خیال رہتا ہے۔ یہ باپ کی طرح نہیں ہے اور نہ میرے بیٹے کی طرح جو ہر بات میں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ میری بیٹی مجھے دنیا میں ہر شے سے زیادہ پیاری ہے"۔

گیتا اور دیا دونوں اُداس سی ہو گئیں۔

میں نے پوچھا "اس نے تم سے گوتم کی شکایت نہیں کی"۔

گوپال نے کہا۔ "مجھے وہ پورے حواسوں میں بھی نہیں لگی۔ مگر اتنا زیادہ فکرمند ہونے کی بات بھی نہیں تھی۔ کئی عورتیں بڑھاپے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ سدا جوان رہنا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے جوانی میں مایا ذرا خوش باش عورت ہو گی۔ اپنے ساتھ قصوں کو وابستہ کر کے خوش ہونے والی، خیالوں میں چاہنے والوں کی قطاریں دیکھ کر جی ہی جی میں مطمئن ہونے والی اور پھر جسم میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، وہ بھی عورت کو بدل دیتی ہیں۔ یکسر اندر اور باہر سے اس کی کیفیات اور احساسات بدل جاتے ہیں، وہ چڑچڑی، کم گو، سست یا تیز ہوتی ہے۔ یوں سمجھو ندی اپنا رُخ بدل لیتی ہے

گیتا نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ دیا چلیں، میں وہ سب چیزیں دیکھنا چاہتی ہوں جو گوپال بھائی لائے ہیں۔ گوتم اور مایا کا قصہ تو ختم سمجھو، یہ اب پیشہ وارانہ باتیں کر رہے ہیں"۔

پھر وہ دونوں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اور گوپال بنا بات کئے بیٹھے رہے جیسے کہنے کے لئے کچھ باقی نہ رہا ہو، جیسے وہ مایا کی بات کرتے ڈرتا ہو اور میں سنتے ہوئے۔

مایا نے ہی ایک خط میں لکھا تھا۔ تمہارے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں ان کی کمر جھک گئی ہے۔ وہ دل کے ہاتھوں بہت پریشان ہیں۔ گوتم کے علاج سے بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے معلوم ہے تم میری وجہ سے واپس نہیں آتے۔ "مگر یقین

کرو گھر سے جو خط آتے ہیں، ان میں تو آدھا بھی حال نہیں لکھا ہوتا۔ بیماری کی شدت کا۔ تمہارا چھوٹا بھائی وہیں وطن میں محض اس وجہ سے رہتا ہے کہ تمہارے بابا کو اب اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کچھ مہینے ہوئے وہ آیا تھا تمہارا بھائی ہے نا اس لئے میں اسے لے کر ان سب جگہوں پر گھمانے لے گئی جہاں کبھی تم اور میں جایا کرتے تھے۔ سمندر اسی طرح طوفانی ہے پر دیوی دیوتا کا وہ جوڑا نہیں، جن کے قدموں پر لہریں۔ رات کو آ کر اپنا سر ٹیک سکیں۔ روپا بڑی ہو رہی ہے۔ میں اسے یہ بھولنے نہیں دیتی کہ تم اس کے بہت قریبی عزیز ہو۔ اور امریکہ میں ہو۔"

بابا مجھے یاد کرتے ہیں، مگر کبھی لکھتے نہیں کہ انہیں میری ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ لوٹ آؤ۔ اور یونہی بیٹھے بٹھائے ایک دن میں نے وطن واپس آنے کا سوچا۔ دوسری زمین میں ہمارے ہاں کے درختوں کی جڑیں کبھی گہری نہیں جاتیں، اور اس لئے امریکہ چھوڑتے ہوئے مجھے ذرا دکھ نہیں ہوا۔ بابا کو لے کر میں واپس آیا۔ گوتم سے ملاقات ہوئی، ہسپتال میں اسے لے کر گیا۔ ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھایا۔ ان کی بیماری کی تشخیص ہوئی کچھ دنوں وہ ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ پھر انہیں چھٹی مل گئی۔ چونکہ کمزور تھے اس لیے ابھی ان کا کراچی چھوڑنا مشکل تھا۔ ہسپتال میں وہ دن اور وہ راتیں بہت فکرمندی بے چینی اور اضطراب کی تھیں، مجھے تو اپنے گرد وپیش کی بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا بابا نہ رہے تو میرے چاروں طرف اندھیرا ہو جائے گا۔ چھوٹا بھائی گردھاری بھی یہیں تھا۔ بہنیں روز خط لکھتیں، بڑے دکھ کے دن تھے وہ۔

گوتم بڑی باقاعدگی سے آتا تھا، کبھی کبھار پاپا بھی آ جاتی۔

بابا آکسیجن پر جی رہے تھے۔ ہر وقت ایک آدمی ان پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہتا تھا میں اپنے آپ کو کوستا تھا۔ آخر سات سال یا سترہ سال، کیا فرق پڑتا تھا؟ پھر میں بابا سے کوئی ڈرتا ہوں۔ میں کس شے سے بھاگ رہا تھا۔

جب بابا ذرا اسکون سے ہوئے تو گوتم نے آنا کم کر دیا۔ اب وہ کلینک جاتے ہوئے صبح یا شام بس ایک وقت آتا۔ مجھے کہتا "منوہر تم تو لڑکیوں سے بھی کم ہمت ہو

میں جانتا ہوں انہیں تمہاری پوری توجہ کی ضرورت ہے مگر کسی وقت آرام تو کیا کرو، گردھاری کو یہاں چھوڑ کر خود ہمارے ہاں جاؤ۔ کسی دن ڈھنگ سے سو لو تو تمہارے چہرے پر زردی تو کم ہو۔"

میں نے تب دیکھا کہ گوتم خود بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ اس کے بالوں کی سفیدی اب سیاہی سے زیادہ نمایاں تھی۔

میں نے کہا "تم جو کام کرتے ہو، اتنی چلتی ہوئی تمہاری پریکٹس ہے۔ آخر دولت کیا کرو گے۔ کیوں اتنے مصروف رہتے ہو۔ کبھی چھٹی بھی کرو۔"

کہنے لگا "تم سمجھتے ہو میں دولت کے پیچھے دیوانہ ہوں، اصل یہ ہے کہ میں مصروف رہنا چاہتا ہوں، اتنا مصروف کہ مجھے بات کرنے کی بھی فرصت نہ ہو۔"

میں نے کہا "میں زندگی میں نہ پیسہ کمانا چاہتا ہوں، نہ مصروف رہنا چاہتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے میں کامیاب ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔"

گوتم نے کہا، حالات اور واقعات آدمی کو وہ بناتے ہیں جو وہ نہیں ہونا چاہتا شاید میں بھی تمہاری طرح سوچوں، سوچ رہا ہوں۔

بابا نے کروٹ بدلی، آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے "میں اس ماحول سے گھبرا گیا ہوں مجھے یہاں سے لے چلو منو بیٹا۔ پھر گوتم سے بولے "مجھے اب بس یہاں سے لے چلو۔"

آسانی کی خاطر ہم لوگوں نے نچلی منزل میں وہ کمرہ لیا تھا جو گوتم کے گھر کا مہمان خانہ تھا۔ وطن سے آنے جانے والے احوال پوچھنے والے، میرے ملنے والے ساتھی دوست ڈاکٹروں کا آنا جانا۔ یہاں رہنے میں سو سکھ تھے۔

مایا بھی بابا کی دیکھ بھال میں لگی رہتی، لوگوں کی خاطر داری کرتی، ڈاکٹروں سے بات کرتی۔ قسم قسم کے پرہیزی کھانے پکوا کر دیتی، بچوں کو شور کرنے سے روکتی۔ جیسے وہ گھر کی بہو ہو۔ میں نے سوچا تھا یونہی شاید بھگوان نے اس کی مدد کی ہو، اور وہ بھول گئی ہو۔

انہی دنوں جب بابا ابھی ذرا ذرا اچھے ہو رہے تھے۔ تکیوں کے سہارے بیٹھ جاتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے چمچ پکڑ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ گردھاری کے

کپڑے بہت صاف ہوتے ہیں، اس کے چہرے پر اکثر سپنوں کی پرچھائیں سی رہتی
ہے۔ بات کرنے میں ہنسی اس کے ہونٹوں پر اُس کی آنکھوں میں ناچتی ہے۔ وہ بڑا
بے چین سا رہتا ہے۔ بیٹھا ہوتا ہے مگر اُس اطمینان سے نہیں۔ جس سے وہ ہسپتال میں
بیٹھا کرتا تھا۔ جب میں اُسے اکیلا چھوڑ کر جاتا ہوں تو وہ نصیب سے لڑ جانے والے
آدمی کی طرح کرسی پر گر جاتا ہے۔ بابا کے کام وہ پہلے سی دلجمعی سے نہیں کرتا۔ اُس کی
نگاہیں اُدھر اُدھر دروازوں پر بڑی امید سے پڑتی ہیں۔ جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

میں نے سوچا یونہی میرا وہم ہے۔ گرُدھاری نے دن رات ایک کر کے بابا کی خدمت
کی ہے میرے ساتھ اس نے بھی سارے دکھ کاٹے ہیں۔ وہ جوان ہے۔ پُرامید ہے
اور میں کسی کو پتہ ہو یا نہ ہو زندگی کی ایک دوڑ ختم کر چکا ہوں۔ ندی پہاڑوں سے
نکلتی ہے تو پُرشور ہوتی ہے۔ تیزی سے بہتی ہے۔ میں میدان میں سے گزرنے والے
دریا کی طرح ہوں، اپنے سینے میں طوفان چھپائے ہوئے، اور پھر بھی آہستہ چلنے والا
اپنے وہموں پر میں خود ہی شرمندہ سا ہوا۔ اس کے لئے میرے جی میں میل سا آگیا تھا، وہ
اپنے آپ ہی صاف ہو گیا۔

ہم لوگ واپس جانے والے تھے گوتم میرے لیے ایک سرکاری ہسپتال میں
کوشش کر رہا تھا۔ باہر سے ڈگریاں لے کر آنے کے باوجود یہاں آکر پتہ چلتا ہے کہ
جتنے سال تم ملک سے باہر گھومتے رہے۔ یہاں پر تم سے کوئی نہایت جونیئر آدمی اس
مرتبے پر پہنچ گیا۔ جس کے مقابلے میں تم کچھ نہیں ہو۔ یہ میرا ہی نہیں باہر سے آنے والے
تقریباً ہر پیشہ کے آدمی کا مسئلہ ہے۔ سفارشوں، رشوتوں کا چکر چلتا ہے۔ فنکارانہ مہارت
کی جو ناقدری ہوتی ہے۔ ہر کسی کو اس کا کہیں نہ کہیں تجربہ ضرور ہے۔ گوتم نے اپنے
سارے ذرائع کو پہلے کی طرح میرے لیے لگایا تھا۔

احسانمندی کی جو لہر کبھی کبھار [illegible] تھی۔ اس پر یہ خیال بھی سمندر کی سطح پر
تیرنے والے جہازوں سے نکلے تیل کے داغ کی طرح ابھر آیا کہ گوتم جو میرے لیے اتنی
تگ و دو کر رہا ہے۔ اگر اُسے معلوم ہو جائے؟

مایا نے ایک بار مجھے کہا تھا "گوتم کو پتہ ہے کہ میں تمہاری مسٹریس ہوں"۔

گوتم کو اگر پتہ ہوتا تو کیا وہ یہ ساری تکلیف میرے اور بابا کے لئے برداشت کرتا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ ہو سکتا ہے روپا کی مجھ سے شباہت بھی اس کا جھوٹ اور محض اتفاق ہو۔ ورنہ گوتم برداشت کرتا؟ پر کبھی کبھار انسان میں بے پناہ چیزیں، دکھ اور واقعات کو برداشت کرنے کی طاقت آجاتی ہے۔

وہ رات بڑی بوجھل تھی۔ میں اور گوتم دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ آج کلینک نہیں گیا تھا۔ میرے لیے کسی وزیر سے ملا تھا۔ ہم پہلے سیاست اور اس کے بعد ملازمتوں میں مختلف چکروں کی کہانیاں کہتے رہے۔ وہ کہتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کا تجربہ بے پناہ اور نظر بڑی گہری تھی۔ میں جی میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ سیاستدان ہوتا تو آج وزیر ہوتا۔ مگر افسوس کہ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ جس کو ملکی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں تھا جو بہت جاننے کے باوجود کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ پُرامید بھی تھا اور پھر بھی وثوق سے کچھ نہیں جانتا تھا۔

کہنے لگا "میں نے ان پر جو احسان کیا ہے اگر انہیں یاد ہو گا تو میرا کام کرنا وہ اپنا فرض سمجھیں گے"۔

"لوگ احسانات کو اکثر بھول جاتے ہیں"۔ میں نے گوتم سے زیادہ اپنے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں منوہر لوگ احسانات بھول جاتے ہیں، احسان کرنے والے کو بھول جاتے ہیں۔ زندگی میں کوئی خوبصورتی کوئی پاکیزگی اور کوئی سنجیدگی باقی نہیں رہی اور پھر بھی ہم لوگ جی رہے ہیں، جیتے رہیں گے"۔ گوتم اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی بابا کے پاس کمرے میں چلا آیا۔ گردھاری اوپر پورچ والے کمرے میں رہتا تھا، اور وہیں سوتا تھا۔

مالتی کا خط آیا تھا کہ اس کا جی اچھا نہیں تھا۔ وہ اکیلے میں گھبرا گئی تھی۔ اس

نے لکھا تھا کہ اگر اس خط کا جواب فوراً نہیں آیا تو وہ ماما کے بیٹے کو ساتھ لے کر چلی آئے گی اور یہ محض دھمکی ہی نہیں تھی۔ میں سارا دن کاموں میں اتنا مگن بابا کی دیکھ بھال اور اپنی دوڑ بھاگ میں ایسا محو تھا کہ مجھے گردھاری کو خط کے متعلق بتانے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ کپڑے بدل کر لیٹا ہوں تو مالتی یاد آئی اور اس کی دھمکی بھی، اگر وہ آگئی تو! ایک دو دن کی بات اور تھی۔ ہم لوگ جانے ہی والے تھے۔ میرا خیال تھا گردھاری لوٹ جائے مجھ سے پہلے۔

پہلے میں نے سوچا میں اُسے صبح بتا دوں گا اور شام کی کسی گاڑی سے وہ چلا جائے گا۔ مگر میل تو صبح ہی جاتی تھی۔ اگر گردھاری اس سے چلا جائے تو اگلے دن پہنچ جائے گا اور مالتی اتنا لمبا سفر کرنے کی زحمت سے بچ جائے گی۔ یہ خیال مجھے نہیں آیا کہ مالتی کو رکنے کا تار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آدمی کو کئی باتیں بروقت سوجھ جایا کریں تو پچھتاوے ہی زندگی کا حاصل نہ ہوں۔

باہر نکل کر پہلے میں نے سوچا گردھاری کو یہیں کھڑے کھڑے پکاروں۔ پھر میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا ان سیڑھیوں سے ہولے ہولے اوپر چڑھا۔ آخری سیڑھی پر قدم دھرا ہے تو کوئل بولی۔

مجھے وہ دن یاد آئے جب میں یہاں نیا نیا آیا تھا۔ اس سارے عرصے میں کتنی امیدیں، کیسے کیسے محبت بھرے لمحے کبھی نہ لوٹنے کے لئے بیت گئے وہ راتیں جن کو دل کے کسی گوشے میں میں اب بھی چھپائے ہوئے تھا، راتیں جو میری زندگی تھیں، کیسے میں نے اور رمایا نے یہاں کھڑے ہو کر کوئل کی کوک کو سُنا تھا۔ اس کے بولنے کا انتظار کیا تھا، چاندنی پتوں کے اندر سے چھن کر کمرے کے اندر آتی تھی۔ سات رنگوں کے شیشوں میں سے رنگوں کی چھوٹ سی بن کر ہمارے اوپر پڑا کرتی تھی اور رمایا کا ترشا ہوا سراپا اس گھڑی ایک پاگل کی طرح میرا دل ان پرانی یادوں سے کس طرح دھڑکا؟ میں جانے کب تک ماتم کرنے والے کی طرح سیڑھی پر کھڑا رہا اور کھڑا رہا۔

آخری راتوں کے چاند کا کونہ مجھے چھت کے کنارے نظر آیا۔ دور کی کسی

بلڈنگ میں بتی جلی۔ کہیں کوئی بچہ رویا کوئل پھر بولی، ستارے زرد سے جڑے ہوئے نگینوں کی طرح آکاش کے نیلے پن میں بڑے بڑے اور روشن چمکے یہ تصویر کی طرح کی رات آج تک میرے ذہن کے پردے پر اسی طرح ہے۔ جیسے کوئی مصور تصویر کو یونہی ایزل پر چھوڑ دے اور خود جانے کہاں گم ہو جائے۔ گردھاری کو جھک کر جب میں نے جگانا چاہا تو اس کے تکیے پر سیاہ بالوں کا جال سا بکھرا تھا اور کمرے میں مجھے پاگل کرنے والی خوشبو پھیلی تھی۔ مایا کے سانس کی خوشبو!

بابا سے میں نے کہہ دیا تھا کہ "مجھے میری محنت کا کوئی صلہ اس ملک میں نہیں مل رہا۔ اس لیے میں امریکہ واپس جانا چاہتا ہوں"

بابا نے کہا تھا "بیٹے میں بوڑھا ہوں اور بیمار بھی، مگر میں اپنی خاطر تمہیں روکنا نہیں چاہتا۔"

گوتم نے کہا "میں کوشش کر رہا ہوں تم گھبرا گئے ہو۔"

میں پاگل ہو رہا تھا اور یہ میرا آخری فیصلہ تھا۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ بھلا میں کس شے سے بھاگ رہا تھا۔ وہ نرک جو میرے اندر ہے۔ اس کو میں نے بس دھکیل دیا ہے۔ دل کے ایک کونے میں قید کر دیا ہے پھر جب وہ یاد آتی ہے تو آتی ہے اس کی رومان پسندی اس کا چھپ چھپ کر مجھ سے ملنا، ایک ایک یاد ہزاروں یادوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔

جانے کون سی جگہ تھی اب تو یاد نہیں اس دن سمندر بہت طوفانی تھا۔ ہوا رہ رہ کر چلتی تھی۔ جیسے اپنا زور آزما رہی ہو، اپنے طوفانوں سے کھیل رہی ہو، جیسے سمندر نے اور ہوا نے شرط باندھی تھی کہ وہ ہم کو مجھے اور قدیر کو یہاں سے بھگا دیں ان میں سے کون زیادہ طاقتور ہے ہوا یا سمندر!

قدیر نے کہا تھا "تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ بھلا یہاں کیا دھرا ہے اور پھر سات سال امریکہ میں رہ کر تم تقریباً اجنبی ہو گئے ہو۔ وہاں کی تیز رفتار زندگی کو جیت سمجھ لو اور یہاں کی بیل گاڑی میں جُتنا کیسے اچھا لگے گا بھلا!"

میں نے کہا تھا "قدیر مجھے یہاں کی بیل گاڑی میں جتنا بھی اچھا لگتا مگر اب یہاں سے جی بھر گیا ہے۔ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ سب چیزیں بہت یاد آئیں گی، بہار میں درختوں پر کبھی کبھار سپنے جگانے والی کوئل کی کوک، نیلے آکاش تلے پھیلے سبزے کے خواب دیکھتا ہوا بیل گاڑی چلانے والا کسان، پہاڑوں میں شام کو تیز قدم اٹھاتے والا آدمی اور وادیوں میں گونجتی ہوئی گیتوں کی صدائیں! مگر یہ سب میرے نصیب میں نہیں ہے۔"

قدیر نے کہا "تم جذباتی ہو رہے ہو۔ بیئر پیو۔ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اچھے بھلے تھے ابھی شاعری کرنے لگے یار، تم کہیں امریکہ میں ڈاکٹری کی بجائے ادب تو نہیں پڑھتے رہے۔ پھر اس نے ایکسیلیٹر کو زور سے دبایا اور موٹر تقریباً چھٹیاں کھاتی ہوئی سمندر کے لہراتے پانی کے اندر ہی سڑک پر اڑنے لگی۔ اس نے اپنی ہٹ بنائی تھی اور وہ میری الوداعی پارٹی کرنے کی خاطر مجھے یہاں لایا تھا۔ اس کی موٹر میں بیئر کی بوتلیں بھری تھیں۔ کھانے کی چند چیزیں تھیں اور پانی کی ایک بوتل تھی۔ شام کی دھوپ ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی لگتی تھی اور سمندر پاگل بنا لہروں کے جھاگوں سے بھرے منہ پھیلائے پھنکارتا تھا۔ جیسے غصہ ور اژدھا ہو۔ ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے پتھر تھے جو جھاگوں سے ڈھکے دھنکی ہوئی روئی کے ڈھیروں کی طرح تھے۔

قدیر پی رہا تھا اور سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا لہریں بڑھتی تھیں، اور برآمدے کے سامنے تک آتی تھیں۔ سگریٹ کا دھواں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں نہایت حقیر رینگنے والے کیڑے کی طرح اوپر اٹھنے کی کوشش کرتا تھا اور پھر ہوا کے زور سے نیچے جھک جاتا تھا۔ ہمارے بال اُڑتے تھے اور ہم ہنس ہنس کر پاگل ہوئے جاتے تھے۔ میں پی نہیں رہا تھا۔ بیئر کوئی پینے کی شے ہے بھلا۔ بیئر پینا مجھے پینے کی توہین لگتی ہے اور نشے کی بھی۔ نشہ تو آدمی کے اندر کی گرہیں کھولتا ہے۔ اُسے اپنے آپ کے بندھنوں سے آزاد کرتا ہے۔ جینے کا قرینہ سکھاتا ہے دکھوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت دیتا ہے۔ زندگی خود ایک بہت بڑا نشہ ہے زندہ

ہوتا جب کہ تم مرنا چاہو

قدیر ہوتے ہوئے رو رہا تھا۔

میں نے کہا رو کیوں رہے ہو، کون یاد آ رہا ہے۔ کس کی بے وفائی تمہیں رونے پر مجبور کر رہی ہے۔ کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں وفا کوئی شے نہیں ہے جیسے کوئی لمحہ واپس نہیں آتا۔ اسی طرح گزری محبتیں واپس نہیں آ سکتیں۔ کوئی پرندہ اس جگہ دانہ چننے نہیں جاتا۔ جہاں دانہ نہ ہو، مگر آدمی اسی جگہ جانا پسند کرتا ہے جہاں کچھ باقی نہ ہو۔"

انسان میں اور پرندے میں بہت فرق ہے۔" میں نے باہر جا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے مایا کے ساتھ ہی وہ رات یاد آ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا، اگر میں یہاں بیٹھا رہا تو اپنے حواس کھو دوں گا۔

"ٹھیک ہے۔" قدیر نے میرے برابر آ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "پرندہ انسان سے بہتر ہے اور انسان عورت سے بہتر ہے۔"

"کیا بک رہے ہو۔ اتنی کیوں پی رہے ہو یا بیئر پر بہک رہے ہو" میں نے اُسے کندھے سے پکڑ کر کہا۔

"خدا کی قسم منوبر۔ عورت نہایت گھٹیا اور قابلِ نفرت شے ہے۔" قدیر نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ قدیر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ عورتوں سے بھاگتا ہے اپنی کسی مریض عورت سے بھی بات نہیں کرتا۔ بہت اچھا مگر خاصا ناکام ڈاکٹر ہے۔ کیونکہ اس کے کلینک میں عورتوں سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔

میں نے کہا "بیئر کے جھاگ سمندر کے جھاگوں کے ساتھ مل کر تمہارے دماغ پر چھا گئے ہیں۔"

"تم سوچتے ہو میری کوئی محبوبہ نہیں ہو سکتی۔" وہ ہچکیوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کہتے ہو میں کسی عورت کی توجہ کے قابل نہیں تھا۔" وہ برآمدے سے خالی بوتلیں لا لا کر لہروں میں پھینک رہا تھا۔ "بھاڑ میں یہ لو۔ یہ لو۔"

سورج کو بادلوں نے ڈھانپ لیا، سرخ رنگ سمندر میں بکھر گیا اور خون کی موجیں سیاہی میں ڈوبتی چلی گئیں۔ نہ تاروں کا نور تھا۔ نہ چاند تھا نہ سمندر میں ہی کوئی پنک تھی ہوا میں ایسی باس تھی جس سے جی متلانے لگتا ہے۔ ہمارے گرد کوئی آواز نہ تھی۔ دنیا میں دو اکیلے انسان۔

"ایسی ہی طوفانی رات تھی اور وہ ڈر رہی تھی، کانپ رہی تھی" قدیر نے کہنا شروع کیا

"کون" میں نے برآمدے میں کرسی گھسیٹ لی، لہریں بڑھ رہی تھیں اور لگتا تھا کہ ہٹ کو بہا کر لے جائیں گی۔ میری آواز میں مذاق کو محسوس کر کے اس نے کہا۔

"تم سوچتے ہو میں یہ کہانی بنا رہا ہوں۔ کئی اور لوگوں کی طرح محض رومان پسندی کی تسکین کے لئے یہاں آکر تم کو باتیں گھڑ کر سنا رہا ہوں۔

"ارے بھئی نہیں قدیر تم تو ناراض معلوم ہوتے ہو۔ میں کہانی سننے والے کی طرح ہنکارا بھر رہا ہوں، اپنے جاگنے کا ثبوت دینے کے لئے، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ لہریں بڑھتی آتی ہیں۔ کمرے میں چلیں میں لیمپ جلاؤں گا" میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

" ارے کہانی تو سناؤ۔ جھوٹی سچی تو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے سُن تو لوں۔ لیمپ جلاؤ میں، چلو اندر چلو۔ پانی اب یہاں تک آگیا ہے" میں نے پھر اُٹھنا چاہا۔

" اندھیرے میں ایک چراغ جلانے سے کیا ہوگا منوہر" تاریکی میں ذرا سی روشنی تو بڑی ڈراؤنی لگتی ہے' اور میں تو بچپن سے اندھیروں کا عادی ہوں۔ میں جب چھوٹا تھا اور اپنے گاؤں میں دادی کے پاس رہتا تھا تو میری دادی شام کے بعد دیا جلانے نہیں دیتی تھی۔ غریب آدمی کے لئے زیادہ روشنی اچھی نہیں رہتی۔ تیل بچ جاتا تھا پھر رات میں کہانیاں سننا بہت اچھا لگتا تھا جب ہوا ہو تو دیئے جل ہی نہیں سکتے۔

میں بیٹھ گیا لہریں ہم پر سے گزرنے لگیں۔

" خدا کی قسم منوہر تم سمجھتے ہو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ مگر وہ عورت نہیں جل پری تھی۔

قدیر بدستور اپنی کہانی میں لگا تھا۔

"میں نے کب کہا ہے یہ جھوٹ ہے" مجھے سب سے چھوٹی جل پری کی کہانی یاد آ

رہی تھی۔ جس نے آدمی کی محبت حاصل کرنے کی خاطر مچھلی سے عورت بننا منظور کیا تھا اور جس کی زبان اس کے خاندان والوں نے اسے نہیں دی تھی، جو رو نہیں سکتی تھی اور جس کو چلتے ہیں اتنی تکلیف ہوتی تھی۔ جیسے کوئی تلواروں پر چل رہا ہو۔ اب پانی کمرے کے اندر آرہا تھا۔ لگتا تھا ہم سمندر کی تہہ میں کسی محل میں ہیں۔

کتنی مکمل رات ہے لگتا نہیں کہ ہم فنا ہو گئے ہیں، اور ذرّوں کی طرح لہروں اور جھاگوں میں مل گئے ہیں۔

ہم ہٹ سے نکل کر دوسری طرف گیلی ریت پر بیٹھ گئے۔ سڑک نیلے فیتے کی طرح سمندر سے الگ ہوئے پانی کے ایک قطعے کے کنارے کنارے چلی گئی تھی۔ موٹر سیاہ تودے کی طرح لگتی تھی۔ کھڑے پانیوں کی ناگوار لساند سے فضا بھری تھی جو ہوا کے زور کے ساتھ رُخ بدل کر کبھی کم ہوتی تھی اور کبھی زیادہ۔ ریت اڑ رہی تھی اور ہوا ہمیں بھی اڑائے دیتی تھی۔

میں نے کہا "تمہاری محبوبہ کی طرح مجھے بھی لگ رہا ہے۔ چلو موٹر میں چل کر بیٹھیں تم اس کی طرح کیسے ہو سکتے ہو۔ وہ عورت نہیں کوئی عجیب شے ہے۔ بنا کہے بنا احسان جتائے محبت کرنے والی بنا نخرے دکھائے بنا ڈر کے ملنے والی، تمہیں پتہ ہے اس نے شہر میں ایک جگہ محض اس لیے الگ سے لے رکھی ہے کہ کبھی کبھی اکٹھے ہونے کے لئے ہر دفعہ نئی جگہ نہ ڈھونڈنی پڑے۔ قدیر اور میں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

میرا دل سینے میں زور سے دھڑکا۔

"آدمی کو اس کے قریب ہوتے سے نشہ ہونے لگتا ہے۔" قدیر نے ہاتھ میں پکڑی بوتل کو ختم کر کے اُسے پرے پھینک دیا۔ ہلکی سی آواز آئی۔

"مگر اب وہ ہے کہاں۔" میں نے پھر بے یقینی سے کہا اور قدیر نے بے یقینی کی اس آواز کو پھر محسوس کر کے کہا۔

"اگر تم یقین نہیں کرتے تو میں تمہیں نہیں بتاتا۔"

"بے یقینی نہیں سو گنہ لے لو، مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ جب وہ اتنی محبت سے

تم کو ملتی ہے۔ پھر بھی تم عورت کو برا کہتے ہو۔" میں نے نہایت ایمانداری سے کہا۔
جب وہ باغوں میں ساحلوں پر ہوٹلوں میں مجھے ملتی رہی تو میں خوش تھا اور مجھے اپنی قسمت پر ناز تھا۔ اس کمرے کو اس نے سجایا تھا۔ دکھائی نہ دینے والی روشنیاں جس سے ہر شے جگمگاتی رہتی اور اس کے سیاہ بال کمر سے نیچے تک پہنچتے ہوئے۔ میں پلنگ پر لیٹا خوشبوؤں کے درمیان خواب بنا اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ وہ ایسی شراب ہے جسے پینے پر بھی آدمی کو پتہ نہیں چلتا کہ تم پی چکے ہو ہلکی اور نہایت پرانی شراب ہے۔"
کوئی محبوبہ ایسی ہو سکتی تھی اور کمرہ کرائے پر لینا کون مشکل بات ہے۔ اگر تم اُسے محض اس وجہ سے چاہتے ہو تو ...... خیر میں کچھ نہیں کہتا۔" میں نے بات ختم کی۔
"مایا کی طرح ہر عورت نہیں ہو سکتی۔" قدیر نے پتھر پر سے اُٹھ کر موٹر کی طرف جاتے ہوئے کہا ہماری پشت پر طوفان تھا جو ہٹ کے بند دروازوں سے ٹکرا رہا تھا اور ایسا ہی طوفان میرے سینے میں اُٹھ رہا تھا۔
"کون مایا۔" میں نے قدیر کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔
"کون سی مایا"

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

قدیر ہوا میں ڈگمگاتا ہوا موٹر کی طرف جا رہا تھا اور اس کی آواز بھری اور پھٹی پھٹی تھی۔ اسے نہ آواز پر قابو تھا اور نہ قدموں پر۔
بوتل نکال کر وہ موٹر کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میں نے زور سے پوچھا،
"بتاؤ کون ہے مایا؟"
مایا ایک ہی تو ہے اس شہر میں، اس کی سی کون ہو سکتی ہے بھلا" قدیر نے بوتل کو منہ سے لگایا۔

میں نے زور سے ہاتھ مار کر بوتل کو گرا دیا" تمہیں بتانا پڑے گا مایا کون ہے"۔
" سنو منوہر کوئی عورت بھی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کے لئے خون خرابہ کیا جائے اور ابھی تم جانتے نہیں ہو کہ کون مایا ہے۔ بیئر کی ایک بوتل بھی اس سے مہنگی ہے میرے دوست"۔

قدیر افسوس زدہ سا بونٹ کے اوپر بیٹھ گیا۔

" مایا کے متعلق کہو۔ میں بھی سنوں اس کا وجود ہے بھی کہ وہ بھی کوئی خیالی شے ہے"۔ میں بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

" گوتم......"

اور اس سے پہلے کہ وہ بات ختم کرتا۔ میرا ہاتھ اٹھا۔ تڑاخ کی آواز آئی۔

" تم مایا کو جانتے ہو" قدیر نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنے جذباتی پن پر بڑی شرم آئی۔

میں موٹر کے اندر بیٹھ گیا اور قدیر بھی ڈرائیور کی سیٹ پر آبیٹھا۔ وقت کی موجیں اور لہریں ہم پر سے گزرتی گئیں۔

میں آخری بار مایا سے ملنے جا رہا تھا۔ کئی دن سے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ اور سخت بے چین تھا۔ مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ بابا کے جانے کے بعد سے میں ان لوگوں سے نہیں ملا تھا۔ میں گوتم سے بھی نہیں ملا تھا اس رات کے بعد سے ایک آگ میرے سینے کے اندر جلتی تھی جو میرا وجود دیکھلا رہی تھی۔ نفرت تو محبت سے شدید تر جذبہ ہے۔

جہاز کے ٹکٹ خریدے جا چکے تھے اور میں اگلے دن پرواز کرنے والا تھا سامان بندھا رکھا تھا۔ دوست میرے گرد تھے۔ ہم لوگ گیلی ریت پر لوٹ رہے تھے اور پی رہے تھے۔ چاندنی تھی جو ہوا کے ساتھ اڑتی تھی۔ ساحل کے ساتھ اوپر کی طرف بنے شو کے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں، کوئی ایسے سمے پوجا کرنے آیا ہوگا۔

قدیر ناچ رہا تھا اور تھک کر گر جاتا تھا اور پھر اٹھتا تھا۔ کبھی کیلاش کے بازوؤں

میں جھوم جاتا اور کبھی فیروز کے اوپر گر جاتا۔ مجھے گوتم کا ناچ یاد آ رہا تھا۔ دُور پرے سے
ہم سے بہت پرے کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ خالی بوتلیں کبھی کبھار چمک سی پڑتیں۔
جیسے رنگین شیشے ہوں، مجھے پورنج کے اوپر بنے کمرے کی کھڑکیوں کے سات رنگ
شیشے یاد آ رہے تھے۔ جانے گردھاری کے بعد کون کون اس تکیے پر سر رکھ کر سویا ہو
گا۔ جانے کس کے بازوؤں پر وہ سیاہ جال بکھرا ہو گا؟ میں حیران تھا مایا ایسی
کیوں تھی۔

شام کو میں نے الفنسٹن کی سب سے مہنگی دکان کی سب سے بڑھیا ساڑھی خریدی
تھی۔ مایا کو آج تک میں نے جو تحفے خرید کر دیے تھے ان میں یہ سب سے زیادہ
قیمت کی تھی۔ ان سات سالوں میں امریکہ سے بھی میں نے اسے جو کچھ بھیجا تھا۔ اس
کی قیمت بھی کچھ نہ تھی۔ میں نے اپنا دل اسے دیا تھا۔ وہ تو سب سے کم قیمت تھا،
میں نے اپنا آپ اُس پر سے نچھاور کیا تھا۔ اس کی اداؤں پہ سے میں نے اپنی نظریں
اپنے جذبے اپنی محبتیں سب وار دی تھی۔ ان سب کی مایا کی نگاہوں میں کوئی
وقعت نہ تھی۔

میں نے اُسے فون کیا تھا دوسرے سرے پر اس نے کہا تھا۔
"من ہر مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو، تم نے تو ہمیں یوں بھلا دیا ہے جیسے ہم
کبھی تھے ہی نہیں۔"
"مصروف رہا ہوں، مگر تم تو مجھ سے بھی زیادہ کاموں میں لگی رہتی ہو۔ مجھے یاد کرنے
کی فرصت ہی کب ملتی ہے۔" میں نے بات کی۔

"ملنے کب آؤ گے۔ تمہاری پوسٹنگ کا کیا بنا" مایا نے میری سنی ان سنی کرتے
ہوئے کہا۔
کل میں جانے والا ہوں مایا۔ صبح کی فلائٹ سے، جانے پھر کب لوٹ کر آؤں
تم سے ملنے کو جی چاہتا ہے کہو کہاں مل سکو گی۔" وہ تھوڑی دیر چپ رہی، جیسے
کچھ سوچتی ہو۔

"تم کہاں ملنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔کمرے پر یا گھر میں" مایا نے کہا۔

"کمرہ ابھی تک ہے؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"من ہر تم دنیا میں اور مرنے کے بعد بھی میرے ہی رہو گے۔ تمہاری ہر یاد کو میں نے سینے سے لگا رکھا ہے وہ کمرہ تو کیا شے ہے" مایا جذباتی ہو رہی تھی۔

"مگر حیرت ہے تم سات سال سے یہ ترشح شخص میری وجہ سے برداشت کر رہی ہو؟"

میری آواز سپاٹ جذبے سے خالی اور کرخت تھی۔

اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے تم کو تو خوش ہونا چاہیئے تھا" مایا نے پھر کہا۔

"میں خوش ہوں بہت خوش اور اسی لیے تم سے ملے بنا نہیں جاؤں گا" میں نے اپنے آپ کو قابو میں کر لیا تھا۔

"کب آؤ گے" مایا نے پوچھا

میرا خیال ہے تم پھاٹک بند نہ کرنا اور سیڑھیوں کا دروازہ کھلا رکھنا۔ میں کسی وقت بھی آسکتا ہوں۔ آج شام ایک دعوت ہے۔ شاید دیر تک چلے، آہی جاؤں گا، انتظار کرنا اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔

اب جب کہ وہ سب خوش تھے اور اودھم مچا رہے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ پانی بھی سونے لگا تھا۔ میں جانا چاہتا تھا۔ میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قدیر پرانے سندھی گیت گا رہا تھا اور ہچکیاں لے رہا تھا۔ کیلاش ایک خالی جگ بجا رہا تھا۔ اور ہماری محفل پر غیر انسانی محفل کا گمان ہوتا تھا۔ بہکے ہوئے خوشیوں کی تلچھٹ تک پی جانے والے۔

میں نے قدیر کی جیب سے چابی نکالی۔

موٹر ہولے ہولے ان جانی بوجھی راہوں پر بھاگنے لگی۔ ان راہوں پر شہر کی مخصوص لوبیں ڈولتی تھیں۔ ہر سڑک کی اپنی بندھی ٹکی آوازیں اور باس تھی۔ کلفٹن کی آبادی

سونی پڑی تھی اور پھولوں کی خوشبو کے ساتھ ملی۔ اس پانی کی بساند بھی تھی جو جوار بھاٹے
کے دوران اندر آتا ہے تو باہر جانے کی راہ نہیں پاتا۔ پڑا سڑتا ہے اور ہوا کے ساتھ
ساتھ اپنی سڑاند پھیلاتا ہے۔ دور پرے باتھ آئی لینڈ کی روشنیاں تھیں۔ اُس سے
پرے دور تک بتیاں تھیں جو آنکھیں جھپکا رہی تھیں۔ اور کراچی کو اپنی آغوش میں لیے
تھیں۔ پھر میوزیم تھا۔ جس میں پُرانے زمانوں کے دیوی دیوتا اپنے اصلی ٹھکانوں سے نکل
کر شیشے کے مرتبانوں اور الماریوں میں قید تھے اور جن کے ترشے ہوئے جسموں کو دیکھ کر
لوگ بنا آنکھ جھپکائے آگے گزر جایا کرتے تھے۔ لوگ نہ ماتھے ٹیکتے تھے نہ پھول چڑھاتے
تھے نہ آرتی اتارتے تھے۔ عورتیں ننگے پاؤں نہیں موٹروں میں زن سے گذر جاتی تھیں اور
جن کی کوئی ایسی آرزوئیں نہ تھیں۔ جو دیوی دیوتاؤں کی مدد کے بنا پوری نہ ہو سکیں۔ اس
زمین پر کسی پُرانی زمین کا گمان ہوتا تھا زمانہ کتنی ترقی کر گیا تھا۔ فوارے، چوراہے، پبلک
کے تفریح گھر اور باغات جن میں سارا دن کتے لوٹ لگاتے تھے اور شام کو لڑکے بالے اپنی
محبتوں کے قصے کہنے یہاں جمع ہوتے تھے۔

گہرے سانس لیتی ہوئی وکٹوریا روڈ کے چوراہے سے مڑا ہوں تو کوئل کی کوک
سنائی دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا جیسے پرانے دنوں میں اس آواز کو سن کر دھڑکا
کرتا تھا۔ محبت سے اور آنے والی گھڑیوں کے تصور سے جوانی میں ذرا ذرا سی باتیں یاد
کر کے کیسی نبضیں تیز ہو جایا کرتی ہیں۔

ساڑھی کے پیکٹ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے میں پھاٹک کے باہر کھڑا رہا
پورچ کے اوپر ہلکے سے کھانسنے کی آواز آئی۔ سیڑھیوں پر میں دبے قدموں چڑھا۔

"تم نے بہت دیر کر دی" مایا نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا پارٹی تھی، اور شاید صبح تک چلتی ہیں تو انہیں وہیں چھوڑ کر اٹھ
آیا ہوں۔ میرے کپڑے بھی گیلے ہیں۔"

"من آہرا اتنے زمانوں کے بعد کیسے ہو، مجھے تو لگتا تھا اب میں کسی اگلے جنم میں ہی
تم سے مل سکوں گی۔"

اس نے مجھ سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اس جنم میں ہم کافی ساتھ نہیں رہے۔ بھلا اور پھر کس کس سے ملوگی، اگلے جنم میں دروپدی ہے؟"

میری آواز کی تلخی نے اُسے ڈس لیا۔ وہ گھبرا کر پرے ہو گئی۔

"جانے آج کیسی باتیں کرنے آئے ہو۔"

اپنے سے کیے وعدے کے مطابق مجھے خفا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

چاند ڈوب چکا تھا یا مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا میں نے کہا کھڑکیاں دروازے بند کر لو اور بتی جلاؤ۔ اصل میں مجھے اس کمرے میں ملنا چاہیئے تھا۔

"کیا کہتے ہو۔ گوتم اُوپر کمرے میں بتی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ پھر صبح بھی قریب ہے اور اس کی نیند اب بہت ہلکی ہو گئی ہے۔" مایا نے حیرت سے اور کچھ ڈر سے کہا۔

"تم کب سے گوتم سے ڈرنے لگی ہو تم تو اس کی آنکھوں کے سامنے محبّت کا ڈرامہ کھیلنے والی عورت ہو۔" میں اپنے آپ پر قابو پانا ہر لحظہ مشکل سمجھ رہا تھا۔

"طعنے کیوں دیتے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، تمہاری محبّت میں کیا ہے۔" وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

"میری محبت میں۔ میری محبت میں" میری آواز گھٹی گھٹی اور عجیب سی تھی میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہوتی اور کھلتی تھیں۔

"تم آج بہت خفا معلوم ہوتے ہو کیا لڑنے آئے ہو؟" مایا مضطرب سی پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے الماری میں سے ایک ٹیبل لیمپ نکالا اس کی اُلجھی ہوئی تاروں کو سلجھایا اور اسے پردے کے پیچھے کر کے روشن کیا۔ کمرے میں بڑی ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ پھر اس نے دروازے بند کیے کھڑکیاں بند کر دیں۔

اس مدھم روشنی میں اس کا سراپا ویسا ہی اشتہا انگیز تھا اور وہ اسی طرح جاذب نظر تھی۔ اس نے کسی نہایت باریک اور خوبصورت کپڑے کا گھیر دار ڈریسنگ

گون پہن رکھا تھا جس کا پہناوا بہت دلاویز تھا جیسے اس کے گرد آبشار گر رہا ہو۔ اس نے اپنے آپ کو یوں سجایا تھا، جیسے کوئی آخری رسومات کے لیے اپنے کو بنائے سنوارے سولہ سنگار کیئے وہ رادھیکا بنی ہوئی تھی۔ تازہ دم جیسے کوئی کنواری ہو۔ اس کے بالوں میں پھول تھے اور اس نے بڑے ہی اچھے بال بنا رکھے تھے۔

میں نے کہا "تم دل کے بدلے مہنگی نہیں ہو آدمی تم پہ سے جان نچھاور کر سکتا تھا"

میں سچ بول رہا تھا۔ اس گھڑی اُسے کوئی بھی جھٹلا نہ سکتا۔

یہ ڈبے میں کیا ہے۔ اس نے شوق سے پوچھا۔ اس گھڑی وہ اتنی مکمل تھی۔ جیسے ایک عورت ہو سکتی ہے۔ آخر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اسے جھٹلاؤں مگر دوسرے لمحے مجھے قدیر یاد آگیا۔ گردھاری یاد آیا اور میرے دل میں ایک شعلہ سا اٹھا۔

"پوجا کی گھڑی آن پہنچی ہے مایا" میں نے تکیے پر سر رکھ کر ہاتھ اپنے پیچھے باندھ لئے

"میں تیار ہوں میرے دیوتا" میرے من ہر اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا

"سیاہ بالوں کا جال اپنے گرد پھیلاؤ۔ میں تمہارے سراپا کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں"

میں نے جذبات سے کمزور پڑتی آواز میں کہا۔

مایا نے پھولوں کو نکال کر سنگار میز کے اُوپر رکھ دیا۔ پھر اس نے بال کھولے جانے وہ کیوں اتنی سستی سے ہر کام کر رہی تھی اتنے سالوں میں اس کے بال کچھ اور لمبے ہو گئے تھے اور اس کی ساری پشت کو ڈھانپ رہے تھے گھٹنوں تک ایک سیاہ لبادے کی طرح۔

جب وہ میری طرف گھومی ہے تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

مایا کی باہوں نے مجھے نیچے کھینچ لیا جیسے پاتال میں گھسیٹ لیا ہو۔

میں نے اس کا انگ انگ پور پور محسوس کیا، مگر میں بیدار تھا اور پاتال سے باہر آرہا تھا۔ تمہاری باہوں میں جو شاخوں کی سی لچک تھی وہ نہیں رہی مایا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

مایا نے اپنی باہوں کا گھیرا میرے گرد اور تنگ کر لیا۔

تمہاری کھال ڈھلک گئی ہے۔لگتا ہے تم بوڑھی ہو رہی ہو۔

مایا کا کانپتا ہُوا جسم پناہ ڈھونڈنے کے لیے میرے اور قریب ہو گیا۔

تمہارے سانس کی وہ خوشبو جس کا میں دیوانہ تھا اب کم ہو گئی ہے۔تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اس کی ٹھنڈی سانس میرے مُنہ پر شام کی ہوا کی طرح لگی۔

پہلے تم مجھے سورگ کی اپسرا لگا کرتی تھیں، مگر اتنے سالوں میں وہ بات نہیں رہی، تمہارا رنگ پھیکا پھیکا سا ہے، جیسے باسی چیزوں کا ہوتا ہے زیادہ استعمال سے جیسے چیزیں بدرنگ ہو جائیں۔

چیخ روکنے کے لیے مایا نے ہاتھ اپنے منہ پر زور سے بھینچ لیا۔

پھر میں اٹھا اور میں نے وہ ڈبہ کھولا، ساڑھی کو نکال کر پھیلایا اور اس پر ڈال دیا۔یہ اس رات کی قیمت ہے۔

"یہ تم ہو من ہر" مایا شرم سے دوہری ہو رہی تھی۔

ہاں میں ہوں۔میں۔میں منوہر ہوں، اگر دھاری نہیں ہوں میں منوہر ہوں، تدیر نہیں ہوں۔میں کوئی اور نہیں ہوں۔میں ان سب میں سے ایک ہوں جو تمہاری راتوں کی رونق رہے ہیں۔سمجھیں۔!

مایا اپنا ہاتھ کاٹ رہی تھی۔اس کا پُورا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا۔

میں تیزی سے سیڑھیاں اُتر آیا۔کوئل میرے پیچھے کوکتی رہی۔

اگلے دن امریکہ کو جانے والے مسافر جمع ہو رہے تھے۔اور اعلان کرنے والی لڑکی کی پھٹی پھٹی آواز گونجی۔مجھے فون پر بلایا جا رہا تھا۔

دوسری طرف مایا کی آواز آئی "منوہر۔من ہر"

"آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتا"میں نے زور سے فون بند کر دیا۔اور تیزی سے دوستوں کی طرف ہاتھ ہلاتا ہُوا جہاز کی طرف بھاگا۔

مالتی کا خط آیا "ہمارے آنگن میں رنگ برنگی جھنڈیاں سجی تھیں ہم نے ڈھولک پر سہاگ کے گیت گائے تھے۔ گھر رشتہ داروں سے بھرا تھا۔ گیتا بھابی کو دیکھنے کے لیے سارا گاؤں اُمنڈ آیا تھا۔ بھیّا ہم بھابی کو اسی طرح بیاہ کر لائے ہیں، جیسے تم یہاں پر ہو تمہاری تصویر کے ساتھ اس کے پھیرے ہوئے تھے اور جس کمرے میں ہم نے اُسے تارا اسے ہم نے سجایا بھی ویسے ہی تھا، جیسے تمہارے یہاں ہوتے سجاتے۔ پھولوں کی باس سے سر میں درد ہونے لگا تھا اتنے پھول تھے۔ بابا اب اچھے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے گوتم چاچا کو آنے کا لکھا تھا مگر انہوں نے جواب دیا۔ مایا چاچی بیمار ہیں، اور وہ نہ آسکیں گے۔"

بابا نے بہت دنوں بعد لکھا تھا۔

"بیٹے میں گوتم کے ہاں گیا تھا۔ مایا نے بیماری میں میری بہت خدمت کی تھی اور یوں بھی تمہاری وجہ سے ان کے ہم پر بڑے احسان ہیں۔ مایا بیمار نہیں لگتی۔ بس کھوئی کھوئی سی ہے۔ بات نہیں کرتی اور بولتی ہے تو چپ نہیں ہوتی یہ عجیب طرح کا دکھ ہے جو مایا سے زیادہ گوتم کو لگا ہے۔ اس کے گھر کی بنی بنائی زندگی برباد ہو رہی ہے۔ لگتا ہے درخت سوکھ رہا ہے پنچھی سہمے سہمے سے ہیں۔ میں دو دن رہا ہوں، گھر میں ایسی خاموشی سی اور اداسی رہتی ہے، جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ تمہارے ماما کے بیٹے پر بھوریا کا بیاہ بھی تمہارے ساتھ ہی ہوا ہے۔ وہ بہو بھی میری بہو کے ساتھ ہی آئی تھی۔ تم گیتا کو بلانے کا جلد کوئی بندوبست کرو۔ ہم اسے اداس ہونے تو نہیں دیتے۔ پھر بھی اس کی جگہ تمہارے پاس ہے۔ وہ کہتی تو نہیں مگر شدت سے اس دن کی راہ دیکھتی ہے جب کاغذات مکمل ہو کر آئیں، اور وہ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو۔"

"مایا بیمار ہے،" میں نے بابا کے خط کو پڑھ کر سوچا۔ پھر میں جانے کب سو گیا۔

میں نے دیکھا۔

رات ہولے ہولے بھیگتی جا رہی ہے۔ میں اور مایا اسی کمرے میں ہیں۔

اندر عجیب ملی جلی خوشبوئیں تھیں، پھولوں کی نئے کپڑوں کی مہندی کی بھاری سی گلے میں اٹکنے والی خوشبو۔ سینٹ کی مہک۔ میں اُٹھ کر کھڑکیاں کھولتا ہوں اور سرد ہوا کمرے کے بوجھل پن کے مقابلے میں بہت خوشگوار ہے بدن کو بھلی لگنے والی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جیسے باقی کچھ نہیں رہا۔ میں تاریکی کے اندر دل کی طرح دھڑک رہا ہوں۔ اگر بازو پھیلاؤں تو گرتا ہی جاؤں گا۔ رکوں گا نہیں۔ اس اندھیکار کی نہ کوئی تھاہ ہے نہ کوئی اور چھور۔ ایسی تنہائی ہے جس میں آدمی کا اپنا آپ پگھل جائے۔ دور باغ کے کونے میں رات کا پرندہ تیز آواز میں چلاتا ہوا اُڑا اور میرے قریب سے بولتا ہُوا گزر کر درخت کی گھنی شاخوں میں چھُپ گیا۔ پھر میں نے اوپر نظر کی آکاش تاروں سے بھرا تھا اور ان کی ٹھنڈی روشنی ہلکا ہلکا ملگجا سا اجالا پھیلا رہی تھی۔ تیز چمک والے تارے بڑے بڑے اور روشن لگ رہے تھے۔ کہکشاں سفید غبار کی طرح تھی۔ بالکنی کے اوپر سیاہی میں چمکتے ہوئے رلتے کی طرح پھر ذرا پرے کی پہاڑیوں میں گیدڑوں نے بولنا شروع کیا اور بہت شور مچانے لگے۔ پھولوں کے ایک نیچے سے پیڑ میں کوئل کو ہو کو ہو بولی۔ پھر بانسری کی صدا ہوا کے لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی آئی میرے پیچھے تاریکی میں ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی۔ میں اتھاہ تاریکی میں سے نکل آیا۔

مایا نے بڑی دلنوازی سے اپنا سر میرے کندھے پر رکھا۔ اس کے جسم میں سے تیز بُو نکل رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ لگایا تو اس کا گوشت میرے ہاتھوں میں لگ گیا جو نارکول کے رنگ کا تھا میں نے اسے دھویا چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بُو مجھے پاگل کئے دیتی تھی اور میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی مایا کی آنکھوں میں ہنسی تھی، مگر اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔"

جب جاگا ہوں تو پسینے سے تر تھا۔

کیا میں ہی تنہا مایا کی تباہی کا ذمہ دار ہوں؟

گوپال نے جو کہا ہے کہ وہ ذرا خُوش باش عورت ہوگی۔ تو کیا ساری خُوش باش عورتوں کا انت ایسا ہی ہوتا ہے؟

وہ اس ہون کنڈ میں جلتی ہی رہے گی کیا؟ کیا کوئی اور کبھی اسے اس اندھیرے سے نجات دلانے نہیں آیا؟ ہر عورت اسی طرح اپنی محبتوں اور کامیابیوں کے باوجود سائے کی طرح ڈھلتی ہے۔ پھر مایا نے کیوں اسے قبول نہیں کیا۔ کیا اب اس کے دوار پر میری طرح کا کوئی بھکاری نہیں آتا؟ وہ اپنی بیتی یادوں کے ساتھ اکیلی ہے، اپنے پُرانے وجود کا سایہ ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اسے کس طرح یوں اپنا آپ برباد کرنے کی اجازت دی؟ اس کا کچھ سوچتا ہُوا سراپا جس میں اس کی سیاہ آنکھیں ادھ کھلی کھڑکیوں کی طرح تھیں۔ شاید میں اس کی زندگی میں ایسے رُخ سے داخل ہُوا تھا کہ مجھے کبھی اس کی پُوری صورت دکھائی نہیں دی، اور یہ جو میں گزرے بیتے واقعات کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں سے اس کی شبیہ کو جوڑ رہا ہوں۔ جانے کتنا کامیاب ہوا ہوں؟ آخر میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی کندھے اُچکا کر کہتا ہے "میں کسی تباہی میں شریک نہیں تھا"

میں بھی کسی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ گو تم کسی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہے بھلا ہم کیسے اس اگن کنڈ کو جلا سکتے تھے؟

میری آنکھوں میں مایا کی کچھ سوچتی ہوئی صورت گھومتی ہے۔ آگ کے شعلوں کے ساتھ لپکتی ہوئی ہولے ہولے بجھتی ہوئی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی راکھ میں چنگاری کی طرح دبی دبی سی!

لہو رنگ

ہولی کھیلوری رادھے سنبھال کے

ہولی کھیلوری کھیلوری ہولی کھیلوری رادھے سنبھال کے

گورے گالوں پہ لال رنگ ڈال کے ہولی کھیلوری رادھے سنبھال کے

کدم اس دُھن کو بار بار بجا رہی تھی مگر کوئی ایسا نوٹ تھا جو اس سے بج نہیں پا رہا تھا۔ جب اس نے پچاسویں بار اُس ایک نوٹ کو پکڑنے کی کوشش میں پھر غلط بجایا تو دوسری منزل کی کھڑکی میں سے سر نکال کر اس کی موسی تارا نے کہا:

"کیا مُصیبت ہے بی بی کہ تم اپنا لہو پانی کر رہی ہو۔ ذرا دم لے لو تو پھر ٹھیک سے بجانا!"

کدم نے تان پورہ پرے لڑھکا دیا اور نڈھال ہو کر تخت پر لیٹ گئی۔ دوسرے برآمدے میں سے اُس کے دادا نے کہا: "مُنیا، اگر بجا چکی ہو تو ذرا سا ایک پان ہمیں کھلا دو۔"

"بھگوان!" اُس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں "ذرا جینے کی فرصت نہیں ملتی"

پھر اُس نے پیروں میں سلیپر گھسیٹتے ہوتے اپنا دوپٹہ کندھوں پر ڈالا اور "اچھا دادا" کہتی ہوئی سرے کی میز کی طرف پلٹی جس پر پاندان رکھا تھا۔ ڈھکنا کھول کر اُس نے دیکھا کتھا سوکھا پڑا تھا، چونا ختم ہو چکا تھا اور سپاری کٹی نہیں تھی۔ جلدی جلدی سروتہ چلاتے ہوتے اس نے نوکر کو آواز دی "بالو ذرا سا لپک کر جانا۔ موسی سے کہنا ایک پان دیں۔"

بالو جو دادا کے کسی کام سے باہر جا رہا تھا پلٹ کر نہیں آیا اور تیز بھاگتے ہوتے اُس نے کہا "بی بی میں تو نکڑ کی دکان تک جا رہا ہوں!"

"اچھا بھائی کدم اپنا اپنا نصیب ہے۔" وہ ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ "بھلا میں کیوں نہیں بچا سکی، ساری شام غارت گئی۔ ساری شام جس میں اگر چاہتی تو اس ذلیل بارنرز میتھڈ کے کم از کم دو سوال تو حل کیے جا سکتے تھے۔ جس کسی نے بھی یہ طریقہ بنایا تھا نہایت بیہودہ اور لایعنی تھا، الجبرا یونہی لایعنی ہے۔ فضول بھلا "ہولی کھیلوری کھیلوری کھیلوری" میں کون سا کام دے سکتا ہے الجبرا۔ مجھے حساب بھی موسی نے دلوایا، کہہ رہی تھیں ذہن اس سے کھلتا ہے ذہانت بڑھتی ہے اور میری ذہانت کہاں بڑھی ہے اس سے میں تو اور ٹھس ہو گئی ہوں۔ ستار ماسٹر الگ ڈانٹتے ہیں کہ تم ریاض نہیں کرتی ہو، اگر پلٹے سیکھنے میں چھ ماہ لگا لیتی تو آج یوں ہر طرف سے پریشانی نہ ہوتی۔ یا کیا تھا اگر موسی سے صاف کہہ دیتی کہ میں حساب سیکھنا نہیں چاہتی۔"

تارا نے جو جانے کسی میٹنگ میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کمرے میں سے کہا، "کدم تم سب کام ایک ہی وقت میں کرنے کی کوشش کرتی ہو۔ زندگی کسی اصول سے گزرتی ہے مگر تم سب کام گڑبڑا دیتی ہو۔ ابھی تان پورا اور حساب دونوں کو جنون کی طرح اپنے پر سوار کر رکھا ہے۔ اگر تمھیں حساب سے ایسی ہی نفرت ہے تو چھوڑ دو۔ بی۔ اے میں ایک سال اور لگ جائے گا تو کیا ہو گا؟"

"یہ بات نہیں موسی۔" کدم نے پان پر چونا ذرا زیادہ ہی لگاتے ہوئے کہا "جب میں کوئی کام ٹھیک سے کر نہیں پاتی تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔"

"جینا تو یونہی پڑتا ہے کدم کہ آدمی اپنی مرضی سے کم از کم اس خیال کے مطابق جو اس کے جی میں ہوتا ہے کچھ نہیں کر پاتا مگر الجھنے سے تو اور بھی بگڑتی ہیں چیزیں۔"

تارا نے نہایت خوب صورت ساڑھی پہنی تھی اور بالوں میں ایک ننھی سی کلی لگائی تھی، جو کان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی کسی شریر بچے کی طرح لگ رہی تھی۔ پان کو چھوڑ کر کدم اس کی طرف دیکھنے لگی "موسی آج تو آپ بہت اچھی لگ

رہی ہیں۔"

"چلو ہٹو اب باتیں نہ بناؤ، دادا پان کی راہ دیکھ رہے ہوں گے، جاؤ فوراً۔"
تارا نے ساڑھی کا پلو سر پر جمایا اور کدم کے ساتھ سیڑھیاں اُترنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں موسی؟" کدم نے پھر پوچھا۔

"میٹنگ ہے رومیندر کے ہاں۔" تارا نے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں سمجھی آپ کسی پارٹی میں جا رہی ہیں۔" کدم نے تیزی سے برآمدے میں گھستے ہوئے کہا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ یوکلپٹس کے درختوں پر ایسی خاموشی تھی پتہ بھی تو نہیں ہل رہا تھا۔ جیسے پوجا میں مگن سادھو ہوں۔ اندھیرا اور روشنی دم سادھے آمنے سامنے کھڑے ہوں۔ کدم دادا کو پان دے کر پھر برآمدے میں آن کھڑی ہوئی۔ وہ آج صبح سے ہی عجیب اداسی کا شکار تھی۔ کلاس میں مس نے کہا تھا "جوان لوگ اُس وقت اُداس ہوتے ہیں جب اُن کے سامنے کوئی منزل نہ ہو۔"

"میری منزل کون سی ہے؟" کدم سوچ رہی تھی، کیا صرف میں ہی اُداس ہوں یا میری ساری نسل، ساری جوان نسل اداس ہے، بھلا ہماری منزل کونسی ہے؟
جب وہ ہائی سکول میں تھی تو کتنے چاؤ سے اِن دِنوں کی راہ دیکھا کرتی تھی، جب کالج میں جائے گی اس کے سپنوں میں کتنے رنگ برنگ چہرے آیا کرتے تھے۔ خوشی سے دمکتے ہوئے اور شوخ، اور موسی جب کبھی بیٹھتی تھیں تو اپنے قصے سنایا کرتی تھیں۔ کالج یونین پارٹیاں اور کام۔ کھیل کے میدانوں میں جیت کا ذکر اور وہ یہ کہانیاں سنتی کیسے کھو سی جاتی تھی۔ اس نے کتنی بے چینی سے برسوں راہ دیکھی تھی۔ بڑے بڑے ناموں والی کتابیں جن میں وہ سب کچھ تھا جس کا اُس نے خیال کیا تھا اور عجیب بات ہے اب اسے اپنے اِن سپنوں پر ہی اعتبار نہ تھا۔ اس کو کسی شے پر وشواش رہا ہی نہیں تھا۔ دوپہر جب وہ کالج کے باہر اپنے بابا کی راہ دیکھ رہی تھی اس نے لڑکیوں کو ایک کار میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ روز دیکھتی

تھی کہ نئی نئی کاریں آتی ہیں اور اُس کی اپنی ہم جماعتیں کیا کیا کرتی ہیں۔ مجھ سے کیا ! وہ مُنہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے کا بہانہ کرتی تھی۔ یہ موسی کی ہی صلاح تھی کہ وہ کسی لڑکیوں کے کالج میں داخل ہو اور لڑکیاں' ایک سال ہونے کو آیا تھا اور وہ اب تک کسی ایک کو بھی دوست نہیں بنا سکی تھی —— کتنی مغرور ہے کدم" اُس نے اکثر اپنے متعلق یہ سُنا تھا مگر وہ کیا کرسکتی تھی ؟ اسے کوئی بھی تو پسند نہیں تھی۔ جو بہت اچھے کپڑے پہنتی تھیں وہ روز نئی موٹروں میں لد کر اِدھر اُدھر جاتی تھیں۔ کئی لڑکیوں کے گروپ تھے اور کوئی دوسرا اس گروہ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ جو بہت امیر اور بڑے افسروں کی بیٹیاں تھیں وہ استانیوں کی دوستی کے لیے ان کو روز نت نئے تحفے دیتی تھیں۔ اُس نے اپنے کانوں سے سنا تھا کہ لیکچراروں اور ان لڑکیوں کے درمیان کیسی کیسی باتیں ہوتی تھیں، وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔ کدم نے سوچا "میں بہت زیادہ دکھتی اور زیادہ سُنتی ہوں" ایسی باتیں سننے کے بعد اس کا وشواس ہر شئے پر سے اُٹھ گیا تھا۔ رنگ برنگے آنچل لہراتے جیسے کسی فیشن پریڈ میں حصہ لینے لڑکیاں پہنچی ہوں۔ "میری آنکھوں میں جانے کیا گھس گیا ہے، ہر وُہ شئے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی آخر مجھے ہی کیوں دِکھتی ہے بھگوان۔ موسی کہتی ہیں" ہر آدمی کو اپنے خیال کا سایہ دکھائی دیتا ہے" کیا میں ہی ایسی ہوں۔ "مجھے وہ سب کچھ کیوں دکھائی نہیں پڑتا جو میں دیکھنا چاہتی ہوں ؟"

پھر برآمدے میں کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی اور "نمشکار صاحب" کہتے ہوئے ستار ماسٹر آن کر اس تخت پر بیٹھ گئے جس کے برابر میں تان پورہ رکھا تھا۔

"آ گئے ماسٹر صاحب !" دادا نے اٹکل سے اِدھر مُنہ کیا جِدھر ماسٹر صاحب روز بیٹھتے تھے۔

"بے چارے۔" کدم نے سر پر دوپٹہ جما کر تان پورہ سیدھا کیا۔ "اگر دادا کی آنکھیں بھی ٹھیک ہوتیں تو کیا تھا ؟" اس نے مَن ہی مَن میں سوچتے ہوئے

تاروں پر انگلیاں پھیریں، سنسناہٹ ہوئی پھر دہ شر بلنے لگی اور پوجا میں مگنے والے کی طرح کدم نے آنکھیں بند کر کے

ہولی کھیلوری کھیلوری کھیلوری

بجانا شروع کیا۔ وہ نوٹ جس سے اس کی آتمامیں گونج سی ہونے لگتی تھی جانے اب بھی کیوں اس کی انگلیوں اور تاروں میں سے پھسل گیا تھا۔ جھنجلا کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور تان پورہ ماسٹر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

خاموشی کے اس ذرا سے وقفے میں دادا نے کہا "ماسٹر صاحب، یہ شام سے ہلکان ہو رہی ہے اور جانے کیوں ٹھیک سے بج نہیں پا رہا۔"

ماسٹر صاحب پھر کھنکارے اور کہنے لگے "صاحب، بی بی بہت مصروف ہو گئی ہیں، اور تان پورہ بھی اتنی ہی توجہ چاہتا ہے جتنی کالج اور یہ اسے فالتو شے سمجھتی ہیں۔ اب دیکھ لیجئے جب سے یہ نئی جماعت میں گئی ہیں ان کی توجہ بٹ گئی ہے۔ رفتار پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ میں تو خود آپ سے کہنے والا تھا کہ اب مجھے اتنے وقت کے لیے چھٹی دے دیجئے۔ جب یہ کالج ختم کر لیں گی تو حاضر ہو جاؤں گا۔"

دادا بولے "ارے نہیں ماسٹر صاحب، کدم کو تو تان پورہ سیکھنے کا اتنا شوق تھا۔"

"اور کیا کروں صاحب۔ جس لگن سے یہ پہلے سیکھتی تھیں مجھے تو اس پر بڑا مان تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اب کے میوزک فیسٹیول میں ان کو بھی مقابلے میں بھیجیں گے مگر کالج نے تو مجھے بہت ہی نراش کر دیا ہے۔" ماسٹر صاحب تاروں پر انگلیاں پھیرتے ہوتے بولے، پھر انھوں نے بجایا "ہولی کھیلوری کھیلوری۔"

کدم نے سوچا "میں کون سا کالج سے نراش نہیں ہوں، پر جائے بنا چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

روشنیاں جلیں، شام رات میں بدلی اور تاروں کے جھرمٹ میں پہلی تاریخوں کا چاند سپنوں جیسی نیلاہٹ میں تیرنے لگا۔ باورچی خانوں میں برتنوں کی آوازیں

اندر کمروں میں گیتوں کی آوازوں میں بل ہوئی ایریل کے تاروں پر سے تیرتی ہوئی لگنے لگیں۔ برابر کے گھر میں لان پر بچوں کا شور اکتوبر کی اس نرم رات میں بہت سہانا معلوم دینے لگا۔

"راگھو نہیں آیا ابھی تک؟" دادا نے کہا۔

"نہیں ابھی تک بھیّا نہیں لوٹا۔ کیوں دادا کیا دوپہر میں بھی گھر نہیں آیا۔ میں تو کالج تھی نا۔" کدم نے دادا کی کمزور ٹانگوں پر کمبل برابر کیا۔ ایک دم چھن کی آواز آئی کمرے کا شیشہ ٹوٹا اور برابر کی دیوار پر سے کسی بچے نے جھانک کر پھر سے ڈبکی لگائی۔

"کیوں کیا بات ہے منّو، کیوں جھانک رہے ہو دیوار پر سے۔" تارا نے پورچ میں کھڑے ہو کر کہا۔ وہ میٹنگ سے لوٹ رہی تھی اور اس نے چھن کی آواز نہیں سُنی تھی۔ اُسے منّو کا موسی سے روز ڈانٹ کھانا اچھا نہیں لگتا تھا مگر وہ شریر بہت تھا چھوٹے سے لان میں جب دونوں بھائی کرکٹ کھیلتے تو بال اکثر دیوار پار، زور سے لگتا بہٹ سے اڑ کر اُن کے ہاں آجاتا۔ کبھی کسی آدمی کو چوٹ نہیں آئی مگر ہوتا یہی تھا کہ موسی بہت زور سے ڈانٹتیں۔ آدھ گھنٹہ لیکچر بازی کرتیں پھر بال لوٹایا جاتا، اس وعدے پر کہ پھر ایسا نہیں ہوگا مگر دوسرے دن پھر وہی کھیل دُہرایا جاتا۔ کدم کو یہ روز روز کا جھگڑا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُسے منّو کی آنکھوں میں وہ بھولا پن بہت پسند تھا جب موسی کے ڈانٹنے پر وہ سر جھکا کر کہتا "جی بہت اچھا۔"

"جی اب بالکل ایسا نہیں ہوگا۔"

"جی ہم ہرگز کرکٹ نہیں کھیلیں گے۔"

"جی آگے کو آپ بیشک ہماری گیند نہ لوٹائیں اگر ہم کھیلیں تو۔"

"جی اب کے میں بہت پکا وعدہ کرتا ہوں بس آپ گیند دے دیں میں اسے چھپا دوں گا۔"

موسی اچھے ہمسایوں کی خوبیوں کا ذکر کرتیں اور یہ سب کچھ ہزار بار دہرایا جاچکا تھا مگر اتنے وعدوں کے باوجود ہر دوسرے تیسرے یہ سین دیکھنے میں آتا۔

"آپ آ گئیں موسی؟" کدم نے مڑ کر اندھیرے سے روشنی میں آتی ہوئی تارا کو دیکھا۔

"جی ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔" تارا نے خوش دلی سے کہا۔ "کیا یہ منّو کی گیند پھر آئی ہے۔" اُس نے کدم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو یونہی جھانک رہا ہوگا۔" کدم نے گھبرا کر ٹوٹتے ہوئے شیشے کو دیکھا مگر گیند اندر کمرے میں جا چکی تھی اور موسی، دادا کے پاس پائنتی بیٹھی اپنی اُوٹ پٹانگ میٹنگ کا ذکر کر رہی تھیں۔ کیا ہونق صورتوں کے لوگ اُن میٹنگوں میں جمع ہوتے تھے لمبے بالوں والے جو بے تحاشا پائپ پیتے تھے گنجے سروں اور یہ بڑے بڑے شیشوں والی عینکیں لگائے خوفناک طریقے پر قہقہے لگا کر ہنسنے والے، ایسی مرجھائی صورتوں والے جو شکل سے بالکل استاد نہیں لگتے تھے۔ ایسے سجے سجائے ہوئے لوگ جن پر عورتوں کا گمان ہوتا تھا جو اپنے بالوں کو جمانے کی فکر میں ان پر بار بار ہاتھ پھیرتے یا جیب سے کنگھی نکال کر ہر گھڑی انھیں درست کرتے تھے۔ کھدر پوش جن کو اپنی غربت پر بڑا مان سا تھا۔ کم بولنے والے جو بولنے پر آتے تو بولتے ہی چلے جاتے۔ پھٹے حالوں میٹنگ میں آنے والے جن کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے۔ بے چین آنکھوں والے جن کی نگاہیں ہر پھر کر ساڑھیوں میں لپٹی بیبیوں کے گریبانوں سے نیچے پھسلتی تھیں۔ بیبیاں جو کم گو تھیں اور صرف سننے کی غرض سے آتی تھیں مگر اپنے پر پڑتی ہوئی نگاہوں کے تیور بھی پہچانتی تھیں جو بار بار پہلو بدلتی تھیں اور جن کی سمجھ میں شاید کچھ بھی نہیں آتا تھا کیوں کہ ان کے دل سینے میں بے طرح دھڑک رہے ہوتے تھے۔ کدم نے سوچا تارا موسی کی سمجھ میں تو بہت باتیں آتی تھیں اس لیے کہ وہ بے تکان بولتی تھیں اور اُن کو پلّو سنبھالنے کی کبھی جلدی نہ ہوتی تھی۔ اگر سر سے اترا تو کوئی بات نہیں اگر گر گیا ہے تو ان کی بلا سے۔ عجیب طرح کی تھیں اس کی موسی مگر اسے تارا سے بہت محبت تھی کہ ماں کے بعد اس نے اس گھر میں تارا ہی کو دیکھا تھا۔

کدم نے جی میں کہا "اب موسی کو کیا پتا چلے گا میں منّو کو گیند لاکر دے ہی دوں بے چارہ جھانک رہا ہے۔ تھک گیا ہوگا۔" کمرے میں گھسی ہے تو شیشے کا مرتبان ٹوٹا پڑا تھا اور مچھلیاں زمین پر تڑپ رہی تھیں۔ چمکتی ہوئی ذرا ذرا سی سانس کے لیے اور جینے کے لیے پریشان۔ وہ افسوس سے کھڑی اُن کو تکتی رہی۔

تارا کہہ رہی تھی "چاچا ہم لوگوں پر سب سے زیادہ ظلم ہوا ہے، استاد جو بنیو ہوتا ہے اس کو آج تک کسی نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی۔ چپڑاسی بھی اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔ چھوٹے سکولوں کے استادوں سے کالجوں میں کون سا ایسے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ ایک آدمی جو مقابلے کا امتحان دیتا ہے وہ کالج کے لکچرار سے بہت بہتر حالت میں ہوتا ہے بلکہ دھرتی اور آکاش کی سی دُوری ہو جاتی ہے اُن میں۔"

دادا نے کہا "یہ سدا سے ہوتا آیا ہے بیٹیا استاد کو تو بس لگن ہوتی ہے۔ استاد تو رشی ہونا چاہیے دنیا کو تیاگ کر سیوا کرنے کے خیال میں مگن۔"

"ایسی باتوں ہی سے لہو کھولنے لگتا ہے۔" تارا نے زور سے کہا "کیا صرف استاد ہی رہ گیا ہے کہ تیاگ اور سیوا اور لگن کے راہ پر چلے۔"

"پر بٹیا بھگوان نے سکھانے والے کو بنایا ہی ایسا ہے کہ اس کے جی میں آشناؤں کا ڈیرا نہیں ہوتا۔"

دادا نے گاؤ تکیے کے سہارے پہلو بدلا "کدم ایک پان تو دینا۔ بابو تو آیا ہی نہیں، جانے کہاں مر گیا ہے۔"

"کیوں چاچا، کیا سکھانے والے کو بھگوان نے آدمی کا روپ نہیں دیا ہے؟ کیا اس کے من میں کامنائیں نہیں ہیں؟ آپ کہاں سے لائیں گے ایسے استاد؟ کیا اوڑھنے پہننے سواری پر بیٹھنے اور جیون کے رنگ برنگ میں حصہ لینے کو ہمارا جی نہیں چاہتا۔ آپ جن زمانوں کی باتیں کر رہے ہیں وہ تو کبھی تھے ہی نہیں۔ بس یہ سپنوں کی سی باتیں ہیں یا منوسمرتی میں لکھے ہوئے اشلوک۔ آپ مُردہ اور بھلائے ہوئے اصولوں کو کیوں دنیا پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔"

"چلو مان لیا" دادا رسان سے بولے "مَیں تم سے بحث نہیں کر رہا۔ لگتا ہے آج میٹنگ میں تم کو بولنے کا موقع نہیں ملا اس لیے بہت خفا ہو"

"آپ تو بس یونہی کرتے ہیں، جب مَیں خوب تپ جاتی ہوں تو آپ سننے کی بجائے مجھے ٹال دیتے ہیں۔ آپ بھی تماشا دیکھتے ہیں چاچا" تارا نے کرسی کی پشت سے سر لگا کر دروازے میں کھڑی کدم کی طرف دیکھا "کیوں کدم پھر تم نے ٹھیک سے بجایا تھا؟ ماسٹر آئے تھے کیا؟ ارے بہت اچھی باس آرہی ہے، آج پکوایا کیا ہے تم نے؟"

کدم نے آگے آکر کرسی کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا "دادا جانیں بھی آرڈر دیتے ہیں۔ باس تو مجھے بھی بہت بھلی لگ رہی ہے۔ ماسٹر آئے تھے میں کہتی ہوں موسی اب مجھ سے دو دو کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ میتھس اتنا مشکل ہے کہ سارا وقت چاہتا ہے اور تان پورہ بھی پوری توجہ چاہتا ہے۔ ماسٹر کہتے ہیں کم از کم دو گھنٹے ریاض کرو۔ اب بتائیے نا مَیں گھرداری کروں، ریاض کروں یا میتھس کو وقت دوں؟"

تارا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر یہ تو اب تمھیں ہی فیصلہ کرنا ہے کہ دونوں میں سے کون سی شے تمھیں پیاری ہے، تان پورہ یا میتھس"

"یہی تو مجھے معلوم نہیں ہو پاتا موسی کہ مَیں کون سی راہ پر چلوں۔ اب درمیان میں آکر اگر حساب چھوڑ دوں تو آگے کے لیے کیا ہو؟ کوئی مضمون بھی تو ایسا نہیں جس پر محنت نہ کرنا پڑتی ہو" کدم بہت اداس ہو رہی تھی۔

ایسا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بی بی دھیرج اچھا ہے۔ دھیرج سے کام لو اور آدمی کو اتنے کام کرنے ہیں کہ جی کو ان چھوٹے چھوٹے دکھوں سے جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو فیصلہ کرنا ہے بس ایک دم سے کر لو، اسی دم" تارا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

کدم نے کہا "بابا سے تو پوچھ لوں وہ کیا کہتے ہیں؟"

"ہاں اب یہ اور بات ہے کہ جو کام صرف اپنی مرضی سے کرنے والا ہوتا اُسے

دوسروں پر چھوڑو۔ بھیا سے پوچھوگی، بابا سے پوچھوگی، منّو جنّو سے پوچھوگی، بابو سے پوچھوگی اور جانے کس کس سے۔" تارا نے ہنس کر کدم کو اپنی طرف کھینچا" دیکھو بی بی، یہ دیکھو جس چیز میں تمہارا فائدہ ہے، وہ کرو۔"

کدم نے کہا" بھلا میتھس مجھے کیا فائدہ دے گا، آپ نے بے کار میں دلوایا میرا تو شروع ہی سے دماغ اس طرف نہیں تھا۔ دو سال تو کسی نہ کسی طرح گھسیٹا ہے، اب مجھ سے نہیں چلتا۔ آپ نے کہا تھا کہ یہ دماغ کو کھولتا ہے مگر مجھے تو لگتا ہے میرے ذہن پر پہاڑ لاد دیا گیا ہے۔ بے کار کے لمبے لمبے ضرب تقسیم کے قاعدے مجھے کیا دے سکتے ہیں؟"

"تو تم نے دو سال پہلے یہ کہہ دیا ہوتا!" تارا خفا سی ہو گئی۔

"دو سال پہلے میری کون سنتا تھا، آپ نے جو کہا میں نے وہ کیا۔" کدم روہانسی ہو گئی۔

"ٹھیک کہتی ہو بی بی۔ میں نے تو اپنے حالوں جو کیا، تمہارے لیے بہتر کیا، اگر تمہاری ماں جیتی ہوتیں تو وہ بھی یہی کچھ کرتیں۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو، اپنا بھلا برا پہچانتی ہو، جو چاہو کرو۔" تارا نے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا۔

"ارے سنیے تو موسی! خفا ہو کر کہاں چلیں۔" راگھو نے برآمدے میں آکر اپنی ٹوپی میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

تارا نے گھوم کر کہا" اب تم جو سویرے کے گئے شام کو آن گھسے ہو، تم سے پوچھا جائے گا تو تم بھی ان بی بی کی طرح رونے لگو گے۔"

"واہ! آپ نے کیا سمجھا ہے مجھے، میں کوئی لڑکی ہوں جو رونے لگوں۔ آپ مجھ سے پوچھ کر تو دیکھیے۔ میں تو ایک ایک لمحے کو گرفت میں لا سکتا ہوں۔ اپنا ایک ایک قدم نرگن کر بتا دوں تو میرا نام راگھو نہیں۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر تارا کو سیڑھی سے نیچے گھسیٹ لیا۔

"اے واہ ہٹو، الّو کہیں کے، مجھے جانے دو۔" تارا نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"بھئی یہ اچھی رہی، خفا کسی سے ہو ہیں غصہ کسی پر نکال رہی ہیں۔ ارے اگر میں صبح کا گیا اب گھر آیا ہوں تو بہ اور بھی ضروری ہے کہ آپ مجھ سے کم از کم پوچھیں تو سہی کہ میں کہاں رہا ہوں، کہاں کہاں جھک مارتا پھرا ہوں۔" راگھو نے دادا کے برابر تارا کو بٹھلاتے ہوئے کہا۔

منّو نے دیوار پر سے جھانکا، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں روشنی میں اور بھی سیاہ اور بھی روشن لگیں۔ چونکہ تارا کی پیٹھ اس کی طرف تھی اس لیے اس نے کدم کو اشارہ کیا۔ کدم کو اچانک بڑے زور کی ہنسی آئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اپنی گیند مانگ رہا تھا۔

"اچھا تو اب تم ہماری باتوں پر ہنسنے لگی ہو۔ ہم جو یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اور ہم جماعتوں میں بڑے پردھان سمجھے جاتے ہیں۔" راگھو نے ایک چپت اس کے سر پر جمائی باہر سڑک پر سے کوئی راہ گیر گاتا ہوا گزرا، پھر موٹر رکنے کی آواز آئی۔ تارے اور زیادہ روشن اور قریب لگنے لگے، رسوئی میں سے چیتن نے کہا "کھانا لگا دوں، کیا بڑے صاحب آ گئے ہیں؟"

تارا نے کہا "اچھا بھئی تم لوگ کھانا کھاؤ، میں ذرا اوپر جا کر کپڑے بدل لوں، تھوڑا منہ دھوؤں۔"

"مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں گیا کہ میں کہاں رہا ہوں اور میرے پاس بتلانے کے لیے جانے کیا کیا ہے۔ آجکل یونیورسٹی تو بالکل تندور ہو رہی ہے ٹمپریچر اتنا بڑھ رہا ہے کہ بس اسے بند ہوا ہی سمجھو۔" راگھو نے اپنے حالوں بہت بڑی اطلاع دی۔

تارا کے پیچھے یہ اطلاع کچھ دور تک گئی پھر اس کے سینڈل کی کھٹ کھٹ میں ڈوب گئی۔ پھر شیام داس پانڈے گیراج میں موٹر بند کر کے بڑے تھکے قدموں سے اندر آئے۔ انھوں نے جھک کر اپنے باپ کے پاؤں چھوئے، بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چیتن سے کہنے لگے "کھانا لگاؤ بھئی بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"

راگھو نے اپنے کمرے سے نکل کر ہاتھ کے اشارے سے کدم سے پوچھا "بابا کہاں ہیں؟"

کدم نے ہاتھ سے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور رسوئی کی طرف بھاگی۔

"بابو! بابو!" اندر سے شیام داس پانڈے نے نوکر کو پکارا۔

دادا بولے "اسے میں نے کسی کام سے نکڑ والے دکاندار کے پاس بھیجا تھا۔ وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ اب آئے گا تو اسے ڈانٹوں گا مگر آئے بھی تو سہی۔"

تھوڑی دیر بعد شیام داس کھڑاویں پہنے، دھوتی باندھے، کرتے کی آستین اوپر کی طرف چڑھاتے، آکر باپ کے پاس بیٹھ گئے۔

"کیوں بیٹا پھر مزدوروں سے کوئی صلح کی گفتگو ہوئی ہے کہ نہیں؟" باپ نے بیٹے کی طرف گھوم کر اس سے پوچھا۔

"نہیں بابو! ابھی تک نہیں ہوئی اور نہ ہی اُمید ہے۔ اگر اس طرح سے دو دن اور ایسی حالت رہی تو سمجھئے کاروبار کی بدھیا بیٹھ جائے گی۔" شیام داس بدستور فکرمند تھے۔

"آدھے راہ تک جا کر ان سے ملو۔ میرا مطلب ہے کچھ باتیں مان لو اور کچھ چھوڑ دو۔ ایسے میں ضد کر کے اپنا سر دیوار سے پھوڑنے کے برابر ہے۔ جب ذرا حالات ٹھیک ہوں تو تم وہ رعایتیں دوبارہ واپس لے سکتے ہو۔ چڑھتی ندی کے مقابلے میں کون پار اُترا ہے؟"

"جو رعایتیں میں ان کو دوں گا ان کے واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر وہ تو ہر اُس شے کا مطالبہ کر رہے ہیں جو جائز بھی ہے اور ناجائز بھی" شیام داس اٹھتے ہوئے بولے۔

"چیتن!" انھوں نے رسوئیے کو آواز دی "باپو کے لیے اگر پرہیزی شوربہ پکا ہو تو وہ انھیں پہلے دے دو۔"

"لا رہی ہوں بابا" کدم نے ایک ہاتھ سے ٹرے تخت کے کونے پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے میز کو دادا کی طرف کیا۔

"کیسا عجیب وقت آگیا ہے۔ عجیب اور بے چین" دادا بڑبڑائے "بھلا

ہو سکتا تھا کہ جو مزدور اپنی روز کی روٹی کے لیے پریشان ہو وہ ہڑتال کر دے گے، اپنی روٹی کی پرواہ نہ کرے، اپنے بھوکے بچوں کو بھول جائے۔"

"بہت بدل گیا ہے دادا،" کدم نے ہولے سے کہا "لیں، شوربہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔"

"میں خود پی لوں گا، بیٹی تم جاؤ۔" پھر ذرا رُک کر بولے "بالو ابھی تک نہیں آیا کیا؟"

"آپ نے اس کو کہاں بھیجا تھا؟" کدم نے پیچ دادا کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ارے بٹیا نکڑ والے دکاندار کے پاس ایک اخبار آتا ہے، میں وہ اُس سے کبھی کبھار منگواتا ہوں، وہی بابو کے ہاتھ منگوایا ہے۔" یہ کہہ کر دادا شوربہ پینے لگے۔

"کون اخبار ہے بھلا؟" کدم نے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگ گئی ہو بٹیا؟"

"جی میں سوچ رہی تھی آخر آدمی کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ بڑھاپا اور کمزوری اور پھر آنکھوں میں روشنی نہ ہونا! بے کار میں آدمی اتنا بڑھتا اور چیزوں پر مان کرتا ہے۔ محنت کرتا ہے اور اپنی جان گھلاتا ہے، آدمی جانے کیوں سر ڈال کر چلتا ہی جاتا ہے۔ آگے ہی آگے اور ہر دن اسے پہلے سے زیادہ بے بس کر دیتا ہے۔ دادا، جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے کتنے کمزور ہو گئے ہیں پہلے عینک سے پڑھ لیتے تھے۔ پھر بابا نے علاج کروایا تو ذرا اچھا دیکھنے لگے، دو سال کے اندر اندر پھر یہ حالت ہو گئی اور اب آنکھوں کی روشنی جانے واپس آئے بھی کہ نہیں" اور اسے منو کی چمکتی روشن سیاہ بڑی بڑی آنکھیں یاد آئیں جو اپنی گیند کے لیے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔" ہائے اس بیچارے کی گیند تو میں نے واپس کی ہی نہیں اس نے بڑی محبت سے سوچا اگر منو اور چنو نہ ہوں تو شاید یہ رونق نہ ہو۔ ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں چلی آتی ہیں ورنہ گھر تو مرگھٹ لگنے لگے۔ اس کا جی ہر شے سے

بیزار تھا۔

شیام داس نے پکارا "کدم! اگر تم باپو کو کھلا کر فارغ ہو گئی ہو تو آؤ۔"

راگھو کمرے سے نکلا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف چلے۔

"آج کل بہت پُرجوش ہو، کیا بات ہے بھتیا؟" کدم نے اپنا پیچھے گھسٹتا آنچل برابر کیا۔

"ارے کچھ نہ پوچھو آجکل تو بس مزے ہی مزے ہیں لیکچر تو ہوتے ہوتے نہیں سارا دن دوڑ بھاگ کرتے گزر جاتا ہے بڑے راز کی باتیں ہیں لڑکیاں تو انھیں ہضم بھی نہیں کر سکتیں۔"

"واہ کیوں نہیں کر سکتیں۔ تم نے لڑکیوں کو کیا سمجھا ہے۔" کدم نے کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"بابا لڑکیوں کو سوائے فیشن کے اور کسی بات کا ہوش ہوتا ہے بھلا؟" راگھو نے پلیٹ اپنے آگے کر کے نیپکن کھول کر بچھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری یونیورسٹی میں اتنی بہت لڑکیاں ہیں تمھیں معلوم ہوگا بھئی میں پرانے زمانے کا آدمی ہوں اور پھر میری بیٹی تو بہت سادہ سی ہے بھولی بھالی۔" شیام پلیٹ پر جھکے کھانا کھاتے رہے۔

"آپ اپنے کو کس طرح پرانے زمانے کا آدمی سمجھتے ہیں بابا!" راگھو نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "زمانہ کسی کو پرانا نہیں رہنے دیتا۔ یہ ہڑتالوں، جلوسوں کانفرنسوں کا زمانہ ہے بابا۔ ہر کسی کو اس سے دو دو ہاتھ کرنا ہوتے ہیں۔"

"ایک طرح سے تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو بھتیا۔" کدم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

پھر تارا کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ آن کر کدم کے برابر بیٹھ گئی۔ "آپ کی فیکٹری میں ہڑتال کا کیا ہوا کاکا؟"

"ہوتا ہوا تا کیا، پریشان کر رہے ہیں۔" شیام داس نے مختصر سا جواب دیا۔

"ان کی مانگیں پوری کر دیجیے نا!" تارا نے بالوں میں اُڑسے پھول کو نکال

کر مٹھی میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی سی تھی۔ وہ یونہی بے خیالی میں کاکا کے سامنے چلی آئی تھی "بالوں میں پھول لگائے، جانے وہ کیا سمجھے ہوں؟ ہے بھگوان"

"تم سمجھتی ہو مانگیں پوری کرنا آسان ہے؟" شیام داس نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔

"کسی مانگ کو پورا کرنا مشکل ہوتا ہے مگر اس پر ہمدردی سے غور کرنا ہی پڑتا ہے۔" تارا نے پھول اپنی مٹھی میں مسل دیا۔

"اگر سب مزدور یہ چاہتے ہوں کہ ان کو رہنے کے لیے مکان دیے جائیں تو تمھارے خیال میں یہ صرف ہمدردی کے قابل بات ہے اور میرے پاس پرانی کہانیوں کے دیوتا ہیں یا جن کہ ان کی مدد سے پلک جھپکنے میں یہ مانگ پوری کردوں۔" وہ کھانا چھوڑ کر اب ذرا گرم ہو رہے تھے۔

"کاکا! اگر ہر مانگ کے متعلق اسی طرح سوچا جائے کہ ناجائز ہے اور پوری نہیں کی جا سکتی تو پھر تو مطالبہ کرنا ہی بے کار ہو جائے۔" تارا نے دھیرج سے کہا۔

"میں کہتا ہوں تم اس قدر زبردست لیفٹسٹ کب سے ہو گئی ہو؟" انھوں نے غور سے اسے دیکھا

"سچی بات کہنا اور بحث کرنا آپ کے نزدیک لیفٹسٹ ہونا ہے کیا؟" تارا نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "کاکا! آخر ہر کسی کو دنیا میں جینے اور آسودہ ہونے کا حق ہے!"

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ ہر سرپھرے کو جس نے اس کے لیے کام نہ کیا ہو اس آسائش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اپنا لہو پانی بنا کر دوسروں کو ملی ہے تو تم غلطی پر ہو۔" کاکا سخت برہم تھے۔

"اگر چند لوگوں کو بہت سی سہولتیں نہ ملیں تو وہ اتنا آگے نہیں بڑھ سکتے!" تارا اب بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

"واہ واہ بہن ڈیبیٹ کا سا مزہ ہے۔" راگھو نے کدم کے کہنی ماری۔

"چپ رہو بھیا۔ بابا اور موسی سخت بحث کے موڈ میں ہیں اور تم ہنس رہے ہو۔ کیا یہ باتیں سن کر تم کو وحشت نہیں ہوتی؟"

شیام داس اٹھتے ہوئے بولے "میں ذرا گھومنے جا رہا ہوں کدم، ہو سکتا ہے دیر میں لوٹوں۔ تم باپو کا پلنگ اگر وہ کہیں تو اندر ڈلوا دینا۔ اب ہوا میں خوب ٹھنڈک ہوتی ہے، انھیں اوڑھنے کے لیے بھی بھاری کپڑا دیا کرو۔" کرسی کو انھوں نے برابر کیا اور باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے کمرے میں تھوڑی دیر کو بڑی بوجھل خاموشی رہی۔ پھر راگھو ہنستے ہوئے بولا "موسی اب تو بڑے بڑوں سے ٹکر لینے لگی ہیں۔ لگتا ہے آپ کے یہاں ٹریننگ کیمپ ہوتے ہیں جہاں یہ سب کچھ سکھایا جاتا ہے۔"

"بہت زبان دراز ہوتے جاتے ہو راگھو۔ بھلا میں کا کا سے کیا ٹکر لوں گی۔ وہ بہت فکر مند تھے اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ انھیں کچھ تو کہوں جو بوجھ کو ذرا کم محسوس کرنے لگیں۔"

"چلیے موسی۔" کدم نے اٹھتے ہوئے کہا "بھیا جانے آجکل کون انٹ شنٹ کاموں میں لگا ہے کہ بس ہنستا ہی رہتا ہے۔ ہر شے کا مذاق اڑاتا ہے۔ سب آدمی اسے اپنے سے چھوٹے لگتے ہیں۔ اس کی سوچیں جانے کون آکاش کی ہیں کہ "دھرتی پر قدم ہی نہیں پڑتا اس کا۔"

"ہوں، تو من ہی من تم یہیں ماننے لگی ہو" راگھو نے بڑے غور سے سر اونچا کیا۔

"کون مانے گا تمھیں؟ میں! ارے میں تو تمھیں کبھی مانوں گی نہیں۔" کدم اور تارا فرینچ ونڈو کی راہ سے باہر نکل گئیں۔

اکتوبر کی ہوا لان کے درختوں میں گنگناتی پھرتی تھی اور کسی پھول کی میٹھی سی سوگند اس میں ملی تھی۔ کدم نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا "جانے کیسی اچھی باس ہے۔" تارا نے اپنی سوچ میں مگن کدم کی بات سنے بنا "ہوں" کہا۔

شیام داس نے کہا "دس بارہ سال پہلے یہ گھر خریدا تھا جس کو انھوں نے

ہزاروں روپے لگا کر ٹھیک ٹھاک کیا تھا۔ ٹھیک کرنے کا تو کیا تھا وہ تو اصل میں اپنے اس صحرائی محل کے لیے ترس رہے تھے جسے چھوڑ کر انھیں یہاں آنا پڑا تھا۔ پرانی کہانیوں کا سادہ گھر! سنگِ مرمر کی ایک بہت بڑی حویلی تھا۔ دور تک ریت کے ٹیلوں کے سوا وہاں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور سفید گھر جیسے کسی نے موتی چھپا رکھا ہو۔ نہر کی پٹڑی پر سے اتر کر کچی سڑک وہاں تک آتی تھی، پھر بہت بڑا باغ تھا جس میں ہر وہ شئے تھی جو اُس کے خیالوں میں سورگ میں ہو سکتی تھی۔ سپنوں کے اس دیس کو چھوڑنے پر انھوں نے اپنے پاؤں جس زمین پر بھی جمانے چاہے وہ ریت کا ڈھیر بن گئی اور ان کے گرد بہت دنوں تک کھنڈروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر شئے جسے وہ چھوتے سونا ہوتے ہوئے بھی ریت ہو جاتی۔ جس زمین پر بھی انھوں نے ہل چلایا اس کے نیچے پانی تھا۔ اپنے سارے ذریعے آزمانے کے بعد اس نے بجلی کے تاروں پر پلاسٹر چڑھانے کی ایک فیکٹری کوئی چالیس ہزار کی لاگت سے بنوائی۔ ادھر ادھر سے قرض لے انھوں نے دن رات کی محنت سے اُسے بنا ہی ڈالا اور پھر اس محل کے سپنے اس کی آنکھوں میں آن بسے۔ رُوپا اپنے حالوں خوش تھی۔ دھیرج سے بات کرنے والی اس دھان پان سی لڑکی نے شیام کے ساتھ بہت کچھ سہا تھا۔ راگھو کے بعد جب کُدم پیدا ہوئی ہے تو وہ سوچنے لگی بڑھاپے تک اب چَین ہی چَین ہے۔ پر کل کا بڑھاپا کس نے دیکھا ہے؟ شیام کی رگوں سے کسی نے سارا رس کھینچ لیا تھا۔ کُدم نے ہولے ہولے پاؤں چلنا سیکھا تو رُوپا کی بڑی سی تصویر کو دیکھ کر وہ موسی سے پوچھتی "یہ کون ہے؟"

"تم اِسے کیا پہچانوں گی مُنیا؟" وہ رُوپا کو یاد کر کے رو پڑتی۔

اور آج وہ دونوں برابر برابر اس لان پر ٹہل رہی تھیں۔ کُدم سوچتی تھی ماں ہوتی تو اُسے بھاگ بھاگ کر یوں ہر کام نہ کرنا پڑتا، پر ہوتی تو نا! وہ تو ایک ایسا سپنا تھی جو دھند کی طرح تھا، کچھ بھی تو سامنے نہ تھا۔ وہ ایک نرم گود میں لیٹی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں اور تبھی اُسے منّو کی آنکھیں پسند تھیں۔ دلوار

پر سے جھانکتی ہوئی، روشنی سے بھری ہوئی آنکھیں۔

بجلی چمکی، ہوا ذرا تیزی سے چلی، باس ذرا اور پاس اُڑ کر آئی۔ نیلے آکاش کی نیلاہٹ میں آنکھیں جھپکاتے تارے مدھم پڑنے لگے۔ کدُم نے کہا "موسی، لگتا ہے کہیں بارش ہوئی ہے۔ ٹھنڈ میں نمی بھی ہے۔ بھیگی بھیگی سی ہے ہوا۔ مَیں چلوں دادا تو ابھی تک کمرے میں نہیں گئے۔"

"اچھا تم چلو، مَیں ذرا سا ٹہل لوں۔" تارا دوسری طرف مڑ گئی اور کدُم اندر آ گئی "موسی، مَیں یہ کھڑکی بند کر لوں، آپ دوسری طرف سے آ جائیے گا۔"

اندر برآمدے میں بالو تھا اور دادا اُسے پھٹکار رہے تھے "دو گھنٹے میں کہاں سے لَوٹ کر آیا ہے؟ بتا، نہیں تو تیری مرمت کروں۔" وہ پلنگ سے نیچے ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔

"جی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ بس ذرا دکاندار کے گھر چلا گیا تھا۔" بالو ذرا بھی گھبرایا ہوا نہیں تھا۔

"پکّا بے شرم ہے۔" کدُم نے دادا کے قریب کھڑے ہو کر سوچا۔ "چلئے دادا میں آپ کو کمرے میں پہنچا دوں۔" اس نے نفرت سے بالو کی طرف دیکھا۔

"بی بی، اب میں یہ کام کرتا ہوں آپ آرام کریں۔" اس نے آگے بڑھ کر دادا کا ہاتھ اپنے کندھے پر دھرا اور بچوں کی طرح انہیں اٹھا کر پاؤں پر کھڑا کر دیا پھر انھیں قدم قدم چلاتا وہ کمرے کی طرف چلا۔

"تم کو بھیج کر میں بہت پچھتاتا ہوں اور گھر کے کئی کام نہیں ہو پاتے۔" وہ جاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"یوں چٹکیوں میں کیے لیتا ہوں مہاراج۔" بالو نے خالی ہاتھ سے چٹکی بجائی۔

کدُم نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ راگھو لمبے لمبے کاغذ نکال کر پڑھ رہا تھا اور اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا، صرف لیمپ کی روشنی کاغذوں پر پڑ رہی تھی۔ "سارا دن گنوا کر بھیا کو اب خیال آیا ہے کہ امتحان سر پر آ گئے ہیں!"

قدم دروازے دیکھتی پھر رہی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا، اُس کے بابا کا اور اُس کا۔
شیام اندر آئے تو ہَوا تیز ہو چکی تھی اور سائیں سائیں کے شور سے درختوں کو جھکا رہی تھی۔ برآمدے کے ساتھ چڑھائی بیلوں میں سے کئی گر گئی تھیں اور سڑک پر کے بگولے سڑے پتوں، چھلکوں اور کئی ناگوار انجانی باسیں اپنے ساتھ لاتے اور دیوار کو پھلانگ کر صحن میں چکر لگا رہے تھے۔
تارا نے اپنی کھڑکی کھول کر بال بکھرائے اور سر پیچھے ڈال کر کہنے لگی "بھگوان ان سے بھی تیز ہوائیں آج میرے مَن میں ہیں۔ بھگوان، تم میری رکھشا کرو۔ میں کن ہواؤں کے ساتھ کہاں اُڑی جا رہی ہوں؟ اوم شانتی شانتی شانتی!!"
"یہ میرے اندر گھنٹیاں سی کیوں بج رہی ہیں؟ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟"
ہَوا کے زور سے کھڑکی کے پٹ بجتے رہے۔ جیسے دو آتمائیں ملیں اور پھر بچھڑیں بچھڑیں اور پھر ملیں۔ تارا نے میز پر سے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سے سر اٹھایا اور آکاش کو دیکھا۔
"مَیں کتنے ڈھنگ سے چُپ چاپ جئے جا رہی تھی اور اب؟ مگر وہ سناٹا اس طوفان سے تو بہتر تھا جو اب میرے اندر ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چل پایا کہ میں کہاں گھومتی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے دیوتاؤں کی بہت سی شراب کسی نے زبردستی میرے گلے کے اندر انڈیل دی ہو۔ بھگوان! مجھ پر دیا کرو، مَیں پاگل ہونا نہیں چاہتی۔ بھگوان اس سے بڑا طوفان میرے اندر ہے۔ مَیں کس سے کہوں؟ میرے اپنے جی میں تو یہ سما نہیں پاتا، مَیں کس سے کہوں؟ تو ہی سُن! ہے رادھے کرشنا ہے دیوی ماں تو ہی سُن۔ اس نے بتی جلائے بنا اُٹھ کر طاق میں رکھی مورتی کے آگے ماتھا ٹیک دیا۔ مجھے اپنی شرن میں لے لو ماں۔ مَیں راہ بھولنا نہیں چاہتی۔ مجھ پر دیا کرو۔"
"تارا! یہ کھڑکی کیوں کھولے ہوئے ہو۔ شیام داس نے نیچے سے پکارا "تارا تارا ——!!"

"جی کا کا !"— وہ ایک دم ہوش میں آگئی۔ بال سمیٹ کر جوڑا باندھا، کھڑکی کے پٹ پکڑ کر اس نے باہر جھانکا۔ سیاہ بادل مانو کھڑکی کے سامنے جھکے ہوئے تھے اور اندر آیا ہی چاہتے تھے۔ موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ پڑ رہی تھیں، بیل کے پتوں پر گر رہی تھیں۔ بالکنی میں جلترنگ سا بج رہا تھا۔ وہاں پر اوندھائی ہوئی چلمچی پر پڑتے قطرے گونج سی کے ساتھ آجا رہے تھے۔ تارا نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا جلتا ہوا چہرہ اُوپر اٹھا دیا۔ بوندیں اس کی آنکھوں، ہونٹوں اور گالوں پر زور زور سے پڑیں جیسے بچپن میں ماں منہ دُھلایا کرتی تھی، پانی کے چھپکے دیتی تھی۔ جب کبھی آنکھوں میں مرچیں لگ جاتی تھیں یا کھیلتے میں ایک دوسرے پر ریت پھینکتے کھُل نہیں پاتی تھیں۔

"تارا تارا! ہوش میں آؤ۔" اس کے اندر سے کسی نے پکارا۔ "تمھارے بالوں میں اب سفیدی بکھرنے لگی ہے۔ تم کئی ذمہ داریاں سنبھالے ہو۔ کیا تم نے یہ جوگ اس لیے لیا تھا کہ آخر میں اس انجام کو پہنچو۔ تارا تارا!!" یہ پکار اسے بے حال کر گئی۔

نڈھال سی ہو کر وہ بستر پر لیٹ گئی اور طوفان میں ایک قطرے کی طرح اپنے کو بے بس محسوس کرنے لگی۔

"کدُم کو پتہ چلے گا تو کیا کہے گی؟ وہ بچّی تو ہے مگر بہت کچھ سمجھتی ہے۔ آج جب میں جا رہی تھی تو پان لگاتے لگاتے کیسے غور سے اس نے مجھے دیکھا تھا اور میرے گال یوں تپ گئے تھے۔" بے بسی سے اس نے تکیے پر سر اِدھر سے اُدھر پھیرا۔ "بالوں میں پھول؟ جانے کیوں مجھے ایسی باتیں سُوجھتی ہیں۔ بھلا اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مَیں بالوں میں پھول لگاؤں کہ نہیں۔ کاکا نے آج تک مجھے یوں دیکھا ہے کہ مَیں نے کبھی ڈھنگ کا کپڑا نہیں پہنا۔ اب وہ کیا کہتے ہوں گے بھلا۔"

"رُوپا کے بچے بھی تو میرے بچے ہیں۔ راگھو اور کدُم اور کسی ماں کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ وہ بچوں کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گننے لگے۔ اپنی الگ دُنیا بسائے

اپنے سپنے سجائے۔" اور جب اسے کوئی خیال آتے تو اس کے گال تپ جائیں۔

"مَیں نے کل کا لیکچر بھی تو تیار نہیں کیا"۔ پھر وہ اُٹھی جیسے برسوں کی بیمار ہو اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس نے تاریخ کھولی۔ کل اسے جہانگیر پر لیکچر دینا تھا۔ مغلِ اعظم اکبر کے بیٹے جہانگیر کی زندگی۔ اُس کے عشق، اُس کی موت پر، کیونکہ وہ اسی طرح پڑھایا کرتی تھی۔ پہلے اس نے جہانگیر کے عہد کی تمام جنگیں پڑھا دی تھیں اور اب اس کی ذاتی زندگی پر لیکچر دینا تھا۔ نورجہاں کی ایک چھوٹی سی تصویر جو اس نے بینک کے کسی کیلنڈر میں سے کاٹی تھی۔ اپنی ساری خوب صورتی، ساری شان اور پورے ٹھاٹھ کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ مغل شہزادیاں، جو صرف باغوں میں ٹہلتیں اور نادیدہ شہزادوں کے نام ہی سُن کر ان سے عشق کیا کرتی تھیں۔ وہ ایسے پھولوں کی طرح تھیں جو شیشے کی چھت کے نیچے کھِلتے اور مصنوعی روشنی اور ہوا میں پلتے ہیں۔ جنھیں سردی اور گرمی دونوں سے بچا کر رکھا جاتا ہے۔ وہ خود بھی تو ایسی راجکماری تھی جس کی زندگی کے تانے میں کوئی بانا نہیں بُنا گیا تھا اس لیے اس کی زندگی میں سب کچھ ڈھیلا تھا۔ وہ خود بھی تو چھوئی موئی کا پودا تھی جو کسی لمس کو برداشت نہیں کر پاتا۔

انارکلی کا واقعہ بس فرضی قصہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انارکلی شہزادی تو نہ تھی، ایک معمولی ناچنے والی تھی اور اسے وہ بڑے بڑے سپنے دیکھنے کا کیا حق پہنچتا تھا۔ پر سپنوں پر کسی کا اختیار کب ہوتا ہے؟ تارا! سپنے کوئی وقت دیکھتے ہیں، کوئی آدمی دیکھتے ہیں؟ سپنوں نے انارکلی کو تاکا تو وہ امر ہو گئی۔ پریم آدمی کو بھگوان بنا دیتا ہے اُسے اَن مِٹ بنا دیتا ہے مگر اَن مِٹ بننے کا یہ راستہ بہت ہی کٹھن ہے۔"

اسے اپنے یوں خیالوں میں کھو جانے پر پھر بڑی شرم آئی اور جلدی سے اس نے وہ بڑی نوٹ بُک کھول لی جو اُس کے یونیورسٹی کے سُنے لیکچروں کی تھی۔ ڈھونڈھ کر اُس نے صفحے پلٹے اور جہانگیر والا باب نکالا۔ بڑے بڑے سیاہ لفظوں میں لکھا ہوا نام، سفید صفحے پر لکیروں کے درمیان جیسے کالے موتیوں کی مالا ہو۔ تھوڑی دیر وہ پڑھتی رہی پھر لفظ اس کی آنکھوں کے سامنے دھبے بن گئے اور وہ اپنے سپنوں

میں کھو سی گئی۔ زور زور سے اس نے اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارے اور پھر وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اسے حیرت تھی بڑے باپ کا بڑا بیٹا، اکیلا بیٹا جس کے قدموں میں دولت کا دریا بہہ رہا ہو جس کی ایک نگاہ پر شہزادیاں اپنا آپ بھینٹ چڑھا دیں، وہ ایک داسی کے لیے اتنا اداس ہو؟ یہ جی کی لگن جانے کیا شئے ہے؟

بارش بنا رُکے پڑ رہی تھی۔ اُس نے لکچر کی کاپی بند کی۔ دیکھا جائے گا، صبح ابھی دُور ہے۔ یہ گزرے زمانوں کی باتیں ہیں، پرانے بیتے قصے ہیں۔ ہر زمانے میں یہی ہوتا آیا ہے۔ جنگیں، صلحیں، ذاتی جھیلے، اکیلے آدمی کی لڑائیاں، اس کی اداسیاں، سب کچھ سدا سے ہوتا آیا ہے، کوئی شئے بھی، کوئی جذبہ بھی، کوئی خیال بھی نیا نہیں ہے۔ دنیا کب سے ہے اور جانے کب تک رہے گی اور آدمی جانتے ہوئے بھی ہر شئے اس کے لیے پرانی ہے، یہ ساری کیفیتیں مختلف نفسوں پر اس سے پہلے گزر چکی ہیں، جانے ان میں کیا نیا پن پاتا ہے؟ وہ دُکھ جھیلتا ہے تو سوچتا ہے کہ وہی اکیلا دُکھ جھیل رہا ہے، اپنی چتا میں آپ جلتا ہے۔ تارا بستر پہ کروٹیں بدل رہی تھی پھر بجلی کا لہریہ یوں لگا جیسے کمرے میں گھس آیا ہو۔ اس کی آنکھیں کچھ دیکھ ہی نہ سکیں اس کے بعد کڑک کی دل ہلا دینے والی آواز سنائی دی اور اس کے بعد چیخوں کے جی مسلنے والے شور میں تارا بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اُتر گئی۔

سبھی لوگ باہر برآمدے میں نکلے ہوئے تھے۔ کدم تو اس سے چمٹ گئی۔

"موسی! جانے کیا ہو گیا ہے موسی!"

شیام داس جا در کرتے میں کھڑے کانپنے لگے تھے۔ راگھو اپنے نائٹ سوٹ میں ننگے پاؤں باہر کی طرف بھاگا جاتا تھا مگر اسے کسی نے بھی تو نہیں روکا۔ دادا کہہ رہے تھے "ارے کوئی مجھے بھی تو بتاؤ کیا ہوا ہے؟" کوئی ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ سب لوگ سناٹے میں گرفتار تھے۔ بارش دُھند کی طرح پھیلی تھی اور برآمدے سے آتی روشنی میں قطرے موتیوں کی مالاؤں کی طرح ٹوٹ کر گرنے لگتے تھے۔ بیلوں پر پھول سردی میں ٹھٹھرتے پتوں میں اپنا سر چھپانے کے لیے آسرا ڈھونڈھ رہے تھے۔

پرنالوں میں سے پانی آواز کے ساتھ گر رہا تھا جیسے آکاش دھرتی پر بہہ رہا ہو۔ سیاہ اور گمبھیر اور دُور دکھائی دینے والا آج قدموں میں ہو۔

جانے کتنے زمانوں کے بعد یوں لگا تھا۔ راگھو آتا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھ بغلوں میں دیے تھا اور اس دُھند میں سے آ کر برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھ گیا اور افسوس سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

شیام داس بولے "بھئی کچھ تو کہو کیا ہوا ہے؟ یوں لگتا ہے جیسے ہمارے آنگن میں بجلی گری ہو۔"

"دوسری کوٹھی کے کوارٹر ہمارا آنگن ہی تو ہیں۔" راگھو نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ارے کیا ہوا؟" تارا نے کدُم کو دھکا دے کر پرے ہٹاتے ہوئے کہا "کیا چیتن اور بابو کو کچھ ہو گیا ہے؟"

"برابر کی کوٹھی میں نوکروں کے کوارٹروں پر بجلی گری ہے۔" شیام داس نے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"ارے . . . " تارا بھاگتی ہوئی اس بارش میں غائب ہو گئی۔ پھر کدُم بھی اس کے پیچھے بھاگی اور سیڑھیوں پر شیام داس ذرا سا کانپتے ہوئے اندھیرے میں جھانکتے رہے۔ راگھو آہستہ خاموشی سے ان کے پاس بیٹھا تھا جیسے وہ کوئی سوتی ہو۔

چیتن اور بابو کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ملبہ ہٹا کر دیکھ رہے تھے کہ شاید اندر کوئی زندہ ہو۔ بچوں کی چیخیں برابر آ رہی تھیں۔ آس پاس کے نوکروں کی آوازیں صاف پہچانی جاتی تھیں۔ ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے، زور لگاتے چیختے ہوئے، جیسے رات کے اندھیرے میں شمشان بھومی جاگ اٹھی ہو۔

"بھئی تارا عجیب ہے کدُم کو بھی ساتھ لے گئی۔ ٹھنڈ ہے اور وہ کونسی ایسی طاقتور ہے۔ ابھی آن کر بیمار پڑ جائے گی اور میں پہلے کیا خوش ہوں۔ دنیا کی آبادی ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ گلیاں اور بازار، راتوں رات کسی جادو کے زور سے کھڑے ہو جاتے ہیں، جدھر نکلو مکان ہی مکان ہیں۔ اگر ایسی مصیبتیں نہ آئیں تو دنیا کم ہی نہ ہو۔"

پریشان ہوکر اب برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔

راگھو نے سر اٹھا کر بہت دکھی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ اب انھیں کیا کہہ سکتا تھا۔ پھر شور بڑھتا گیا، آوازیں اور قریب آتی گئیں۔

تارا نے اپنے بھیگے ہوئے پلو کو ہٹا کر مُنّے سے بچے کو تخت پر لٹا دیا جو بازو اور ٹانگیں ہلاتا انگوٹھا چوس رہا تھا اور بتی کو دیکھتا ہوا یوں کھل کھل کر ہنس کر اور ہمک کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کوئی چاند کو چھونے کی تمنا کر رہا ہو اور بجلی گرنے سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

"یہ کیا اٹھا لائی ہو تارا؟" شیام داس بہت بیزار دکھائی دیتے تھے۔

"کاکا..... !" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی اور راگھو کے پاس بیٹھ کر اس نے بھی اپنا سر اسی طرح بازوؤں کے حلقے میں دے لیا۔ سسکیوں سے اس کا سارا جسم ہل رہا تھا اور بھیگ کر چپکی ہوئی ساڑھی میں سے اس کے بازو اُٹھے ہوئے لگتے تھے جیسے بے کسی اور بے بسی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہو، جیسے بجلی اسی کے گھر پر گری ہو۔

کُدم نے تولیہ لا کر بچے کے کپڑے اتارے اور اسے پیٹ کر پھر تخت پر لٹا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔

شیام داس کہنے لگے "میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے تم یوں رونے لگو۔ ظاہر ہے اس بچے کے اور سگے بھی تو ہوں گے۔ تم اٹھا لائی ہو، پولیس آئے گی پوچھ گچھ ہو گی اور پھر وہ اس کے پیچھے ہمارے ہاں تک آئیں گے۔ تمھیں کیا پتہ ہے قانون کتنا ٹیڑھا ہوتا ہے!"

تارا نے سر اٹھائے بنا کہا "کاکا! قانون بھی تو آخر آدمیوں کو آدمی سمجھتا ہے۔"

"یہی تو بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ تم تو بس دل کے کہے چلنے والی جذباتی آدمی ہو جو من نے کہا کر گزریں۔ اب بھلا اس بچے کو یہاں لانے کی کیا تک تھی؟" شیام

اُن منے سے وہاں کھڑے تھے۔

"یہی ہوگا نا مجھے تھانے میں حاضری دینا پڑے گی"۔ تارا بیٹھے سے کھڑی ہوگئی اور لپیٹے ہوئے بچے کو لے کر لپک کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

بہت دنوں تک جلے ہوئے گھروں تک پولیس نے پھیرے کیے۔ مرنے والوں جلنے والوں کی تعداد لکھی، قانون کے مطابق جو کچھ ہونا تھا ہوا مگر اُس بچے کا کوئی وارث اسے لینے نہیں آیا۔ شیام داس نے کہا بھی کہ "دیکھو اسے کسی دھرم شالہ کو، کسی ہسپتال کو دیئے دیتے ہیں"۔ مگر تارا نہیں مانی۔

لاٹھی چارج ہوا اور یونیورسٹی بند ہوگئی۔ راگھو اُس شام گھر نہیں آیا۔ تارا اور کُدم بولائی بولائی سی پھر رہی تھیں۔ کئی دنوں سے تارا راگھو سے کہہ رہی تھی "بھگوان کے لیے کسی معاملے میں بھی آگے نہ ہونا!"

"تو آپ آگے ہوں گی کیا؟" راگھو نے ہنس کر کہا تھا۔ وہ کھانا کھا رہے تھے اور چہیتن کی کاریگری کی تعریف کر رہے تھے۔ چھوٹا سا آنند اپنے جھولے میں کھیل رہا تھا اور شیام داس بھی نخفا نہیں لگ رہے تھے۔ کُدم نے ستار ماسٹر کو چھٹی کر دی تھی اور وہ بھی ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

"موسی! اگر سب لڑکوں کو یہی کہا جائے کہ تم نہیں کوئی دوسرا آگے ہوگا تو کوئی بھی آگے نہ ہو۔ آپ تو جلوس میں سب سے آگے ہوتی ہیں، کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا؟"

"ہمارے جلوس میں کوئی شور نہیں ہوتا۔ ہم لوگ کوئی اودھم مچانے کے لیے نکلتے ہیں؟" تارا اپنی طرفداری میں بولیں۔

"استاد تو سارا شور جماعتوں میں مچا لیتے ہیں، ان بے چاروں کے پاس طاقت ہی کہاں رہ جاتی ہے۔" راگھو نے شرارت سے کہا۔

"تم یونیورسٹی میں پڑھتے ہو جو استادوں کے بنا نہیں چل سکتی اور پھر بھی

یوں باتیں کرتے ہو !" تارا نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔

"موسی ! اگر آپ چاہیں تو ہم استادوں کے بنا بھی یونیورسٹی چلا کر آپ کو دکھا دیں " راگھو نے جوش میں آکر سبزی کی تھالی پرے کھسکا دی اور جگ سے گلاس میں پانی اتنی تیزی سے انڈیلا کہ میز پر گر گیا۔

"دھیرج سے دھیرج سے بھیا !" کدم نے بہت افسوس سے میز کے کپڑے کو دیکھا جو تر بتر ہو گیا تھا۔

" تم سارا وقت گھرداری کرنے کا رُعب گانٹھتی رہتی ہو، میرا تو اس گھر سے جی بھر گیا ہے جس میں آدمی اپنی مرضی سے پانی بھی نہ پی سکے " اس نے خالی گلاس کو زور سے میز پر پٹخا۔

" جوش اور طاقت دکھانے کی جگہ یہ نہیں ہے راگھو " شیام داس نے ملائمیت سے کہا " اور کدم بہرحال تم سے بہت زیادہ کام کرتی ہے "

" لڑکیاں ہوتی کس لیے ہیں ؟ کیا یہ جلوس میں جائے گی۔ لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی ہے۔ گھرداری نہ کرے گی تو کیا کرے گی ؟" راگھو اٹھتے ہوئے بولا " میں ذرا اوپی ناتھ کے گھر تک جا رہا ہوں موسی "

" تم یہاں بیٹھو گے اور میری بات سنو گے " شیام داس نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے دانتوں میں خلال کیا اور اٹھتے ہوئے بولے " میرے ساتھ آؤ "

" اب آئے گی بھیا کی شامت " کدم نے خوش دلی سے کہا۔

" نہیں کدم، اب وقت آگیا ہے کہ راگھو سے بات کی جائے۔ مجھے تو یہ کچھ سمجھتا نہیں ہے۔ کاکا سے بھی بس واجبی ہی ڈرتا ہے۔ آج کل کی نسل کسی سے نہیں ڈرتی "

" پر موسی میں تو ڈرتی ہوں " کدم نے جیستن کو برتن پکڑاتے ہوئے کہا۔

" تمھاری بات اور ہے " تارا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

" میری بات کیوں اور ہے آپ نہیں سمجھتیں۔ آج کی لڑکیاں کیسی ہیں، مجھے تو لڑکیوں کے کالج سے نفرت ہونے لگی ہے، اندھیرے کونوں میں جمع ہوتی ہیں ،

چوری چوری ہنستی ہیں، خط بازی کرتی ہیں، پرائی موٹروں میں لد کر جاتی ہیں، لڑکوں سے مذاق کرتی ہیں، اشارے اور جانے کیا کیا۔ آپ بھی تو لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتی ہیں، کیا اس کالج میں کچھ فرق ہے؟"

"ہمارا کالج غریبوں کا کالج ہے۔ کدم وہاں کوئی موٹروں میں نہیں آتا۔ لڑکیاں غریب گھروں سے آتی ہیں اور ان کی زندگی کا مقصد پڑھنا ہوتا ہے، انھیں فیشن کے لیے کہاں سے پیسے ملیں گے؟ ہر کوئی لگن سے پڑھتا ہے۔ تمھیں پتہ ہے کہ اب کے ہمارے کالج کی لڑکی نے میوزک فیسٹول میں پہلا انعام لیا ہے۔ اسی کالج کی لڑکی نے بی۔ اے میں ٹاپ کیا ہے؟"

تارا جذباتی ہو رہی تھی مگر اس کی آواز میں محض قصّہ کہنے والے کی سی نرمی تھی۔ پھر آنند، رنے لگا اور بابو نے اس کے پالنے کی رسی کھینچ کر لوری گانا شروع کی۔

کدم کو یہ بات بڑی عجیب لگی کہ بابو آنند سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اب وہ دو دو گھنٹے کی غیر حاضری سے گھر نہیں آتا تھا، جہاں جاتا بھاگتا ہوا آتا۔ تارا نے پہلے چند دن تو اس کی بہت دیکھ بھال کی اب وہ بھی تقریباً اس کو بھول چکی تھی اور بابو آنند کو پال رہا تھا۔ سارا دن اسے اٹھائے اٹھائے گھومتا۔ کبھی پالنا دادا کے برابر میں کر دیتا اور دادا اس سے باتیں کرتے۔ اب وہ اُوں، آں کرتا تھا اور آواز دینے پر پیچھے مڑ کر گردن گھما کر دیکھتا تھا۔

دادا کہتے "اپنا اپنا نصیب ہے نا، اب اسے ہی دیکھو، کن ماں باپ کے ہاں اس نے جنم لیا اور اب یہاں پر ہے اور ہنستا ہے، اسے کیا پتا آنے والے وقت میں اس کے لیے کیا ہے:"

"موسی! کیا میں آپ کے کالج میں نہیں جا سکتی تھی؟" کدم نے کرسی پر بیٹھ کر میز پر کہنیاں ٹکا دیں اور چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں دھر لیا۔

تارا کو رُوپا بہت شدت سے یاد آئی۔ وہ بھی ایسی تھی، پسینے لپینے والی اور منّت سے بات کرنے والی۔ "نہیں مُنیا، میں تم سے ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں اس کالج

کی پڑھنے والی لڑکیوں کا غریب ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی کے دل میں دوسرے کو دیکھ کر حسرت نہ ہو۔ کسی کو اپنے پرایوں ہی مان نہ ہو۔" تارا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ عجیب بات نہیں ہے موسی، جو کوئی بھی اس کالج سے پڑھ کر نکلتی ہوگی لوگ اس کی سوشل حالت پہلے سے جانتے ہوں گے اور آج کل غریب ہونا تو گالی کے موافق ہے۔" کدم بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم اوی ناش کے ہاں جاؤ گے کیا؟" تارا نے لان پر ٹہلتے ہوئے پاس آ کر راگھو سے بات کی۔ راگھو کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے باہر جا رہا تھا۔

"جی ہاں جا رہا ہوں آپ کی اطلاع کے لیے۔" راگھو نے اپنی رفتار اور بڑھائی اور تقریباً دوڑتے ہوئے کہا۔

"بھیا کو بابا سے ڈانٹ پڑی ہوگی۔" کدم نے ایک پھول توڑ کر تارا کے بالوں میں لگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں کدم میرے بالوں میں پھول نہیں لگاؤ۔" تارا نے دُور ہٹتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "کاکا اور راگھو آمنے سامنے دو کناروں پر کھڑے ہیں۔ کاکا تو اِن باتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جو وہ سوچتا ہے۔"

"پر موسی! اُس دن آپ میٹنگ پر تو پھول لگا کر گئی تھیں۔" کدم نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"میری ایک بھُول وہ بھی تھی۔" تارا کا دل سینے میں کانپ گیا۔ اسے وہ نگاہیں یاد آئیں، وہ نگاہیں جن کو اپنے پر محسوس کر کے اُس کا جی ڈوب جاتا تھا۔

"واہ مجھے تو اُس دن بہت اچھا لگا تھا۔ میرا تو جی بہت خوش ہوا تھا۔ موسی! مجھے تو سوگندھ سے عشق ہے۔ آپ بالوں میں پھول لگایا کریں۔"

اُس نے بھی تو یہی کہا تھا۔ "تارا تمھارے بالوں میں پھول ہوں تو کتنی اچھی لگو۔" وہ دونوں آنے والی کسی میٹنگ کا ایجنڈا بنا رہے تھے۔ سارے ساتھی ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ میٹنگ بہت لمبی چلی تھی اور بہت تھکا دینے والی تھی۔ شام

بہت گہری ہو گئی تھی اور چند لوگ ذرا پرے ایک میز پر بیٹھے باتیں کرتے سگار پی رہے تھے۔ وہ اب بھی بحث میں جُتے تھے جیسے باتوں سے ان کا جی نہ بھرا ہو۔ تارا کی ایک ساتھی اس طرف جانے والے ایک صاحب کے ساتھ چلی گئی تھی اور اب وہ صرف اکیلی تھی۔ کدم نے گاڑی بھجوا دی تھی اور ڈرائیور ہال کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اتنی بہت سگریٹوں کا دھواں اب کھلے دروازوں سے بوتل میں سے نکل کر مجسم ہونے والے جن کی طرح ہولے ہولے باہر جا رہا تھا۔ کام کرتے کرتے اچانک وہ ذرا سا جھکا اور کہنے لگا۔" مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں"۔

"اچھا —— !" اس نے رجسٹر سے نگاہیں اٹھا کر ہنس کر اس کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں میں جو کچھ تھا اسے سمجھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس کے اندر بڑے زور سے دھڑکا ہوا، پھر کانپا اور پھر اس نے فوراً اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ اسے اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا لگا۔ قلم رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور اس سے پہلے کہ کوئی بات ہو پرس اٹھا کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ بحث میں جُتے لوگوں نے سمجھا ہوگا وہ اپنا کام ختم کر آئی ہے

پورا ہفتہ کہیں بھی تو ان کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ جب بھی فون آیا ہے بابو کہتا "بڑی بی بی کوئی صاحب ہیں کیدار، آپ کو بُلا رہے ہیں"۔

"ارے میں کام میں مشغول ہوں بھائی، اُن سے کہہ دو کبھی روز پھر فون کر لیں"

اس کے گال تپ جاتے اور کوئی شے دل کی طرف چلنے لگتی۔ وہ کھڑے سے بیٹھ جاتی اور ہانپنے لگتی جیسے کوئی لمبا سفر طے کر کے آئی ہو، جیسے گھڑی ٹِک ٹِک، ٹِک ٹِک کیے جاتی ہے۔ اس کے خون میں ایک ہی نام بار بار رگوں میں چکر لگاتا، ایک ہی نام جسے وہ زبان پر لانا نہیں چاہتی تھی۔ اگلی میٹنگ کے لیے تیار ہو کر وہ بہت دیر تک اپنے کمرے میں تخت کے کنارے بیٹھی رہی۔ یہ اس کی سب سے خوبصورت ساڑھی تھی۔ ہلکے زرد رنگ کی، جیسے پھیکی چاندنی ہو۔ اُس روز اس نے کئی بار آئینہ میں اپنا آپ دیکھا "تو اچھا یہ میں ہوں، نیلن تارا میتی کرتارا" وہ زور سے ہنسی، بھلا عمر کے اس حصے میں بھی کوئی دیوانہ ہوتا ہے۔ اب کہ اس کے بالوں میں خاکستری رنگ

جھلکنے لگتا تھا اور چہرے کی ملائمیت میں ذرا بڑا پن آ گیا تھا۔ وہ الھڑ لڑکیوں کی سی
حرکتیں کر رہی تھی، کیوں بھلا؟ اس کے گال کیوں تپ رہے تھے، ہائے کیا اُلٹے
سیدھے خیالوں نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ کیدار کی آنکھیں اسے کمرے کے ہر کونے
میں سے گھورتی ہوئی لگیں۔ مسکرا کر وہ سب کچھ کہتی ہوئیں جو انھیں نہیں کہنا چاہیے تھا
"ارے!" —— گھبرا کر اس نے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کیا ریت
کی دیوار تھی کہ پانی کا ایک ریلہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ کیدار نے یہی تو کہا تھا "تارا بالوں
میں پھول لگا لو تو . . . " مگر وہ بہت کچھ کہتی ہوئی نگاہیں، بھگوان! بھگوان!! کیدار
اور وہ دونوں بڑے ذمہ دار لوگ تھے۔ وہ بال بچوں والا آدمی تھا اور ان کی ایسوسی ایشن
کا وائس پریذیڈنٹ۔ وہ سیکرٹری تھی اور کتنے لوگوں نے کس فخر اور اعتماد سے اُسے
چُنا تھا اور اب لوگ جان جائیں گے تو کتنے حیران ہوں گے۔ اس کے چہرے پر
خون کے تپ جانے سے جو لالی گھڑی گھڑی آ جاتی تھی وہ اسے پکڑوانے کو کافی تھی۔
"میں میٹنگ میں جاؤں ہی نہیں تو کیسا رہے؟" سوچتے سوچتے اس کی نظر کلاک پر
گئی۔ ابھی اسے کتنی دُور جانا تھا۔ وہ فوراً اٹھی۔ جب کُدم پان بنانے کے لیے اوپر آئی
ہے تو وہ کلیوں کو اپنے کان کے پیچھے اڑس کر جانے کے لیے فائلیں اور کاغذ سمیٹ
رہی تھی۔ اسے یک لخت اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہوا جو کام وہ کر رہے تھے
وہ تو اس سے، کیدار سے، سب سے، بہت عظیم تھا اور وہ سیڑھیاں اُتر گئی۔

میٹنگ کے لیے اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ لوگ ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے

"آپ پانچ منٹ دیر سے پہنچی ہیں" کیدار نے اسے کہا۔

جواب دیے بنا اس نے جلد جلد رجسٹر کھول کر پچھلی میٹنگ کی روداد والا صفحہ کھولا

سر پر پنکھا ہولے ہولے گھوم رہا تھا اور گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے
دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ کو دھتکارا اور جلدی سے کہا "معاف کیجیے گا مجھے ذرا
دیر ہو گئی۔ میں آپ کو پچھلی میٹنگ کی کارروائی سناتی ہوں۔" پھر اُس کی پُراعتماد
آواز اونچی ہونے لگی۔ لوگ توجہ سے سنتے رہے اور اُسے نئی تارا بھول گئی جس کے

بالوں میں کان کے پیچھے کلی اڑسی ہوئی تھی اور جس نے چاندنی کے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

کچھ لوگ فوراً ایکشن لینے کے حق میں تھے اور کچھ نہیں۔ وہ خود دھیرج سے آگے بڑھنا چاہتی تھی، صرف علامتی ہڑتال کے حق میں تھی۔ سب لوگ سیاہ پٹیاں باندھیں اور جماعتوں میں بدستور پڑھائیں۔ کیدار چاہتا تھا ایک دم پورے صوبے میں چھوٹے بڑے سکولوں، کالجوں کے سب اساتذہ کام کرنا بند کر دیں اور کلاسوں میں نہیں جائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ وہ اور کیدار، کاکا اور راگھو کی طرح آمنے سامنے کھڑے ہیں وہ کیدار کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اصول ہر شے سے اونچا ہے۔

پھر جانے کیا ہوا، اس کی نگاہیں کیدار کی نگاہوں سے جا ملیں اور کانپ کر اس نے نگاہیں نیچی کیں اور لوگ باتیں کرتے رہے۔ زور شور سے جیسے چھت ہی تو اڑ جائے گی۔ وہ لاتعلق سی بے پرواہ سی وہاں ان سب کے ساتھ بیٹھی تھی جیسے ہڑتالوں اور ایسے سارے خوابوں کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ کیدار اپنی بات منوانے کے لیے جوش سے بول رہا تھا۔

"اگر ہم نے خود بھی ہڑتال کر دی تو ہم کل کو شاگردوں سے کیا کہہ سکیں گے؟" کسی نے کہا تھا۔

"ہمیں بھی جینے کا حق ہے ہم بھی عام انسانوں کی طرح ہیں؟" کیدار نے پلٹ کر اس بات کا جواب دیا۔ "ذرا سوچئے، آج تک ہم کتنا کاغذ صرف کر چکے ہیں، کتنے گھنٹے بحثوں میں الجھے ہیں اور نتیجہ کیا ہوا ہے؟ کسی نے کبھی غور سے ہماری درخواستیں بھی نہیں پڑھیں، مزدوروں کی انجمنیں تو اپنی بات منوا لیتی ہیں استادوں کی نہیں؟"

وہ بہت تلخ ہو رہا تھا۔

"پرائیویٹ کالجوں کے لیکچرار جنھیں بڑی سفارشوں سے بھاگ دوڑ کرنے کے بعد نوکری ملتی ہے، وہ کیا کریں؟" کسی نے پھر پوچھا۔

"اگر ان کو نوکری سے الگ کر دیا جائے اُن کی جگہ نئے استاد رکھ لیے جائیں تو

ایسوسی ایشن اُن کی بے کاری کا کیا حل ڈھونڈے گی ؟ پچھلی نشستوں سے اٹھ کر کسی نے ہاتھ کھڑا کر کے سوال کرنے کی اجازت طلب کی۔

کیدار نے کہا "یہ سوال البتہ ہے کہ جن کو نوکری سے کسی بہانے سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی مدد کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ ایسوسی ایشن کے پاس اپنا کوئی فنڈ نہیں تھا۔ وہ چائے پینے تک کی عیاشی تو کر نہیں سکتے تھے۔ دو دو گھنٹے بحث میں الجھے رہتے حلق سوکھ جاتے مگر سوائے پانی کے اور کوئی چیز انھیں مل نہ سکتی۔ عام میٹنگ میں جب حاضری بہت زیادہ ہوتی۔ وہ کوئی ہال کرائے پر لیتے اور چندہ کر کے مشکل سے اس کا کرایہ پورا کرتے۔ باہر سے جو لوگ آتے تھے وہ تیرے میرے گھر ٹھہرتے اور اپنے پلے سے کھانا کھاتے یا پھر ٹھہرانے والا بھائی چارے کے تحت مہمان نوازی بھی کرتا۔ لوگ کتنے دکھی تھے اور کتنے پُر اُمید۔ استادوں کی ایسوسی ایشن نے ان کے مُردہ دلوں میں زندگی دوڑا دی تھی اس نے جوش اور ولولے سے وہ اپنے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ورنہ استاد تو سب سے زیادہ اپنے سے لا پرواہ ہوتے ہیں۔ صدیوں سے ظلم سہتے ہوئے جن کو فریاد کرنے کا حق بھی نہیں پہنچتا اس ڈر سے کہ ان سے سیکھنے والے جس روشنی کی ان سے آس لگائے ہیں اس میں تھوڑا اندھیرا نہ مل جائے۔ استاد کی شخصیت اس کا وقار اس کی شان جو عام لوگوں سے اونچا اور اخلاقی بلندیوں سے بھی اونچا ہو کوئی یہ نہیں سوچتا کہ شخصیت بنانے کے لیے آخر اچھے کپڑوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ شان کے لیے آدمی کے اندر چیزوں کی تڑپ نہیں ہونی چاہیے اور جب بچے کو فیس کی ضرورت ہو اور گھر کے لیے کھانے کی تو آدمی ان سب مانگوں سے کیسے اونچا اٹھ سکتا ہے ؟ استاد بھی تو عام لوگ ہوتے ہیں جو ضرورت کے مارے یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں رشی منی بھی تو بھکشا لینے نکلتے تھے۔ اگر آدمی ضرورتوں سے اُوپر اٹھ سکتا ہو تو جنگلوں میں عبادت کرنے والے صرف ہوا پر جئیں اور پاٹھ شالاؤں میں روٹی کے بنا ہی جینے کے طریقے بتائے جائیں۔

سامنے سے اٹھ کر کسی نے منوسمرتی کے دسویں ادھیائے کے اشلوک پڑھنے

شروع کیے جس کا مطلب یہ تھا :

"برہمن مصیبت کے وقت چاروں طرف سے دان لیوے جس طرح یہ بات دھرم سے پیدا نہیں ہوئی کہ گنگا ندی کو دوش لگتا ہے۔"

پڑھانا یگیہ کرانا۔ نندا کے لائق آدمیوں سے دطن لینا۔ انھوں سے برہمن کو دوش نہیں ہوتا کیونکہ برہمن جل اور اگن کے برابر ہے۔

جو برہمن مصیبت کے وقت اِدھر اُدھر سے بھوجن کرتا ہے وہ پاپ سے آلودہ نہیں ہوتا جیسے آکاش کیچ میں بھی ہے مگر اس سے آلودہ نہیں ہوتا۔"

کیدار اپنا سر کھجا رہا تھا اور کبھی پنسل سے سامنے پڑے کاغذوں پر کچھ لکھنے لگتا تھا پھر اِدھر اُدھر دیکھتا۔ منوسمرتی کے اشلوک پڑھنے والا جو کسی اسکول میں استاد تھا اور غالباً باہر سے آیا ہوا تھا کسی طرح سے چُپ ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ آنکھیں بند کیے پوجا کرنے والے کی طرح ہاتھ جوڑے، وہ اونچی آواز میں پڑھتا جا رہا تھا، لگتا یوں تھا ہون کُنڈ میں سامگری ڈالنے کی کسر ہے اور سارے لوگ پُوجا کے سمے جمع ہوئے ہیں۔ بیبیاں آنکھوں میں مسکرا رہی تھیں اور لوگ اشارے کر رہے تھے پچھلی قطاروں میں بیٹھے اُٹھ کر دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا مصیبت ہے؟

کیدار پہلو بدل رہا تھا۔ تارا کو بالوں میں لگائے پھول کی باس اپنے گرد پھیلتی ہوئی لگ رہی تھی۔ بھگوان اُس نے کیسے بے خیالی میں ہی پھول لگا لیا تھا۔ مگر یہ بے خیالی کہاں تھی؟ آدمی کو اپنے جی کا بھی تو پتہ نہیں چلتا۔ آدمی اپنے آپ سے دھوکا کرتا ہے۔ یہ چاندی کے رنگ کی ساڑھی اور پھول، اس کا جی چاہتا تھا کیدار سدا ایسی ہی باتیں کرتا رہے اور وہ یوں ہی اس کی مانگیں پوری کرتی رہے۔ جانے کب سے چوری چوری کیدار کا خیال اس کے جی میں آن بسا تھا حالانکہ اس نے کب چاہا تھا کہ وہ ایسے جھمیلوں میں اُلجھے۔ جب وہ کسی کی محبت کا قصہ سنتی تو ہنستی تھی۔ یہ تو اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اُلجھنا اور گرنا۔ زمانوں سے اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اِن سب گراوٹوں سے اونچی ہے۔ کون ایسا ہے جو اس کے جی کو بھائے" پریم تو

ہے اس جگ میں کارن دُکھ کا۔" وہ آج تک اس دکھ سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔

پھر سردیوں کی ایک صبح کو گہرے نیلے آکاش تلے سبزے پر گھومتے اور ہوا کی نرمی کو اپنے بازوؤں پر محسوس کرتے اس کو جانے کیوں خیال آیا "کسی کو چاہنا کتنا اچھا لگے"۔ دلوں وہ بھولی رہی کہ اس نے ایسا سوچا تھا۔ کتنی ہی سوچیں مختلف وقتوں میں آدمی کے جی کو پریشان کرتی ہیں۔ بھلا آدمی ایک ایک سوچ کے پیچھے یوں دیوانہ ہونے لگتا ہے کیا؟

ایسوسی ایشن کے کاموں سے ہی اُسے کہاں فرصت تھی پھر تاریخ پڑھتے پڑھاتے جوشش میں آکر وہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتی۔ اس کی شاگردیں اسے بہت چاہتی تھیں وہ اپنا تن من لگا دیتی تھی۔ کتنی ہی لڑکیاں اور مضمون چھوڑ کر محض اس کی خاطر تاریخ پڑھنے لگی تھیں۔ تارا جان لگا دیتی تھی اس کا شوق محبت غرور اور جینے کا مقصد بس تاریخ پڑھانا تھا۔ وہ سب باتیں جو مذہب، روایت، سیاست تھیں جن سے تاریخ بنتی تھی اور اس زمانے کا ہی نہیں باقی زمانوں کا گزرے اور آنے والے کا شعور پیدا ہوتا تھا اس لیے تارا تقریباً ساری چیزیں ہی پڑھاتی تھی وہ تاریخ کو ادب کی طرح نہایت احترام سے نہایت ذمہ داری سے لڑکیوں تک پہنچاتی تھی۔

چپکے سے اس کی زندگی میں کیدار کا خیال آگیا جیسے بہار کی ہوا کا جھونکا پھولوں کو اڑا کر ایسی راہوں پر پھیلا دے جن پر کبھی پھول کھلے ہی نہ ہوں۔

کہتے ہیں ہرن اپنے اندر نافے سے پھوٹتی خوشبو سے پریشان ہوتا اور اپنے گرد چکر کاٹتا ہے، صحرا میں بھاگتا ہے، شاید اسے پتا چل جائے کہ یہ باس جو اسے گھیرے ہوئے ہے کہاں سے آتی ہے، کیوں آتی ہے اور اس کا پیچھا کیوں کرتی ہے؟

تارا کو بھی اس خوشبو نے گھائل کر دیا تھا۔ کیدار کو دیکھتے ہی اس کا دل الجھتا جیسے حلق میں آن اٹکا ہو۔ بہت دنوں اس نے اپنے آپ سے جنگ کی۔ وہ کوشش کرتی کہ کیدار کا نام اس کے ذہن میں نہ آئے مگر ہوتا یہ تھا کہ ہر دوسری گھڑی وہ

اس کے متعلق سوچ رہی ہوتی۔ دونوں اکثر ملتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتی بہت کم بات کرتی، لیے دیئے رہتی۔ اس سے پہلے اس نے کیدار سے بات کرنے میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی مگر اب وہ بھی کچھ کچھ سمجھ چلا تھا۔ اس کے انداز میں ایک محتاط سی شان چلی آئی تھی، اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ہوتی، جیسے وہ بہت خوش ہو اور اپنے سے بہت مطمئن بھی۔ کام کی باتوں کے علاوہ وہ اکثر بیٹھ کر گھر کی باتیں کرنے لگتے۔ اپنی ذاتی باتیں، جیسے وہ بہت کچھ چھپانے کے لیے یہ سب کر رہے ہوں۔ تارا نے کیدار کو شیام داس سے بھی ملوایا تھا اور بوڑھے چاچا سے بھی۔ کدم اور راگھو کو تو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ راگھو گھنٹوں اس سے بحث کرتا اور کہتا تھا "موسی! میں نے ایسا ذہین آدمی نہیں دیکھا۔ کس قدر صاف دماغ سے سوچتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ استاد کیوں بن گیا ہے؟"

"تمہارے نزدیک کند ذہن اور بے کار کے لوگوں کو استاد ہونا چاہیے۔" وہ خون کو اپنے گالوں پر چڑھتا محسوس کرتی۔

"میرا خیال ہے کیدار بابو اگر کسی اور محکمے میں ہوتے تو ملک کے لیے بہت بہتر تھا۔" راگھو اسے چھیڑتا "اور پھر اتنے ذہین آدمیوں کی اس پیشے میں کیا ضرورت ہے مجھے تو لگتا ہے کیدار بابو خود بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔"

"تجھے تو اپنے سوا سب کوئی ناخوش لگتے ہیں۔" وہ جل کر کہتی۔

کدم نے کہا "سچ موسی! کیدار بابو تو بالکل بھی ٹیچر نہیں لگتے۔"

"تو کیا لگتے ہیں آخر؟" تارا نے جھک کر دانت سے دھاگہ توڑتے ہوئے پوچھا وہ کسی بیاہ میں جانے کی تیاری کر رہی تھی اور کدم کے دوپٹے میں پھول ٹانک رہی تھی۔ عجیب دیوانہ سا خیال اس کے جی میں آیا "کیا ہوتا اگر کیدار اسے وداع کرانے آ سکتا۔"

اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا "بھلا پاگل ہونے میں کوئی کسر باقی تھی؟"

"کیا ہے موسی؟" کدم نے جلدی سے اس کے کندھے جھنجوڑ کر کہا۔

"کچھ نہیں! بس شدت کا درد اُٹھا ہے۔"

کون جانے دل میں یا سر میں۔

"رہنے دیجئے میں خود ہی ٹانک لوں گی پھول۔ مجھے تو بیاہ بھی زبردست فیشن پریڈ لگتے ہیں۔ ہر کوئی بہترین کپڑے پہن کر اکڑ کر چلتا ہے۔" اور وہ کھڑی ہو کر ذرا اکڑ کر چلنے لگی۔ تارا کو ہنسی آ گئی۔

"اومی ناش کو میں جانتی ہوں۔ وقت پڑے پر خود پیچھے ہو جاتا ہے۔ راگھو کو تو اتنا بھی ہوش نہیں کہ ڈھنگ سے اپنے کو چھپا ہی سکے۔ کم از کم اس دن تک جب کسی خاص کام سے اسے سامنے آنا ہی پڑے۔" تارا بے چین ہو گئی تھی۔

"میں کہتی ہوں موسی مزدوروں کے تو اپنے مطالبے ہیں، وہ تو روٹی کپڑا مانگتے ہیں۔ مکان چاہتے ہیں۔ مگر لڑکوں کو کیا چاہیے؟ کدم نے لان میں فوارے کے پاس جھک کر کہا۔

"کیا چاہیے؟" تارا نے اس کی بات کو دہرایا "بدامنی، بے چینی فضا ہی میں ہے بی بی ——"

"سارے دماغوں میں ایک ہی خیال کیوں سما جاتا ہے موسی؟" کدم نے پانی میں ہاتھ ڈال کر کنول کے چوڑے پتے کو پکڑنا چاہا جو چپ چاپ بہتی ناؤ کی طرح ہوا کے ساتھ ڈول رہا تھا۔

"رات کے سمے پانی میں ہاتھ کیوں ڈالتی ہو؟" تارا نے بہت نرمی سے کہا۔ اس کی آواز میں اتنی محبت تھی کہ کدم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اُٹھ کر تارا کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"موسی! کبھی کبھار آپ مجھے ماں کی طرح لگتی ہیں۔"

"چل ہٹ! تو نے رُوپا کو دیکھا ہی کہاں تھا۔ میں اور وہ تو دھرتی اور آکاش ہیں۔ وہ کتنی سبھل اور دھیرج والی تھی کہ مجھ میں دوسری بار جنم لے کر وہ باتیں پیدا نہیں

ہو سکیں" وہ جذباتی ہو رہی تھی "میں بولتی ہوں تو دوسرے گھر والے بھی سنائی دیتا ہے اور اس کی آواز ایسی تھی جیسے گھنگھرو گلے میں بج رہے ہوں۔ ایسی جھنکار اور ایسا سُر تھا اس کے بول میں اور وہ زور سے بول ہی نہ سکتی تھی۔" تارا چُپ ہو گئی۔

"اچھا، بھلا مجھ میں کچھ ایسا ہے جو ماں کی طرح کا ہو؟" کدم لان میں لگے لیمپ کی روشنی میں سیدھی کھڑی تھی اور بہت امید سے تارا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تیرے چہرے پر اس کی سی تو نہیں مگر ذرا کم موہنی ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ مانو ستارے کوٹ کر اُن میں بھر دیے ہوں۔ کبھی کبھار جب راگھو ہنستا ہے تو اس کی آنکھوں میں ویسی چمک ذرا دیر کو آجاتی ہے۔"

"آپ نے مجھے آج تک بتایا کیوں نہیں!" کدم اداس ہو گئی اس نے اپنے بازو ڈھیلے چھوڑ دیے اور نڈھال سی ہو کر پھر فوارے کے پاس بیٹھ گئی۔

"بھلا میں ماں کی طرح کیوں نہیں ہوں؟" کدم نے زور سے کہا۔

"کوئی کسی کی طرح کا نہیں ہوتا بی بی! اب مجھے دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے میں رُوپا کی بہن ہوں اور اپنی ماں کی بیٹی ہوں۔ میری ماں اپنے زمانے کی سندر تا تھی یوں لگتا تھا جیسے کانچ کی بنی ہوں۔ پانی ان کے گلے میں سے صاف دکھائی دیتا تھا" تارا نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"موسی! آپ نے مجھے پہلے بھی کئی بار بتایا ہے مگر مجھے اس بات پر کبھی وشواس نہیں آیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کوئی پانی پیئے اور اس کے حلق میں سے وہ جاتا دِکھے۔" کدم نے بحث کرنے والے کی طرح کہا۔

"تو رہنے دو، کون کہتا ہے کہ تم ہر بات جو میں کہوں اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لو۔"

کدم اور وہ دونوں چپ ہو گئیں، کدم سوچتی ہوئی اور تارا یونہی اپنے خیالوں میں۔ پھر مروا کے پیڑ میں حرکت ہونے لگی، شاخیں ہلیں پر پھڑپھڑانے کی آواز آئی۔ روشنی میں بہت سے پتے ایک ساتھ گرے، جیسے ستاروں کا غبار زمین پر بیٹھ رہا

ہو۔ دیر تک وہ پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی رہی پھر کوئی پرندہ چیخا، شاخیں اور زور سے ہلیں، پتّے زیادہ تیزی سے گرنے لگے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ دوسری کوٹھی میں لان پر سے رات کی رانی کی تیز مہک آئی، کوئی ٹرانسسٹر لیے لیے شاید برآمدے میں نکلا ہوگا۔

کانن بالا کی دل میں کسک جگانے اور یادوں کے جادو جگانے والی آواز

"تم من موہن تم سکھیں سنگ ہنس ہنس کھیلو جاگ
ہم برہن ہم تڑپ تڑپ کر کاٹیں رتیاں جاگ"

آئی۔ پھر آنند رویا اور بابو اپنی بنائی ہوئی لوری گا کر اُسے تھپکنے لگا۔ منّو کے کتّے نے کسی سائے پر بھونکنا شروع کیا اور پُونم کا چاند رشی کی سی بے نیازی کے ساتھ آکاش پر اپنے خیالوں میں مگن چلتا رہا۔ کدم نے گرم چادر کا پلو الٹ کر اپنے آپ کو لپیٹا، اور تارا نے کانپ کر سوچا "دنیا کی ٹھنڈک اور اکیلے پن میں کون مجھے اس طرح گرمی پہنچا سکتا ہے کون ایسا ہے جو مجھ سے کہے کہ تم دنیا کے مقابلے میں اکیلی نہیں ہو۔ ہم سارے دُکھ اور سارے سُکھ تمھارے ساتھ بھوگ رہے ہیں۔"

کیا تم نے مجھے پکارا ہے؟
شام آگئی ہے۔ محبت کے بھکاری کی طرح تھکن کے بازو میرے گرد لپٹے ہیں۔
کیا تم نے مجھے پکارا ہے؟

کوئی آواز اسے پکار رہی ہے، کس نے اسے پکارا ہے؟ کون اسے پکارے کیدار کیدار ــــ بھگوان! شاید کیدار کو اس لمحے کا پتہ ہی نہیں ہوگا کہ کون اسے پکار رہا ہے ــــ

"موسی! مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے آیئے اندر چلتے ہیں۔ آپ بھیّا کے لیے پریشان نہ ہوں۔"

تارا نے سوچا "اگر کدم کو پتہ چل جائے تو اسے کتنا رنج ہو کہ میں راگھو کے لیے نہیں اپنے لیے سوچ رہی ہوں۔ کتنی خود غرض ہوں کتنی بے حس ہوں۔"

جب وہ برآمدے میں گھسی ہیں تو شیام داس بھی باہر نکل آئے۔ تارا سیڑھیاں

پڑھنے کے لیے مرضی ہے تو انھوں نے کہا "تارا تم راگھو کو سمجھاؤ، یونیورسٹی میں جو ہنگامہ ہونے والا ہے اس میں حصہ نہ لے۔ اومی ناتھ اچھی شہرت کا لڑکا نہیں ہے اور وہ یونین کا صدر ہے۔"

"کاکا! جس طرح آپ ہوا کو چلنے سے نہیں روک سکتے اسی طرح سے آجکل کے بچوں کو اس کام سے نہیں روکا جا سکتا جس کا انھیں جنون ہو۔ مجھے بھی معلوم ہے مگر میں آپ کی طرح بے بس ہوں۔ وہ کسی کی بات سنے تو۔"

"ہمارے وقتوں میں تو پڑھنے والوں کو پڑھنے اور امتحانوں سے ہی فرصت نہیں ہوا کرتی تھی۔" شیام داس عینک کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے بولے "تعجب ہے آج کل کسی کو پڑھنے کی فرصت نہیں عجیب ہے۔" وہ کدم کے قریب آکر رُکے "کیوں بٹیا تم پڑھتی ہو کہ بھائی کی طرح ایسے ہی چکروں میں گرفتار ہو۔"

"نہیں بابا میں کسی چکر میں نہیں ہوں۔" کدم نے ہولے سے کہا۔

دُور کسی گھنٹے نے بجنا شروع کیا۔ کدم جی ہی جی انھیں گننے لگی، دس بج گئے تھے سردیوں کی اس چاندنی میں بھی آدھی رات لگ رہی تھی۔ سڑک پر سے کوئی راہگیر شاید کوئی سائیکل سوار سیٹی بجاتا ہوا گزرتا جا رہا تھا۔ اب ہوا چلنے لگی تھی اور سفید بادل فرا ذرا روئی کے گالوں کی طرح چاند کے آس پاس یوں گزر رہے تھے جیسے بہار کے خاتمے پر آک کی مائی بھولنیاں مکڑیوں کے گروہ کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی گزرتی ہیں۔ کدم نے کہا "بارش آنے والی ہے۔"

"بارش تو نہیں پر ذرا ٹھنڈ اور بڑھ جائے گی۔" شیام داس نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا ——

کدم نے باہر آنگن میں پھیلی چیزوں پر ایک نظر کی شاید کوئی ایسی ہو جو بھیگ کے خراب ہو جائے "ہائے یہ گھرداری"، وہ تخت پر اپنا آپ لپیٹ کر بیٹھ گئی اور کانپتی رہی۔

تارا نے بے چینی سے ایک بار پھر اس دروازے کی طرف دیکھا جس سے راگھو آنے والا تھا۔ کیسی مزے کی سردی تھی ہوا تھی بادل تھے اور ہڈیوں کا گودا تک جمانے والی ٹھنڈ

تھی۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا پھر کسی نے پیچھے سے اس کے جی میں کہا "کیدار — "
کوئی پرندہ پر پھڑپھڑاتا ہوا اوپر سے گزرا اور ایریل کے تاروں کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔

"کیدار! کیا تم نے مجھے پکارا ہے؟ کیدار، کیدار!" درختوں میں کوئی زور سے چیخا۔ تیز کرخت آواز، منحوس آواز جو صرف رات کو سنائی دیتی ہے۔

"موسی مجھے اس پرندے کی آواز سے ڈر لگتا ہے" کدم نے کانپ کر کہا۔

"بھائی یہ بھی دوسرے پرندوں کی طرح ہے اس سے ڈرنا کیسا؟ تم کالج میں پڑھ کر بھی وہمی ہی رہیں بڑی بوڑھیوں کی طرح" تارا نے اپنا وہم دور کرنے کے لیے اسے جھڑکا۔

بوجھل وقت بہت آہستہ گزر رہا تھا۔ پھر کہیں دور آدھے کا گھنٹہ بجا۔

شیام داس کہنے لگے "اب سونا چاہیے وہ آہی جائے گا بچہ تو نہیں ہے کہ ہم یوں اس کی راہ دیکھتے رہیں" تارا کچھ بولے بنا سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تھکن سے اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ کیدار، کیدار کیا تم نے مجھے پکارا ہے؟

گھٹائیں اکٹھا ہو رہی تھیں، کاجل کے رنگ کی۔

یہ روز روز جانے بادل کیوں جمع ہوتے ہیں، روشنی کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پونم کی چاندنی کو بھی انھوں نے چھپا لیا ہے جانے کیا ہونے والا ہے؟ کبھی بجلی گرتی ہے کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ ——— راگھو میں روپا کی کتنی جھلک تھی اور پھر بھی کچھ تھا جو ضدی، سخت اور اٹل تھا جیسے راکشش ہو اور اس کی یہی صورت تھی جس سے تارا کو ڈر تھا۔ بچپن میں بھی یہی ہوتا تھا ——— مہینوں ضد نہیں کی اور جب کسی دن ضد کرنے پر اترا ہے تو کسی کے بس میں ہی نہیں آتا تھا۔ کاکا ہیں، دادا ہیں سب میں اس ضد کی ذرا ذرا جھلک تھی۔ مگر راگھو تو بالزان سب کا نچوڑ تھا۔ آدمی میں ضد نہ ہو تو وہ لگن بھی نہیں ہوتی جس سے اس کی زندگی میں کامیابیاں آتی ہیں اور لگن جس کا دوسرا نام جیت ہے۔ لگن جو رام کو راون سے ٹکر لینے پر اکساتی ہے لگن جو ہر چڑھی کمان کو کھنچواتی ہے اور وہ سارے تیر اس سے نکلتے ہیں جو مچھلی کی آنکھ میں گھومتی ہوئی دبے کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ لگن جو راہوں کو سیدھا کرتی اور جنگلوں میں سے

اوگی کے پار جانے کا سبب بنتی ہے تو یوں ہے کہ راگھو میں لگن ذرا زیادہ ہی تھی شیام داس جانتے تھے کہ وہ اسے قابو میں نہیں رکھ سکتے اس لیے باپ بیٹے میں وہ دوستی کبھی نہیں ہوئی جو ہونا چاہیے تھی۔ وہ بھی مگن تھے اور اس سے کم ہی واسطہ رکھتے تھے۔ رُوپا کے مرنے کے بعد دور قریب کے سب رشتہ داروں نے کہا بھی کہ تارا بہن کے بچوں کو سنبھالے مگر تارا جسے ایک بار کاکا کہہ چکی تھی وہ اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر زندگی کا راستہ تو دیوتاؤں کے اشارے پر بدلتا اور بگڑتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اسی گھر میں اٹھ آئی تھی۔ کدم بہت چھوٹی تھی اور راگھو دس سال کا ہی ہوگا اور خود اس نے بھی تو ابھی ابھی کالج جانا شروع کیا تھا۔ ماں کے مرنے پر ذرا جو رویا ہو۔ یوں لاتعلق سے کھڑا رہا۔ جیسے کسی اور کی ارتھی ہو۔ ہر تیاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ چتا تک کو آگ دکھانے والوں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ گھس کر جیسے سائنس کا کوئی تجربہ دیکھ رہا ہو۔ لوگ حیران تھے۔ بڑے بوڑھے کہہ رہے تھے "بھگوان کیا انوکھا لڑکا ہے جیسے یہ اس کی اپنی ماں ہی نہ ہو۔" یہ نہیں کہ اسے رُوپا سے پیار نہیں تھا جب دیکھو اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ وہ بیمار پڑی ہے تو راتوں اس کے پاس سے ہلا تک نہیں۔ "بابا! آپ فکر نہ کریں، موسی! آپ بھی سو جائیں ہم جو جاگ رہے ہیں۔" وہ بے ہوش پڑی ماں کی دواؤں کو میز پر سجا کر لگاتے ہوئے یوں کہتا جیسے ان سب کا بڑا وہی ہو۔ رُوپا کی جب آنکھ کھلتی اور ہوش آتا تو کہتا "ماں تم پانی پیو گی؟ دیکھو کتنا اچھا میٹھا پانی ہے!" رُوپا کو اس دنیا کے سارے میٹھے پانی کے چشمے اور نرم ہوائیں تھپک کر سلانے والی خوشبو اور بے چین کرنے کی حد تک خوب صورت چاندنی بھی اپنے جادو میں گرفتار نہ کر سکی وہ تھی ہی ایسی کہ پیار کیے جانے کے لائق۔ اس کی اپنی ماں کو اس کی صورت تکتے رہنے کا کتنا شوق تھا ایسی جوانیاں کہاں رہی ہیں؟ موت ایسی ہی صورتوں کی تاک میں ہوتی ہے۔ شیام داس کی طبیعت میں اس کے بعد کون جھیلتا۔ ان کی آنکھ میں اپنا بیتا زمانہ تھا اور وہ دن کی روشنی میں بھی بس وہی گزری گھڑیوں کا سپنا دیکھتے تھے۔ ہر گھڑی، ہر آن ان کو بس اس پیچھے ہوتے صحرا کی لگن تھی۔ ان کے لیے ساری محبتیں اور

ساری دوستیاں وہی ایک خیال تھا، وہی خیال، سنگِ مرمر کا ایک محل ہو جس کے آنگنوں اور صحنوں میں فوارے ہوں اور جس کے پھاٹکوں پر دربان ہوں۔ وہ کم بات کرتے تھے مگر جب بات ہوتی تو وہاں سے شروع کرتے۔ راگھو اور کدم ان کی اس عادت سے بہت چڑھتے تھے۔ کیدار سے بھی جب جب شیام داس کی بات ہوتی ذکر وہیں سے چلا۔

ماں کے مرنے کے بعد راگھو میں ایک عجیب تبدیلی آئی جیسے آدمی بہت گھبرایا ہوا ہو اور ہنسی کے سہارے اپنے کو کھڑا کرنے، سنبھالنے کی کوشش کرے۔ وہ یا تو کتابوں میں لگا رہتا یا پھر بہن کو ستاتا۔ موسی کو تنگ کرتا اور دوستوں میں بیٹھ کر زور زور سے قہقہے لگاتا۔ نوکروں کے ساتھ گپ بازی کرتا۔ اگر کبھی کدم روتی یا رُوپا کی ماں اپنی بیٹی کو یاد کرتی تو کہتا "نانی! آخر ان باتوں میں رکھا کیا ہے؟ یوں روتی ہو جیسے تمھاری بیٹی کوئی انوکھی شے تھی اور اُسے مرنا نہیں چاہیے تھا۔ اب وہ واپس تو نہیں آسکتی بھلا تمھارے رونے سے کیا ہوگا؟"

"بھگوان، بھگوان تو دَیا کر۔" نانی اپنا سر تھام کر جواب دیتی۔

یوں لگتا تھا جیسے راگھو کو نہ سہاروں کی ضرورت ہے نہ محبت کی اور نہ کسی تعلق کی اور اسی لیے اسے باپ کی ہر گزری بیتی، کھوئی شے کو یاد کرنے اور بیتے دِنوں کا مسلسل ذکر کرتے رہنے کی عادت سے چڑ تھی۔ جب شیام داس بات شروع کرتے وہ اُٹھ کر کسی نہ کسی بہانے وہاں سے کھسک لیتا، وہ سوچتے تھے شاید ان ہی سے نفرت ہے۔ یوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔ راگھو کو اپنے گرد لوگوں کے اکٹھا ہونے سے بھی سخت چڑ تھی۔ وہ بیمار پڑتا تو کہتا "بس مجھے اکیلا رہنے دو میرا بخار اتر جائے گا، لوگ میرے پاس ہوں تو مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

ایک بار اسے ٹائیفائیڈ ہوگیا، دِنوں وہ بیمار رہا۔ بیماری لمبی ہوتی گئی۔ تارا اس کے چڑنے اور چیخنے کے باوجود اس کے پاس رہتی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا اُسے بہت احتیاط اور محبت سے تیمارداری کرنے والے کی ضرورت ہے۔ جانے کیا بات ہے بچّہ خود

تندرست ہونا نہیں چاہتا۔ وہ ڈاکٹروں کی ذرا مدد نہیں کر رہا۔ اسے ٹھیک ہونے کی ذرا برابر پرواہ نہیں اور اسی لیے تارا نے ان دنوں کالج سے چھٹی لے لی تھی۔ بہترین ڈاکٹروں اور سمندر پار سے منگوائی دواؤں کے باوجود اس کے ٹھیک ہونے کی رفتار تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر کسی وقت بخار ذرا کم ہوتا اور ہوش آتا تو بھی وہ آنکھیں بند کیے رہتا۔ تارا پکارنے چاہنے کے باوجود نہ پکارتی، جانے کیوں؟

گھنٹوں آنکھیں بند کیے وہ بلے جلے بنا پڑا رہتا۔ کسی شے کے لیے ضد نہ کرتا کبھی کوئی بلاتا نہیں تھا۔ شیام داس کے آنے پر البتہ آنکھیں کھولتا، ان کی بات کا جواب دیتا اور پھر آنکھیں کھلی رکھتا مگر اِدھر اُدھر نہ دیکھتا۔ کدم ان دنوں شاید چھ سال کی تھی۔ عمر کا یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب بچے سیانے ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ اگر اسے کہا جاتا کہ جا کر بھیّا سے بات کرو تو وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پلنگ تک آتی اور اسے آنکھیں بند کیے دیکھ کر واپس موسی کی گود میں جا گھستی۔ تارا کے امتحان قریب تھے اس لیے وہ اس کے پلنگ کے برابر میں کرسی بچھائے بیٹھی پڑھتی رہتی۔

ایک دن اس کی کتاب جانے کیسے کھو گئی۔ پڑھتے ہوئے اس نے وہاں ڈالی پھر ایک ایک جگہ ڈھونڈا، نہیں ملی اور اب اندھیرے میں راگھو کا انتظار کرتے اسے یاد آیا کیسے وہ میز کی درازوں میں دیکھنے لگی تھی۔ یہ کمرہ راگھو کا تھا اور اس میں سوائے پڑھنے کی میز اور چند کرسیوں کے کچھ نہیں تھا۔ ایک بڑے دراز کی پچھلی طرف جیسے اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھی ہو۔ ایک لکڑی کی ڈبیا تھی جو بچے پیسے جمع کرنے یا سکوں کو اکٹھا کرنے کے شوق میں رکھتے ہیں۔ "جانے اس میں کیا ہے" اسے پتہ نہیں تھا کہ راگھو کو بھی ایسے جنوں ہیں۔

"اوماں" روپا کی تصویر پر خشک پھول تھے اس کی اپنی بہن روپا۔ راگھو تو کبھی اس کو یاد بھی نہیں کرتا تھا۔

یہ راگھو کا راز تھا۔ تارا نے آج تک کبھی اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کا راز جانتی تھی۔

"میں نے تصویر اسی طرح کتابوں اور کاغذوں اور کھلونوں اور جانے کیا کیا الم غلم بھرے اس دراز میں اس لکڑی کی ڈبیا میں انہی پھولوں سے ڈھک کر رکھ دی تھی۔ بھلا میں راگھو کے دُکھ کو اس شدت سے کیسے محسوس کر سکتی ہوں۔ جوان ہوتا ہوا بچہ بڈھوں کی سی سمجھ اور دلیری سے اپنا راز چھپا کر رکھ سکتا ہے بھلا؟"

یہ دلیری نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کو یاد نہیں کرتا تھا۔ کسی کے سامنے اس کا نام نہیں لیتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کتنا کٹھور ہے اس دن سے تارا کو راگھو سے ایک عجیب طرح کی محبت ہو گئی۔ ایسا لگا جو دُکھیا کو دُکھیا سے ہوتا ہے۔ اس نے بھی تو اپنے بابا کو نہیں دیکھا تھا۔ بھگوان محبت کرنے کی طاقت بھی تو کسی کسی کو دیا کرتا ہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت!

دُور کسی گھڑیال نے بارہ بجائے۔ راگھو ابھی تک نہیں آیا اور راوی ناگش کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ جانے کاکا اب کیا سوچ رہے ہوں، وہ ضرور اپنے کمرے میں ٹہل رہے ہوں گے۔ موٹے اون کا ہاتھ سے بُنا کمبل جو اب پتلا ہو گیا تھا اوڑھے ہوئے، کھڑاویں پہنے وہ اپنے کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آجا رہے ہوں گے۔ جب وہ بہت پریشان ہوتے تو تیز تیز چلتے جیسے آندھی میں کسی بگولے کے اندر گھر گئے ہوں۔

بادلوں نے سارے آکاش کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہوا نہیں چل رہی تھی اور سردی اتنی کم تھی کہ دسمبر کی اس رات پر بہار کی رات کا گمان ہوتا تھا۔ ایسا سناٹا تھا جیسے طوفان سے پہلے ہو۔ رات جن آوازوں سے اور جن روشنیوں سے زندہ ہوتی ہے وہ بھی نہیں تھیں۔ درخت دم سادھے تھے۔ پتہ تک نہیں ہل رہا تھا۔ فوارے کے پانی گرنے کی ترل۔ ترل جو تارا کو اپنے کمرے میں دن کے وقت بھی سنائی دیتی ہے نہیں آرہی تھی شاید مالی نے فوارہ بند کر دیا تھا۔ آنند جو چونک کر کئی بار روتا ہے نہیں رویا تھا۔ تارا کا دم گھٹ رہا تھا۔

"ہے بھگوان! کیدار، کیدار۔ کیا تم نے مجھے پکارا ہے!"

جیسے ہوا اچانک پھولوں کی سوگند اور گیتوں کے ان کہے بولوں سے بھر جائے
جیسے سازوں کے پردے آپ ہی آپ بولنے لگیں۔ جیسے کوئی جانا بوجھا ہاتھ جس کے لمس
کو وہ آج تک نہیں پہنچ پائی، اندھیرے میں سے اس کی طرف بڑھ رہا ہو" جب دنیا
میں محبت ہے تو سناٹے اور طوفان اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں بھلا!" تارا نے جھک کر دیکھا
ماں کے ساتھ ہی پٹڑی پر کوئی آرہا تھا "شکر ہے بھگوان تیری دیا ہے۔" اس نے اندھیرے
میں طاق میں رکھی دیوی ماں کی مورتی کے آگے ماتھا ٹیک دیا۔

راگھو اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ وہ سیدھا اوپر آیا۔ ایک لمحے کو وہ بڑی ڈری جانے
کون ہو۔ راگھو تو کبھی یوں اوپر نہیں آتا۔ جانے کون ہے اتنا جانا پہچانا ہوا کون ہو؟
ایک لمحے میں اس کا دل ایک نام کو یاد کر کے دھڑکا، پھر اس نے اپنے سر کو زور سے
ہلا دیا "انہونی باتیں سوچتی ہو تم تارا۔ کیسے خواب دیکھتی ہو پگلی!"

"موسی جاگ رہی ہیں کیا؟" راگھو نے سیڑھیوں کے سرے پر کھڑے ہو کر پکارا۔
"تمہیں جب پتہ ہے کہ میں جاگ رہی ہوں اور میں ہی کیا تم سمجھتے ہو تمہارے
بابا اور تمہاری بہن سو رہے ہوں گے۔ پھر پوچھتے کیا ہو۔ کیا تمہارے دکھ دیئے بنا ہی
ہماری زندگی میں کافی دکھ نہیں ہیں۔" تارا نے دیوی کی مورتی والے طاقچے کے ساتھ کر
نکالی۔ وہ بتی جلانا نہیں چاہتی تھی۔

"موسی آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں، کیا آپ بات نہیں سنیں گی، دکھوں
کی کہانیاں پیچھے بھی ہو سکتی ہیں۔" وہ آگے بڑھ آیا۔

تارا نے بتی جلانا چاہی تو اس نے کہا "نہیں بتی نہیں جلائیں۔ مجھے بتائیں
جیت سدا اسی کی ہوتی ہے نا جو سیدھے راہ پر ہو۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ قالین پر آلتی پالتی مار کر
بیٹھ گئی۔ "آدھی رات ہے اور ایسے میں کس فلسفے کے چکر میں پڑ گئے ہو؟"

"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دیں۔" راگھو کی آواز میں سختی تھی۔

"نہیں یہ ضروری نہیں۔" تارا نے کہا "راہوں پر جیت اور ہار نہیں ہوتی۔ یہ تو

ان طریقوں پر منحصر ہے جو تم اس جیت کے لیے اختیار کرتے ہو۔ ہوسکتا ہے آدمی اپنے حالوں سیدھی راہ پر چلے اور پھر بھی کہیں پہنچے نہیں۔"

راگھو اور وہ دونوں تھوڑی دیر چپ رہے پھر تارا نے کہا "راگھو تم جوان آدمی ہو تم سے پوچھنے کا ادھیکار کسی کو بھی نہیں مگر ہم تمھارے لیے پریشان ہوتے ہیں۔ کچھ تو بتاؤ کیا کرنے والے ہو؟"

"آپ لوگوں کی پریشانی پر تو میرا اختیار نہیں اور نہ میں آپ کو پریشان ہونے سے روک سکتا ہوں، پر آپ سب اطمینان رکھیں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے لوگ مجھے "کل ناشی" کہیں، میں چوری نہیں کرتا، سمگلنگ نہیں کرتا، ڈاکہ نہیں ڈالتا، قتل کرنے والا نہیں ہوں۔ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں اچھے ذہین پڑھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہوں، استادوں کو مجھ سے بڑی امیدیں ہیں۔ سٹوڈنٹس کونسل کا جنرل سیکرٹری ہوں، اب آپ کو اطمینان ہو گیا بتایئے؟"

تارا نے کہا "عجیب لڑکے ہو، آدھی رات کے سمے پوچھتے ہو جیت ہار کی باتیں، راہوں کی باتیں اور جب میں نے پوچھا ہے کہ کیوں پوچھتے ہو تو تقریر کرنے لگے ہو۔"

"اچھا میں چلتا ہوں۔" راگھو نے کہا "اب نیند آرہی ہے۔" اور وہ بہت آواز سے سیڑھیاں اتر گیا۔

صبح، بادلوں کی وجہ سے عجیب اداسی لیے ہوئے تھی۔ تارا رات کو بہت دیر میں سوئی تھی، اٹھی ہے تو سر بھاری تھا۔ تیار ہو کر نیچے آئی، راگھو نہیں تھا۔ کدم نے کہا "بھیا تو سویرے ہی سے چلا گیا ہے ناشتہ کیے بنا۔"

شیام داس کہنے لگے "بہت وقت نکل گیا ہے، میں نے تو اس کا اتنا دلار کیا ہے کہ اب وہ میری بات ہی نہیں سنتا۔ رات اتنی دیر میں اوی ناش کے یہاں سے لوٹا تھا۔ تم سے کیا کہنے اوپر گیا تھا؟"

"کاکا، میری سمجھ میں کچھ آیا نہیں جو میں آپ کو بتا سکوں، بس انٹ شنٹ باتیں کرتا تھا، پوچھ رہا تھا سیدھے راہ پر چلنے سے کیا جیتنا ضروری ہے۔"

شیام داس کے ماتھے پر لکیریں اُبھریں مگر وہ بولے کچھ نہیں۔

کدم نے کہا "بھیا خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ بھلا آدھی رات کے وقت یہ بات کیا پوچھنے کی تھی؟ جب جی میں آتا ہے اُٹھتا ہے اور دیر تک اس کے کمرے کی بتی جلتی رہتی ہے۔ مجھ سے تو سنجیدگی سے کبھی بات کی نہیں اس نے۔ میں اس سے بہت چھوٹی بھی تو ہوں۔

شیام داس بولے "اس کے تو کوئی ایسے دوست بھی نہیں ہیں سوائے کبھی کبھا کے جب وہ ادی ناش کے ہاں جانے کے لیے کہتا ہے۔ اس کے متعلق میں نے سُنا ہے کہ وہ زمانوں سے یونیورسٹی میں ہے کبھی کسی ایم۔ اے میں اور کبھی کسی مضمون میں۔ سٹوڈنٹ اس کی بات سنتے ہیں۔ بڑے باپ کا بیٹا بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ماں باپ کا بھی چاہتا ہوگا کہ وہ نوکری کرے، کسی کام سے لگے مگر وہ پتا نہیں کس غرض سے کس پیسے سے وہاں پر ہے۔"

تارا نے کہا "ادی ناش سٹوڈنٹس کونسل کا صدر ہے اس کا یونیورسٹی میں بہت مان کیا جاتا ہے۔"

کدم نے کہا "بھیا بھی تو اس کونسل میں سیکرٹری یا جانے کیا ہے۔"

"یہ تو سب جوڑ توڑ کی بات ہے۔ الیکشن کے موقع پر جو ذرا تیز ہو وہ جیت جاتا ہے۔" شیام داس ناشتہ ختم کر کے اُٹھے۔

"نہیں کاکا ہمارا راگھو تیز ہونے کے ساتھ ساتھ سچائی کا ساتھ دینے والا ہے۔" تارا کو رات کی بات یاد تھی۔

خبریں ہوئیں، یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس ہنگامہ کر رہے تھے۔ انھوں نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر کے وائس چانسلر کو زبردستی اپنے مطالبات پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ پولیس پہنچی انھیں حکم دیا گیا کہ وہ چلے جائیں مگر انھوں نے کوئی بات سننے سے اور حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ ذمہ دار شہری تھے ذمہ دار گریجویٹ تھے ان کے ساتھ عام قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے یہ ان کی

توہین تھی اپنے زور اور اپنی پوزیشن کے بل پر انھوں نے پولیس کو وہاں سے نکل جانے کو کہا۔ وہ نعرے لگاتے رہے یہاں تک کہ ان پر آنسو گیس پھینکی گئی اور پھر لاٹھی چارج کیا گیا اور راگھو اُس رات گھر واپس نہیں آیا۔

شیام داس صبح کے گئے ابھی تک نہیں لوٹے تھے اور ان ہنگاموں کی خبر کے بعد مہلا کالج بھی سویرے ہی بند ہو گیا تھا۔ سارے کالجوں میں چھٹی ہو گئی تھی۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا اعلان کر دیا گیا۔ وہ دونوں کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔

تارا نے کیدار کو فون کیا تھا مگر اس کی بیوی نے کہا تھا کہ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اُن کا بڑا لڑکا یونیورسٹی میں تھا اور شاید وہ اس کے پیچھے گئے تھے۔

گھبرا کر تارا نے کئی لوگوں کو فون کیا۔ شیام داس تو فیکٹری میں بھی نہیں تھے۔ اُن کے جو ٹھکانے اسے معلوم تھے وہ سب جگہیں دیکھی جا چکی تھیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ یونیورسٹی کیمپس میں داخلہ بند تھا اور شہر میں پولیس گشت کر رہی تھی۔

"کیسی بے چارگی ہے عورت ہونا بھی کتنے گھاٹے کی بات ہے!" کُدم نے تارا سے کہا "موسی میں اگلے سال لڑکوں کے کالج میں جانا چاہتی ہوں۔"

"تم کو لڑکوں اور لڑکیوں کے کالجوں کی پڑی ہے اور میں سوچتی ہوں اب کیا ہوگا۔ کاکا اپنے طور کچھ نہ کچھ کرنے کا سوچ تو رہے ہوں گے مگر ہو سکتا ہے کچھ نہ کر پائیں۔" تارا بہت پریشان ہو رہی تھی۔

شام کی خبروں میں اعلان کیا گیا کہ یونیورسٹی بند کر دی گئی ہے چونکہ سٹوڈنٹ بہت باغی ہو گئے ہیں اس لیے انھیں ہوسٹل خالی کرنے کا حکم مِل گیا تھا۔ یہاں تک کہ جنھیں گرفتار کیا گیا اُن کا سامان بھی تلاشی کے بعد ان کے گھروں کو بھجوایا جا رہا تھا۔

رات گئے تک اور کوئی اعلان نہ ہوا۔ جانے راگھو زخمی تھا یا گرفتار کر لیا گیا تھا؟ پھر رات کا آخری اعلان ہوا۔ گرفتار ہونے والوں میں سے کچھ کے نام سنائے گئے۔ راگھو کا نام سُن کر تارا اور کُدم نے شکر کیا، کم از کم پتا تو چلا کہ کیا حالات تھے

وہ زخمی نہیں تھا۔ کدّم ناچتی ناچتی پھری "میرا بھیّا زندہ ہے۔ میرا بھیّا زندہ ہے"!
شیام داس گھر آئے تو یوں لگتا تھا سینکڑوں ہزاروں میل پیدل چل کر آئے ہوں۔ ساری زندگی یونہی گھومتے رہے ہوں۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور بالوں میں گرد تھی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا ہے تو تھوک نہیں نگل سکتے تھے، ہونٹوں پر سفیدی، بے رنگ چہرہ جیسے ایک ہی دن میں بوڑھے ہو گئے ہوں۔
دادا نے کہا "شیام بیٹے میرے پاس آؤ سارا دن کہاں کہاں گھومتے رہے ہو ——— ؟"
شیام داس تخت سے اُٹھے تو ان کی کمر سیدھی نہیں ہو رہی تھی۔ دادا نے انھیں گلے سے لگایا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کہنے لگے "راگھو کو قید کر لیا گیا ہے کیا ؟"
شیام داس کی آواز نہیں نکل رہی تھی، انھوں نے سر ہلایا جو دادا نہیں دیکھ سکے۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیوں بیٹے تو نے راگھو کو دیکھا ہے کیا ؟"
کدّم نے دادا سے کہا "میرا خیال ہے بابا بھیّا کو نہیں مل سکے ہوں گے کیوں بابا ؟" تارا نے پانی کا گلاس لا کر شیام کو دیا۔
کسی نے کھانا نہیں کھایا، وہ سب وہیں تخت کے گرد بیٹھے رہے۔ شیام داس کہنے لگے "آج رات یا کل کسی وقت تلاشی ہو گی۔ مجھے کہیں سے پتا چلا ہے کیدار کا بیٹا تو سخت زخمی ہوا ہے۔ میں ہسپتال میں اسے دیکھنے گیا تھا"
"کون ہسپتال میں ہے ؟" دادا نے پوچھا۔ وہ ایک دم فکر مند ہو گئے تھے۔
"کیدار کا بیٹا زخمی ہو گیا ہے" شیام داس نے باپ کو بتایا۔
"اچھا میں سمجھا راگھو کو کچھ ہو گیا ہے!" ان کی اندھی آنکھوں میں بڑی طمانیت تھی ——— !
تارا کو سخت الجھن ہوئی۔ چاچا کے نزدیک کیدار کے بیٹے کا زخمی ہو جانا کوئی بڑی بات ہی نہیں تھی پھر پنجرے میں بند پرندہ زور زور سے چیخا "کیدار، کیدار"
رات بوجھل پتھروں سے بھری ناؤ کی طرح ہولے ہولے ڈوبتی رہی۔

اگلے دن دفعہ ۱۴۴ کے باوجود کالجوں اور سکولوں کے طلبا نے جلوس نکالا۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا چکر چلا، گرفتاریاں ہوئیں۔ مزید گرفتاریاں، زخمی ہونے والوں کی گنتی، گم ہونے والوں کی گنتی۔ وہ جنھیں ٹرکوں میں بھر کر دور دراز علاقوں میں چھوڑ دیا گیا تھا ان کے اعداد و شمار، ہر طرف خوفزدہ چہرے، ہراساں لوگ پریشان پھرتے، کچھ ڈھونڈتے ہوئے ماں باپ۔ ہر شکل کو غور سے دیکھتی بکھرے بالوں والی، حیران آنکھوں والی عورتیں، یوں لگتا تھا جیسے دنیا بس اب ختم ہونے والی ہے۔ تیز سرد ہوا میں گھبرائے ہوئے لوگ، بادلوں کے گھیرے میں بند، ماہ و روشنی سے محروم آکاش ڈری سہمی ناچ کے چکروں میں گھومتی ہوئی دھرتی۔

دوپہر کے بعد پولیس کی گاڑی آن کرڑکی۔ آس پاس کی کوٹھیوں سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے جھانک کر دیکھتے رہے۔ انھوں نے اُوپر سے نیچے تک سارا گھر کھدیڑ کر رکھ دیا۔ ایک ایک کاغذ کا پرزہ، ایک ایک دراز، ہر دروازہ، فرش ٹھوک کر دیکھتے رہے۔ شیام داس لاتعلقی سے تازہ اخبار پڑھتے رہے جس میں سیاہ حاشیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی تھی کہ یونیورسٹی طلبا کی ایسوسی ایشن کو ہر کونسل کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ جب انھیں کوئی قابلِ اعتراض شے نہ ملی تو ان کے چہرے اداس ہو گئے، ایسے کتوں کی طرح جو شکار کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک کر ہانپتے ہوئے لوٹیں اور جن کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہوں اور جو دم دبائے ہوئے آن کر مالک کو اپنی ناکامی کی اطلاع دینے کی خاطر چپکے سے اس کے قدموں میں بیٹھ جائیں تلاشی لینے والوں کی گاڑی بھر بھر کر کے سٹارٹ ہوئی اور چلی گئی۔

راگھو کی کتابیں زمین پر بکھری تھیں اس کی الماریاں اس کے کپڑے بکس سارے کمرے میں طوفان آنے کے بعد کی سی بربادی تھی۔ میزوں کے دراز باہر نکلے ہوئے تھے اور لکڑی کا ڈبہ بھی کھلا پڑا تھا۔ تارا نے جھک کر دیکھا وہ خالی تھا۔ رُوپا کی تصویر کو تلاشی والے لے گئے تھے یہ سمجھ کر کہ شاید یونیورسٹی کی کسی لڑکی کی تصویر ہو اور شاید اس

تحریک سے اس کا بھی کوئی تعلق ہو۔ پاس ہی ایک ڈائری کھلی پڑی تھی جس کے صفحے کھڑکی میں سے آتی ہوئی ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ ہولے ہولے، جیسے کوئی پتنگا بتی کے قریب ہو کر پر جلا بیٹھے اور ان بے جان پروں کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے مرتے ہوئے اٹھنے کی آخری کوشش کرے۔ اب شام ہو چلی تھی اور بادلوں نے دن کا چہرہ چھپا لیا تھا۔ سارا گھر چپ اور ویران تھا۔ تارا نے ڈائری اٹھائی، اسے بند کیا، پھر جانے کیوں اسے کھولا اور کھڑکی میں جا کر اسے پڑھنے لگی "ماں کو میں نے سپنوں میں دیکھا ہے اُس نے کہا ہے بھلا فرمائش ہونے کی اور رونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تم سے دُور تو نہیں ہوں۔ اُس نے روز کی طرح میرے سر پر ہاتھ پھیرا ہے پھر بھلا میں کیوں روؤں ؟"

تارا نے جلد جلد ورق پلٹے۔ جانے کتنے سالوں سے جب سے رُوپا مری تھی، راگھو یہ ڈائری لکھ رہا تھا۔ ہر وہ رات، جب اس نے ماں کو سپنے میں دیکھا تھا، ہر وہ بات جو سپنے میں ماں نے اس سے کی تھی اس میں درج تھی۔ ایک جگہ لکھا تھا :

ماں نے کہا ہے "ہنسنا اور ہنستے رہنا، دُکھ کو سہنے کا بہت اچھا طریقہ ہے۔"

کئی صفحوں کے بعد ایک جگہ یوں لکھا تھا :

ماں نے کہا ہے "چاہے تم کتنا بھی روکو اور اس سے بچنے کی کوشش کرو، سچ کا پرکاش دنیا میں ضرور پھیلے گا۔ دھرتی کی کوکھ سے اگر دُکھ جنم لیتا ہے تو سُکھ بھی تو پیدا ہو سکتا ہے۔" پر ماں کہتی ہے "اِس تیج کے لیے تمھیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔"

ایک جگہ یوں تھا :

میں نے ماں سے پوچھا ہے ماں میں کیا کروں ؟ میں اور ماں مل کر ہنستے رہے جیسے شرارت کرنے کے بعد بچے ہنستے ہیں اور پھر اس نے ہاتھ ہلایا، میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا اُٹھ گیا۔ میں نے دیکھا ان کے درمیان جو وہاں اکٹھا ہو رہے ہیں میں بھی ہوں۔ یہ ہم کیا کر رہے ہیں ؟ میں نے پھر کر دیکھا، پر ماں کسی کام سے جا چکی تھی۔

"شکر ہے انھوں نے بے کار سمجھ کر اسے پھینک دیا ہے۔" راگھو کی ڈائری کو

تارانے بند کر دیا اور اندھیرے میں بیٹھ کر چیزیں سمیٹنے لگی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ راگھو اس کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ اس نے ہی تقریباً اسے پالا تھا، وہ اس کی موسی تھی اور سوچتی تھی کہ وہ اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ اس کے خیالات کے دھارے کو، اس کی آنکھوں میں جاگتی سوچوں کو، اس کے ماتھے پر ابھری سوچتی لکیروں تک کو۔ اس کی خوشیاں، اس کی عادتیں، اس کی برائیاں، اس کی پسند ناپسند سبھی سمجھتی ہے اور راگھو کیسے ہنستا ہوگا۔ بھلا آدمی کسی کو کیا جان سکتا ہے؟ میں کدم کو بھی کیا جان سکتی ہوں؟ ان بکھری ہوئی کتابوں اور الٹی ہوئی کرسیوں کپڑوں کے انباروں، کھیلنے کے پھیلے سامان، جوتوں اور کاغذوں کے پاس کھڑے جوڑ کر ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ تارانے اپنے آپ کو بھی اسی بے کار سامان کا ایک حصہ سمجھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اسے سردی محسوس ہوئی، اس کی آتما بھی کانپ رہی تھی "دنیا میں وہ کسی کو بھی تو نہیں جانتی"۔ اس نے یوں جانا گویا وہ نہایت گہرے اور چپ چاپ اندھیروں میں سدا سے رہتی چلی آئی ہے۔ اکیلی اور اداس اور بس اداس۔ کوئی آواز نہیں، کوئی آس نہیں۔ پھر کمرے کی بتی جلی۔ کدم نے بڑے دکھ سے کہا "موسی آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں!" تارانے اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا دیا کہیں وہ گر نہ جائے اپنے اکیلے پن کا اتنا شدید احساس اسے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

کدم نے کھڑکی بند کر دی "آیئے نا چائے پیئیں! آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بابا نے بھی کچھ نہیں کھایا!"

تب اسے لگا اسے چائے کی اتنی ضرورت ہے اگر اس نے ابھی چائے نہ پی تو پیاس سے گر جائے گی" ہاں کدم کا کا کو تو یوں بھی بھوکے نہیں رہنا چاہیے۔ انہیں دل کی تکلیف ہے نا!"

"چلئے نا چلیں کب سے انتظار کر رہا ہے"۔ کدم اور وہ برآمدے سے ہو کر چائے کی میز تک آئیں۔ تیز ہڈیوں کا گودا منجمد کرنے والی ہوا اب چلنے لگی تھی۔ پتے اڑ رہے

تھے اور گھوں گھوں کی دل کو دہلانے والی آواز کے ساتھ آندھی اس اپنے چکروں میں اڑا رہی تھی۔ مختلف، عجیب، انوکھی، انجانی باسوں سے بھری ہوئی ہوا، گھاس پر بھی اسی تیزی سے چل رہی تھی جیسے غصے میں اُسے روندنے کے لیے بیتاب ہو۔ ایریل کے تاروں کو ہلاتی، دیوانی ہوتی ہوئی اپنے زور میں اور تیز اور تیز چل رہی تھی تارا کو بچپن میں پڑھی ایک کہانی یاد آئی کہ کس طرح سورج اور ہوا نے مقابلے کے لیے ایک مسافر کو تاکا اور دونوں نے کہا دیکھیں ہم میں سے کون اس کے کپڑے اتروا تا ہے۔ ہوا اپنے زور سے غصے میں بھری اپنی سختی پر نازاں مسافر کے گرد اڑی اور گھومی، اسے ستایا اور مجبور کیا مگر وہ بھی کدم کی طرح چادرہ اپنے گرد لپیٹتا گیا۔ ہوا نے چادرے کے اندر گھس کر اُسے اڑانا چاہا مگر مسافر اپنی ناتوانی کے باوجود اسے مضبوط پکڑے رہا، یہاں تک کہ سارا زور اور سارا شور دکھا کر پوربی ہوا نے سورج کی طرف دیکھا اور خود تھک کر بیٹھ گئی "اگر میں چادرہ نہیں اتروا سکی تو سورج کہاں یہ کام کر سکتا ہے؟"——— پھر سورج نے ہولے ہولے بادلوں کے اندر سے سر نکالا اور اپنے پرکاش کے دکھانے میں تیزی سے نہیں نرمی سے کام لیا۔ مسافر نے شکر کیا اور چادرے کے بل ذرا ڈھیلے کر دیے۔ ذرا دیر میں اسے چادرے میں گرمی لگنے لگی۔ سورج ہنستا ہوا اور بڑھا، قدم قدم، یہاں تک کہ پسینے کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ مسافر نے چادرہ اتار کر تہ کیا، ماتھے سے پسینے کے قطرے صاف کیے اور کسی درخت کے سائے کو ڈھونڈنے لگا۔

سورج نے ہوا کی طرف دیکھ کر کہا "دھیرج میں جو زور ہے وہ زور میں نہیں۔"

اس نے اپنے کمرے میں جا کر بتی روشن نہیں کی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر وہ خالی ذہن سے یونہی اندھیرے میں تکتی اور آوازیں سنتی رہی۔ پڑوس میں منّو کی ماں جانے کا ہے خفا ہو رہی تھیں۔ نوکروں کے کوارٹروں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی شاید وہ کسی شے کے لیے ضد کر رہا تھا۔ کسی کے گھر میں کھلی کھڑکی کے کواڑ زور زور سے بج رہے تھے۔ گرد سے بھری فضا میں سڑک کی روشنیاں بڑی مدھم، بے جان اور

ٹمٹماتی ہوئی لگتی تھیں جیسے بجھنے والی ہوں۔

نیچے سے کدم نے کہا "موسی! کیدار بابو آئے ہیں۔"

بے خیالی میں اس نے جواب دیا "انھیں اوپر ہی بھیج دو۔"

جب سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ گھبرائی "ارے۔۔۔" کیدار اوپر تک آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا، جیسے اجازت چاہتا ہو۔ اندھیرے میں اُسے یوں بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"اچھا ہے اندھیرا ہے اور کیدار کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا" ورنہ اسے کتنی لاج آرہی تھی۔ تارا کو اپنے سے یہ اُمید نہیں تھی۔

اس دن وہ میوزیم جارہی تھی اور بہت جلدی میں تھی۔ کلاس کے لیے اسے شاید کسی پرانی پینٹنگ کے حوالے کی ضرورت تھی۔ دروازے میں گھستے ہی وہ مل گیا "ارے آپ!" کیدار نے کہا تھا "میں آپ کی طرف آنے ہی والا تھا۔"

تارا کے گال تپ گئے، خون سر کی طرف دوڑنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

کیدار نے ہنس کر کہا "بھئی آپ ہماری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔ کیا ہمارا ملنا آپ کو اچھا نہیں لگا؟"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا اور آپ نے کیوں سمجھ لیا؟" تارا نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ جانے کیوں وہ جب بھی ملتا، تارا کا سر گھومنے لگتا تھا، سوچتی وہ ابھی گر جائے گی۔

"آپ چپ ہو گئی ہیں نا! میرے پاس خاصا وقت ہے۔ آج میرا کوئی پیریڈ نہیں تھا۔ مَیں کانگڑہ سکول کی تصویریں دیکھنے آیا تھا۔ آپ کیسے آئی ہیں؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

تارا کو اس کی ہنسی کتنی پسند تھی۔ اتنی دلکش، اتنی جاندار اور اتنی پُرخلوص جیسے امید کی روشنی ہو۔ جب وہ ہنستا تھا تو تارا کو محسوس ہوتا تھا وہ اکیلی نہیں ہے۔ جانے اس نے

اس کی ہنسی سے کیوں اتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں " سبھی کے ساتھ وہ یوں ہنس کر بات کرتا ہے پھر جانے کیوں مجھ سے ہی کیوں، مجھ اکیلی کو کیوں اس ہنسی نے باندھ لیا ہے ؟ تارا، تارا ہوش میں آؤ" اس نے اپنے آپ کو پھٹکارا۔

"میں ممتاز محل اور شاہجہاں کی تصویر دیکھنا چاہتی ہوں۔ کل لڑکیوں کو پڑھانا ہے" اس نے کیدار کی طرف دیکھے بنا کہا " آپ بھی آیئے !"

وہ دونوں اندھیری اور خاموش گیلریوں میں سے اِدھر اُدھر دیکھتے اس طرف چلے جہاں مختلف سکولوں اور مختلف زمانوں کی بالکل انوکھے انداز کی مغل بادشاہوں اور شہزادیوں اور جنگوں اور علاقوں کی تصویریں تھیں۔ تارا کو یہ منی ایچر بہت پسند تھے۔ سدا سے، اسے اس آرٹ کی خوبصورتی اور رنگوں کے ساتھ وہ مہارت بہت ہی حیران کن معلوم ہوتی تھی جس سے فنکار چہرے کے تاثرات میں جان پیدا کرتے تھے۔ بڑی تصویر میں یہ بات پیدا کرنا آسان ہے بہ نسبت چھوٹی پینٹنگ کے۔

"میں آپ کو ممتاز محل کی تصویر ڈھونڈھ دیتا ہوں" کیدار دوسری طرف چلنے لگا وہ وہیں کھڑی رہی اور پشت سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے بالوں میں سفیدی گھلی تھی اور کندھے یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے کتنے بوجھ انھوں نے ڈھوئے ہیں " جانے یہ کون ہے جو یوں بنا بتلائے میری زندگی میں گھس آیا ہے۔ میں اسے پسند بھی نہیں کرتی اور پھر بھی اس کا خیال مجھے دیوانہ بنائے رکھتا ہے۔ کتنے مہینوں سے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہر لمحے ہر گھڑی کیدار کا خیال مجھے ایک پل کو نہیں چھوڑتا۔ میں کیا کروں بھگوان ؟"

اس کے جی میں ایک ٹھنڈی سانس چکر لگانے لگی تھی۔ وہ ایک تصویر کے سامنے کھڑی تھی جس میں ایک مغل شہزادی اور اس کی سہیلی تخت پر بیٹھی تھی، باندیاں پیچھے مورچھل ہلا رہی تھیں۔ شہزادی کے ہاتھ میں کسی شہزادے کی تصویر تھی جو شاید کسی باندی نے اسے لاکر دی تھی۔ سہیلی کے چہرے پر صرف دلچسپی تھی مگر شہزادی کا چہرہ اندرونی رنج سے بجھا بجھا سا تھا جانے وہ اس تصویر والے پر کب سے فدا تھی، کب سے اس کو چاہتی تھی اور کب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ تصویر میں دُور تک پھیلا ہوا آکاش تھا اور

قلعے کی آکاش اور دھرتی کے ملنے کی جگہ تک دیواریں تھیں، پھر باغ تھے اور درختوں کے اندر ہیرامن طوطا تھا۔ طوطا، جو شہزادیوں کو شہزادوں کی صورتوں اور خوبصورتیوں کے قصے سناتا ہے جو شہزادوں کو بنوں بنوں اور شہروں شہروں آوارہ کھوج میں لگانے کا سبب بنتا ہے اور جس کی وجہ سے کہانیاں بنتی ہیں۔ محبت کے نہ بھولنے والے قصے بنتے ہیں۔ دُکھ اور سُکھ بنتے ہیں، بچھڑنا اور ملاپ بنتے ہیں۔ کانپ کر اس نے سوچا "جب شہزادیاں دکھ بھوگ لیتی ہیں تو بھلا میں کون ہوں؟" پاس کھڑے کیدار کے وہاں ہونے کے احساس سے اس کا جی گھبرا رہا تھا "کیا ہی اچھا ہوتا میں نے کیدار سے ساتھ آنے کا نہ کہا ہوتا۔"

دوپہر تھی اور کھانے کا وقت ہونے والا تھا۔ گیلری میں وہ دونوں اکیلے تھے، چونکہ چوکیدار انھیں جانتا تھا اس لیے اس نے ان کے ساتھ ساتھ چلنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ گیلری کے دوسرے سرے پر اپنے سٹول پر بیٹھ گیا اور پھر وہاں سے بھی سگریٹ لینے یا کسی اور کام سے کہیں چلا گیا۔ اس نے سناٹے میں اسے اپنے وجود کا اور اس کے وجود کا بے پناہ احساس ہو رہا تھا۔ کوئی آواز نہ تھی جانے کیا ہونے والا ہے، جانے کیوں ہونے والا ہے، اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگا۔ "کیدار، کیدار" —— اسے جانے کیوں یہ نام پکارتے رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی، رگوں میں خون کے ساتھ یہ نام بس سانس کی طرح آتا ہی رہتا تھا۔

وہ اس کی طرف آیا اور ہنسا ہے تو تارا نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی جیسے بچے سوچ لیں تو اپنے پر قابو نہیں پا سکتے۔ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے دو دشمنوں کی طرح۔ کیدار نے کہا "چلئے آپ کو تصویر دکھاؤں۔"

"مل گئی ہے کیا؟" تارا کا سانس سینے میں اٹک رہا تھا۔ شاید اتنی تصویروں کے درمیان اس خاموش عمارت میں وہ کھوئی ہوئی سی تھی۔

کیدار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اس کے پیچھے چلتی گئی۔ اس سرے پر جس تصویر کے سامنے وہ جا کر کھڑا ہوا۔ اس میں ایک جوڑا چاندنی میں کسی محل کی چھت پر بیٹھا تھا۔ آکاش

کی نیلاہٹ میں پورا چاند دریا کی لہروں میں بھی ڈول رہا تھا۔ باندیاں منہ پھیرے کھڑی پنکھا ہلا رہی تھیں۔ شہزادے نے اپنی محبوبہ کو زانو پر بٹھا رکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ محبت تھی۔ تارا نے جھک کر وہ عبارت پڑھنا چاہی تو وہ بازوؤں کے حلقے میں تھی اور کیدار کی سوگند اسے مدہوش کیے دیتی تھی۔ میوزئم کی عمارت گھوم گئی——— بند ہوتی سانس کے ساتھ اس نے کہا "——— کیدار مجھے چھوڑ دو، کیدار بھگوان کے لیے" وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ تم برباد ہو گئیں نین تارا! منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں نین تارا! وہ کیا سوچتا ہوگا؟ وہ ہنستا تھا، وہ کیا کہتا ہوگا۔ میں نے اسے قتل کیوں نہیں کر دیا۔ ارے میں، یعنی کہ میں نین تارا! جس کو اپنے پر اتنا بے پناہ اعتماد تھا گر گئی ہوں؟

سارا دن وہ تھکی سی بیٹھی رہی۔ اس سے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا گیا۔ زرد چہرے اور چور من کے ساتھ وہ کس کو منہ دکھانے کے قابل تھی۔ کدم نے پوچھا "موسی! بیمار ہیں کیا؟"

مگر اس نے کہا "نہیں!"

"موسی! ڈاکٹر کو بلواؤں؟" کدم کو بہت فکر تھی۔

تخت کے سرے پر دونوں ہاتھ ٹکائے وہ اندھوں کی طرح اپنے سامنے خلا میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی "نین تارا! ہائے یہ کیا ہو گیا نین تارا! تم کو کیا ہو گیا ہے نین تارا؟"

"میں نے یہ کب چاہا تھا!" اس نے اپنے سے سوال کیا۔

اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ ایک ہی لفظ، ایک ہی خیال اس کی ہنسی کا، اس کی شرارت کا اسے رہ رہ کر آ رہا تھا۔ میں نہ ساوتری ہوں نہ سیتا، نہ ہی میرا ہوں اور نہ ہی شکنتلا۔ میں کیا ہوں؟ میں کیا ہوں؟ ہائے ہائے!" وہ کراہ کر دائیں بائیں دیکھتی رہی۔

راگھو نے اس روز اسے زور سے پکارا تھا تو کدم نے کہا تھا "لگتا ہے دھوپ کی وجہ سے انھیں کچھ ہو گیا ہے بات ہی نہیں کر رہی ہیں، بھیا تم شور مت کرو۔"

راگھو دھپ دھپ کرکے سیڑھیاں چڑھا اور خوب شور مچاتا اوپر آیا تھا اس نے دیکھا وہ اندھیرے میں دونوں بازوؤں کے سہارے تخت پر بیٹھی تھی۔

"او کدم کی بچی! " اس نے کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر کہا "تو نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا اور یہ اچھی بھلی بیٹھی ہیں۔" پھر اُس نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ "چلئے موسی! آپ خواہ مخواہ کیوں چھپی بیٹھی ہیں۔"

"راگھو میرا جی واقعی اچھا نہیں۔" اس نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہوں! جی اچھا نہیں۔ کیا ہے آپ کے جی کو؟" ہاتھ لگا کر اس نے ماتھا چھوا۔ "ارے بھئی یہ تو گرم ہے! کدم او کدم ذرا اوپر آؤ۔ دیکھو موسی کو بخار آ گیا ہے۔" کہتا شور کر رہا تھا وہ، پھر کدم اوپر آئی۔

"میں نے سوچا تھا آپ لیٹ گئی ہوں گی۔" سر دباتے ہوئے اُس نے کہا: "موسی بخار کیوں آ گیا ہے، دھوپ کھا گئی ہیں کیا؟"

راگھو نے بتی جلائی تو تارا نے آنکھوں پر ہاتھ دھر لیا۔ روشنی اس کی آنکھوں میں چُبھنے لگی تھی، وہ کسی شے کو دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ ہائے رام یہ کیا ہو گیا ہے۔ کیدار کا نام اس کی یاد، اس کے جی میں کچھ بھی تو نہ تھا۔

دوسرے دن وہ کالج نہیں گئی۔ کوئی دس بجے چیتن نے کہا "کیدار بابو کا فون آیا ہے۔"

"کیدار بابو کا!" اس نے لیٹے لیٹے سُرخ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر کے اس کی طرف دیکھا مگر آنکھیں کھل نہیں سکیں۔

"پھر کیا کہوں انھیں۔" چیتن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" تارا نے روشنی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔

سیڑھیوں پر پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کدم کالج جا چکی تھی۔ اُس نے سوچا یہ چیتن ہی ہو گا۔ اپنے پاؤں پر کسی ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اس نے کہا "کدم کیا

تم ہو۔۔۔۔؟"

"تارا ——— تارا!" کسی نے اُسے پکارا۔

"بھگوان کے لیے، کیدار بابو۔" اس کی آواز ڈوب گئی۔

"تارا! مَیں کل سے فون کر رہا ہوں۔ یہی جواب مِلتا ہے کہ تمھارا جی اچھا نہیں اگر تمھیں میری حرکت سے دکھ پہنچا ہو تو مَیں معاف کر دیا جاؤں۔" کیدار نے کھڑے کھڑے کہا۔

تارا کا جسم سسکیوں سے ہِل رہا تھا۔ وہ یوں رو رہی تھی جیسے طوفان میں اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔

"سنو تارا، میری بات تو سنو۔" کیدار نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔

تارا روتی رہی ———

"تارا سنو!" کیدار نے سختی سے کہا "تم اگر مجھے چاہتی نہیں ہو تو کم از کم پسند تو کرتی ہو!"

"مگر میں نے آپ سے کب کہا تھا؟" تارا نے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے مَیں نے زیادتی کی ہے۔ مگر جس طرح آدمی خوش رنگ پھول کو قریب سے دیکھتا ہے، دیکھنا چاہتا ہے، مَیں نے بھی تمھیں چھونا چاہا ہے۔ یہ اتنی بڑی گستاخی نہیں کہ تم اپنا دل توڑ لو۔ اتنی بڑی زیادتی بھی کہاں ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں! تارا تم کیوں رو رہی ہو۔"

وہ لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی "بھگوان کے لیے آپ جائیے۔ مجھے معلوم ہے مگر میں اپنے جی کا کیا کروں!"

پھر کسی جھنڈ میں ذرا دُور کسی پیڑ کی گھنی شاخوں میں چھپی کوئل بولی کوہو کوہو۔

تارا گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی۔ دونوں کوہو۔ کوہو سنتے رہے۔ کیدار نے نے دیکھا تارا کے سر میں سفید بال یوں تھے جیسے سیاہی میں کہیں کہیں سورج کی کرنیں ہوں۔ سیڑھیوں پر چیتین کے قدموں کی چاپ سن کر تارا نے جلدی سے کہا "آپ بیٹھ

جاتے نا کہیں بھی۔"

کیدار پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تارا نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر سُرخ آنکھوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "چیتن! ان کے لیے شربت پانی کچھ تو لاؤ۔"

"نہیں، اب مَیں چلتا ہوں۔" کیدار نے یونہی کہا۔

چیتن اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ کیدار نے کہا "لیٹ جاؤ، تارا! مجھے معاف کر دو۔"

"آپ کو معاف کر دینے یا نہ کر دینے سے اگر میرے جی کا دُکھ کم ہو سکتا تو میں آپکو معاف کر دیتی۔" یہ کہنے سے تارا کے جی کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا تھا جیسے بادل برس کر کھُل گئے ہوں۔

ذرا میری طرف دیکھو۔" کیدار نے ہولے سے کہا۔

"نہیں۔" تارا نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"کیا یہ اتنا بڑا پاپ ہے کہ اس کا پرائشچت نہیں ہو سکتا؟" کیدار نے پوچھا۔

"آپ نہیں سمجھتے آپ نہیں سمجھیں گے یہ پاپ نہیں ہے مگر مَیں اپنے کو ان طوفانوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔ یہ میرے راستے نہیں ہیں۔" تارا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مَیں عام آدمی ہوں، میری حرکتیں اور سوچیں عام آدمیوں جیسی ہیں۔ مَیں تمھیں دیوی نہیں سمجھ سکتا تھا تم بھی محسوس کرنے والی غصّہ کرنے اور خوش ہونے والی ایک عام لڑکی ہو پتھر کی مورتی نہیں۔" کیدار کی آواز میں غصّہ تھا اور افسوس بھی ——!

"یہی میری بھول ہے کیدار بابو۔ مَیں پتھر کی مورتی ہوں جس کے سینے میں، عورت کا دل تو دھڑکتا ہے مگر جو عورت بننا نہیں چاہتی، مورتی ہی بنے رہنا چاہتی ہے۔" تارا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اُن آنکھوں میں محبت نہیں تھی، نفرت نہیں تھی، صرف سُرخی تھی۔

"تم لیٹ جاؤ تارا۔" کیدار بابو نے بہت نرمی سے کہا "تمھاری آنکھیں بہت

سرخ ہیں۔"

چیتن نے شربت لاکر برابر کی میز پر رکھ دیا" کدم بی بی کا فون آیا ہے، آپ کا جی کیسا ہے؟" اس نے جاتے ہوئے پوچھا" کہہ رہی تھیں ان کا دھیان رکھنا۔"

"تم نے کیا کہا؟" تارا بولی۔

میں نے انہیں کہا" کیدار بابو آئے ہوئے ہیں اور آپ کا جی پہلے سے اچھا ہے ——!"

اچھا میں چلتا ہوں۔" کیدار نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"شربت تو پیتے جائیے۔ چیتن انھیں دونا!" تارا نے سر پھر گھٹنوں میں دے لیا تھا۔

"میں خود ہی لیے لیتا ہوں۔" کیدار نے ہاتھ بڑھا کر گلاس میں پانی انڈیلا۔ چیتن نیچے چلا گیا۔

کیدار نے کہا" تارا تم تو ایسا ستار ہو جس میں ان کے گیت بھرے ہیں۔"

تارا نے کہا" پلیز! کیدار پلیز بس اور نہیں!!"

"ان باتوں کے سن لینے سے تمھارا کیا جاتا ہے؟" کیدار نے بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں میرے لیے نہیں بنی ہیں اگر میں ستار ہوں تو بھی یہ گیت بنا گائے ہی رہ جائیں گے۔ اب رہنے دیجیے۔ یہ سب کہہ کر آپ مجھے بہت دکھی کرتے ہیں۔"

تارا اوپر نہیں دیکھ رہی تھی۔ کیدار بنا کچھ کہے اٹھا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

اس بات کو بہت دن ہو گئے تھے۔ ان سب دنوں اس نے نہ تو فون کیا تھا نہ وہ آیا تھا نہ ہی اس نے ملنے کی کوشش کی تھی کہیں بازار میں کسی فٹ پاتھ کسی میٹنگ میں کسی جگہ بھی تو ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لگتا تھا وہ اسے بھول گیا ہے بالکل۔ استادوں کی ایسوسی ایشن کی جو میٹنگ ہر پندرھواڑے ہوتی تھی اس میں بھی وہ نہیں آیا۔ وائس پریذیڈنٹ نے ساری کارروائی کی تھی۔

تارا کا دل پہلے دنوں کی طرح دیوانہ بنا ہر جگہ اسے ڈھونڈتا رہا۔ اسے اپنا بھی

تو پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

"تم نے اسے کھو دیا ہے۔" اس کے دل میں کوئی کہتا۔

"تم نے اسے پایا ہی کب تھا!" کوئی دوسرا اسے جواب دیتا۔ "اسے تم سے دلچسپی تھی ہی اتنی کہ تم ایک ستار ہو جس میں ان کے گیتوں کے بول ہیں۔" اکیلے میں ہنس ہنس کر وہ بے حال ہو جاتی۔ "کیدار ——— کیدار ———" میوزیم کی عمارت یوں کھوتی جیسے بھنور میں پھنس گئی ہو۔

اور آج جب وہ آیا تھا حالات کتنے مختلف تھے۔ کاکا باہر جا چکے تھے۔ کدم رات بھر کی جاگی ہوئی شاید سونے جا رہی ہوگی۔ دادا بڑے نراش سے تھے اور یوں بھی اُن دنوں ان کا جی اچھا نہیں تھا۔ آدمی کو کبھی کبھار کا اندھیرا اچھا لگتا ہے۔ جیسے اب اس گھڑی وہ اندھیرے کی گود میں آسرا لیے بیٹھی تھی اور کیدار اندر آنے کی اجازت چاہتا تھا۔ نہ اس کا دل دھڑکا نہ وہ اٹھی اور نہ ہی اس نے کہا اندر آجاؤ۔ وہ جانے کب تک وہاں کھڑا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں نے اندھیرے میں اسے دیکھ لیا۔ ایک کرسی پر، جو اسے دکھائی دی ڈھیر ہو گیا اور شام کی ہوا جو آندھی کا روپ دھار چکی تھی، بَین کرتی ہوئی یہاں وہاں ٹھہرتی، گرتی پڑتی اپنی منزل کی طرف چلتی رہی۔

"تارا! تم نے مجھے ابھی تک معاف نہیں کیا۔" اس کی آواز جذبات سے جکڑی تھی۔ وہ یونہی بات کرنے کے لیے اس سناٹے کے جادو کو توڑنے کے لیے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لگتا تھا وہ بچوں کی طرح اندھیکار سے ڈرتا تھا اور اپنی آواز سے ہی تسلی حاصل کر رہا تھا۔

"بھگوان! ——— تارا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"سنو۔" اس نے پھر کہا "تم نے آج فون کیا تھا نا! میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔"

وجہ یہ تھی کہ تارا نے یہاں وہاں جانے کس کس کو فون کیے تھے اور اس نے اسے بھی فون کیا تھا تو وہ اس سے ہمدردی کرنے آیا تھا۔ نہیں، اخلاقاً پوچھنے آیا

تک ڈرا سے کیوں یاد کیا گیا ہے۔ اسے ذرہ برابر تو اس کی پرواہ نہیں تھی۔
آپ کا بیٹا بھی تو زخمی ہو گیا ہے۔" تارا نے اُٹھ کر بتی روشن کی۔
کیدار بھی تھکا ہوا اور بڑا نراش لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اور گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ وہ بہت بے حال ہو رہا تھا۔ تارا کو لگا یہ راگھو ہے۔ اسے ایک دم اس پر اتنا پیار آیا مانو وہ اُس کی ماں ہو۔
"ہاں، پرکاش تو ہسپتال میں ہے اور پولیس کی نگرانی میں۔ اس کی ماں کو بھی دیکھنے کی اجازت نہیں ملی، صرف میں اور شیام بابو کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ پاتے ہیں۔"
کیدار نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو تارا نے دیکھا کہ اس کے ناخن گندے اور میل سے اٹے ہوئے تھے۔
"جانے کیا ہونے والا ہے؟" تارا قالین پر بیٹھ گئی "راگھو کو انھوں نے جانے کہاں رکھا ہے؟ کاکا باوجود کوشش کے ابھی تک پتہ نہیں چلا سکے۔"
"میں تو اس لحاظ سے اور بھی بے بس ہوں۔ استادوں کو کون پوچھتا ہے!" کیدار نے ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلا لیں اور کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ تھکن کو دُور کر سکے تارا نے کھڑکی میں سے چیتن کو پکارا کہ چائے لے آئے۔
کدم بھی اُوپر آ گئی۔ وہ تینوں سردیوں کی اس تاریک رات میں ایک دوسرے کے وجود سے سکون اور تسلی حاصل کر رہے تھے۔
"بھیا کو تو کوئی نہیں روک سکتا نا، پر سب لڑکے ایک سے نہیں ہوتے۔ آپ نے پرکاش بھائی کو منع نہیں کیا کبھی؟" کدم نے چائے بناتے ہوئے کہا۔
"میں بچوں کو اپنے فیصلے آپ کرنے دینا چاہتا ہوں" کیدار نے گرم چائے کے گھونٹ کو نگلتے ہوئے کہا۔
"فیصلوں میں بھی تو کوئی فرق ہوتا ہے۔ آپ اسے یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ جائے اور اپنا سر کھلوا ڈالے" کدم نے تارا کو پیالہ پکڑاتے ہوئے کہا۔
"یہ فیصلے بچوں کے اپنے کہاں ہیں یہ تو ایک آندھی ہے کہ سب کو اڑائے لیے

جاتی ہے۔" تارا نے کہا۔

"ان ہنگاموں کا کوئی سبب تو ہوگا آخر!" کدم نے پوچھا "لڑکیوں کے کالج میں نہ بے اطمینانی ہے اور نہ ہی کوئی شور۔ پڑھتے دونوں ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ یونیورسٹی میں لڑکوں نے یہ سب کیا ہے۔

تارا اور کیدار دونوں نے کدم کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ پھر بولی "مونی کے کالج میں کچھ نہیں ہوا۔"

موٹر رکنے کی آواز آئی۔ شیام داس آئے تھے۔ کدم پیالہ وہیں پر رکھ کر چلی گئی۔

کیدار نے کہا "تارا کیا میں سمجھ لوں کہ تم نے مجھے خوش دلی سے معاف کر دیا ہے ۔۔۔؟"

تارا کے ہاتھ میں پیالہ کانپ گیا مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیدار، ان باتوں کو دہرانے سے فائدہ؟"

"ٹھیک ہے، دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ دوستی کی فضا پھر سے پیدا ہو۔ تم پہلے زمانوں کی طرح مجھ سے کھل کر بات کرو۔ ڈھنگ سے بولو۔ ہمارے درمیان جو دیوار سی اٹھ آئی ہے یہ نہ رہے۔ کیدار یوں کہہ رہا تھا جیسے یہ کوئی عام معمولی جھگڑا ہو۔

"کیا ہی ہوتا اگر ایسا ہو سکتا!" تارا کا دل سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا اور اسے یہ بات بھی عجیب لگ رہی تھی کہ وہ دونوں بڑے دکھوں کو بھول کر ذاتی باتیں کر رہے تھے۔ ایسی باتیں جو دل سے تعلق رکھتی تھیں اور دل بھلا کسی کے اختیار میں ہے؟

"چلوں اب شیام بابو سے ملوں۔" کیدار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تارا بھی اخلاقاً اٹھی تھی۔ پھر کیدار نے قدم آگے بڑھایا اور اس سے پہلے کہ تارا سمجھ پاتی، کیدار نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھوا اور تیزی سے نیچے اتر گیا ۔۔۔۔

"ہائے یہ میں!" تارا نے بے بسی سے سوچا۔ اس کا چہرہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا

اور دُھواں لگنے سے آنکھوں میں سخت جلن ہو رہی تھی۔

"کیدار کو معلوم ہے نا کہ میں اس کے سامنے پانی کی طرح بہنے لگی ہوں" تارا نے سوچا ـــــــ جانے کتنی رات جا چکی تھی نیچے کوئی آواز نہ تھی "وہ اب اپنے گھر میں ہوگا بیوی بچوں کے درمیان۔"

شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ سو جائے اور اب کبھی نہ اُٹھے پر، مرنے پر بھی کسی کا اختیار ہے کیا! جانے یہ کیسا جذبہ تھا کہ وہ دونوں اس مار دھاڑ کے وقت جب پرکاش اور راگھو دکھ میں تھے اپنا آپ نہیں بھول سکے تھے۔ پتا نہیں کبھی آدمی اپنا آپ بھول بھی سکتا ہے؟

اس نے کھڑکی بند کی تو انگلی پر چوٹ آ گئی۔ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دب گیا تھا۔ "کیا میں ایسی ہی دیوانی ہو گئی ہوں کہ اپنے آپ کو زخمی کر بیٹھی ہوں۔" اور بیٹھے بیٹھے وہ زور زور سے ہنسنے لگی "ہاں۔ میں نے اس سلسلے میں کتنی تکلیف دی ہے اپنے کو ـــ ہی ہوں۔ بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔ کون یقین کرے گا کہ اتنی عمر بیت جانے پہ میں نے اپنے کو بھلایا ہے۔"

کھڑکی کے شیشوں میں سے چاندنی جھکی ہوئی مدھ ماتی رات کا سنگار بنی خوشبوؤں اور باسوں کا پٹارا کھولے اندر آنا چاہتی تھی۔ کتنی صدیوں سے یہ یونہی ہے جانے ان کھڑکیوں میں سے کتنی پیاسی آنکھوں نے ان راہوں پر جھانکا ہوگا۔ بھگوان تیرا شکر ہے، میں کیدار کی راہ نہیں دیکھتی۔"

سامنے پیڑ پر کوئی پرندہ چیخا جیسے سپنے میں چونک گیا ہو۔

رات اپنی آوازوں سے آباد تھی اور چاند اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ـــــــ کیدار کیدار !!

"میں اس نام کو نوچ کر پھینک دوں گی۔ اگر اس دل میں یہ نام یونہی گونجتا رہا تو ـــ!"

پر نام تو خالی گھروں میں یونہی گونجتے ہیں۔ پکار انگ انگ سے یوں واپس آتی

ہے جیسے کوئی مذاق اڑا رہا ہو۔ اس خالی گھر میں اس ایک نام نے بس جگہ بنا لی تھی۔ "اچھا دیکھا جائے گا۔" اُس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی۔ انگوٹھے میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور نیند نہیں آتی تھی پھر اس نے دل کو یوں چھوڑ دیا جیسے کوئی کشتی کو پانی کے دھارے پر بہنے کے لیے اکیلا چھوڑ دے۔ کیدار کا نام تیز لہروں کی طرح اس کے دل و دماغ اور اس کی آتما کو ڈھانپے رہا۔

"میں اس کے مقابلے میں کھڑی ہو کر بھلا کیا جیت سکتی ہوں؟ میں اس کی ہستی کو اسی طرح اپنے پر سے بہنے دوں گی۔"

"مقابلہ ختم ہوا تارا!" وہ بہت خوش دلی سے سوچتی رہی "اور میں نے اُسے معاف کر دیا۔"

سردیوں کی اس صبح کو روپہلی دھوپ پہاڑی چشمے کے تیز دھارے کی طرح اونچی عمارتوں پر سے اور چھوٹی نیچی چھت کے غیر اہم سے مکانوں پر سے بہہ رہی تھی۔ کتنے دنوں کے جھگڑوں اور بادلوں اور میلے دنوں، بیمار دھوپ، اندھی روشنی کے بعد ایک جگمگاتا ہوا دن آیا تھا۔ جانے کس کے سواگت کو اونچے پھریرے اڑاتی روشنی ٹھٹھری ہوئی زندگی پر مسکراتی ہوئی اتری تھی۔

آدھی رات گئے اوہی ناشس آیا تھا۔ کدم بھاگی بھاگی اوپر آئی اس کا سانس سینے میں سما نہیں رہا تھا "موسی! موسی!" اس نے اس کے دروازے کے سامنے کواڑ دھڑ دھڑائے بنا اسے پکارا تھا۔

تارا ایک سپنا دیکھ رہی تھی جس میں وہ اور کیدار برابر برابر کھڑے تھے جیسے کسی عدالت میں بیان دینے آئے ہوں۔ دبی دبی، گھٹی گھٹی پکار سن کر اس کی جاگ تو ختم ہو گئی تھی مگر وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کون پکار رہا ہے۔ پھر ایک دم پوری طرح جاگ کر وہ اُچھل کر بستر سے نکلی۔

"کیوں کدم بات کیا ہے؟" اس نے کواڑ کھولنے چاہے مگر اُس کے ہاتھ سُن

تھے۔ انگلیوں میں سکت نہ تھی اور بازو اٹھ نہیں رہے تھے۔ اس نے بازوؤں کو ایک کو دوسرے ہاتھ سے دبایا "ہائے رام بھلا کیا ہو گیا ہے۔"

"موسی کواڑ کھولیے بہت ضروری بات ہے۔" کدم نے پھر پکارا۔

"اچھا بی بی ذرا تو ٹھہرو!" اسے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔

زمانے گزر گئے ہیں اور اس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہیں اور وہ کبھی بھی دروازے کو کھول نہیں سکے گی۔

"موسی ــــ!" بند دروازے کے باہر کدم نے کہا "اودی ناش آیا ہے بھیا کا سندیسہ لے کر اور آپ کو بلا رہا ہے۔"

"کاکا کہاں ہیں؟" وہ جمی ہوئی انگلیوں سے چٹخنی کو کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ کئی مہینے سے ہو رہا تھا کہ سوتے میں اس کی انگلیاں جم سی جاتیں اور صبح دیر تک وہ انھیں دباتی، سہلاتی، آگ پر سینکتی اور تب ان میں لہو رواں ہوتا۔

وہ دونوں بھاگم بھاگ نیچے آئیں۔ شیام داس کے کمرے میں مدھم روشنی میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے اودی ناش نے اسے نمسکار کیا۔

"تارا! یہ راگھو کا خط ہے۔" انھوں نے ایک بند لفافہ اسے تھما دیا۔

پڑھ کر اس نے اودی ناش کی طرف دیکھا۔

"میں یہ خط اس لیے خود لایا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکیں گی؟" وہ اب کرسی میں سیدھا بیٹھا تھا۔

"راگھو نے تو لکھا ہے کہ فوراً عورتوں کا ایک جلوس نکالا جائے۔" تارا کی آواز کمزور سی تھی "اور مجھے ان معاملوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"مجھے، راگھو اور ہمارے باقی ساتھیوں کو کسی کو بھی تجربہ نہیں تھا مگر آپ کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے، ہوتے ہوتے آدمی سب سیکھ جاتا ہے، سب کر لیتا ہے، سب کچھ کر گزرتا ہے۔" اودی ناش کی ہنسی بڑی جاندار اور اس کی آواز میں بڑا اعتماد تھا۔

تارا نے شیام داس سے کہا "کیوں کاکا؟"

شیام داس کہنے لگے "تم جانو اور تمہارا کام، میں تو پہلے ہی اس نسل کے حق میں نہیں ہوں۔"

تارا، اوی ناش اور کدم تینوں ان کی طرف دیکھتے رہے۔

اوی ناش نے کہا "اس نسل کو بزرگوں کی اشیرباد کی ضرورت ہے۔" اس کے دانت موتیوں کی لڑیوں کی طرح اس کمزور بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ شیام داس کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی کسی پرانی مورتی کی طرف دیکھے۔

"تم کیسے باہر آگئے ہو؟" شیام داس نے یوں پوچھا جیسے انھیں کچھ یاد آگیا ہو۔

"میں تو باہر ہی ہوں مہاراج۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر تارا کی طرف دیکھ کر بولا "میرے پاس وقت کم ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے پاس پھر آنہ سکوں۔ تاریخ اور جلوس کا وقت اور سب کچھ جو اس خط میں درج ہے، اس پر عمل کیا جائے۔" اس سے پہلے کہ کدم یا تارا اس سے کوئی اور بات پوچھ سکیں وہ دروازہ کھول کر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے سیٹیوں کی آواز سنی۔ شاید ان کا کوئی خاص اشارہ تھا اور وہ اپنے ساتھیوں کو پکار رہے تھے اور اندھیرے میں خوابوں کی روشن منزلوں کی طرف رواں تھے۔

کدم کہنے لگی "موسی! میں تو سمجھی تھی اوی ناش ذرا بڑی عمر کا بہت تیز قسم کا آدمی ہوگا مگر یہ تو بھیا کی طرح ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہنسنے اور جھجک کر بات کرنے والا لڑکا"

تارا اور شیام داس دونوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

چوکیدار کی "جاگتے رہو" سنائی دی۔

وہ کچھ سوچتی ہوئی اوپر آئی۔ کدم اور وہ دیر تک بیٹھی پروگرام بناتی رہیں۔ دونوں کے دماغ تیزی سے کام کر رہے تھے۔

جب کدم لیٹی ہے تو کہنے لگی "اور میں کیدار بابو سے کہہ رہی تھی کہ یہ سب ہنگامہ لڑکوں کے کالجوں میں ہے، لڑکیاں خاموشی سے پڑھتی ہیں اور بس!"

حکومت نے محسوس کیا کہ کالجوں میں حالات تقریباً نارمل ہو گئے ہیں تمام لیڈر

جیل میں تھے اور راوی چین لکھتا ہے، یوں بھی ماں باپ بچوں کے گھر بیٹھنے کی وجہ سے پریشان تھے اور سوچتے تھے کہ پڑھائی شروع ہو تو ان کا بوجھ ہلکا ہو۔ دفعہ ۱۴۴ کے ختم ہونے کا اعلان ہو گیا تھا۔

گھروں میں چہل پہل تھی۔ پڑھنے والے اسکولوں اور کالجوں کو جا رہے تھے۔ سارے کام معمول کے مطابق ہونے لگے تھے۔ بچوں سے بھری بسیں اپنے ہارن بجاتی چمکتے چہروں، ہنستے مسکراتے پھولوں کو لیے تیز تیز جا رہی تھیں۔ سٹاپوں پر دھوپ تاپتے بابو لوگ بسوں کی انتظار میں تھے اور اجنبی لوگ ایک دوسرے سے موجودہ صورتحال پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ اخباروں کی شہ سرخیوں کو پڑھتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو سیاسی اور سماجی حالت پر اپنے اپنے خیال کھلے بندوں بتا رہے تھے۔ پھر کوئی بس آتی تو بات ادھوری چھوڑ، وہ لپک کر اس میں سوار ہونے کے لیے بھاگتے۔ سائیکل سوار سیٹیاں بجاتے تیز تیز چلاتے تاکہ سامنے سے لگتی ہوائیں وہ اپنے وجود کو گرم رکھ سکیں۔ بھاگتی ہوئی موٹریں، بھری ہوئی سڑکیں، رُکا ہوا ٹریفک، رنگین آنچل اور دھوپ کا دھارا، دنیا کتنی خوش گوار اور خوب صورت لگ رہی تھی، محبت کیے جانے کے قابل۔

دوپہر تک وہ مہلا کالج کی لڑکیوں کو لے کر اس بڑی سڑک کے چوراہے پر جا پہنچی جہاں سے جلوس شروع ہو کر گورنمنٹ ہاؤس تک جانے والا تھا۔ خاموش چپ چاپ سروں کو ڈھانپے قطار اندر قطار آہستہ بہنے والے دریا کی موجوں کی طرح رواں دواں۔ پھر اور کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں موج در موج لڑکپن اور جوانی کے سارے دھارے یہاں پر مل رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیاں ایک کے بعد ایک آتیں، رکتیں اور گنگ لینے کے لیے پھر واپس چلی جاتیں۔

اتنے دنوں کی دوڑ دھوپ کے باوجود تارا کی رگوں میں خون بہت نرمی سے چل رہا تھا اور اس کا دل دھک دھک نہیں کر رہا تھا، وہ اپنا مطلب سمجھانے میں چاہے کامیاب ہوں یا نہیں مگر وہ سب وہاں اکٹھا ہو گئے تھے۔ جوان، پرجوش

گرم خون، نیا دماغ، تازہ اور باغی سوچیں، عزم سے بھرے دل کچھ کرنے کا دھیان لیے ہوئے، کچھ نہ سمجھ کر بھی اس جلوس میں شریک بچے جیسے میلے میں آئے ہوں، خوش خوش۔

پھر سامنے سے آتے ہوئے بچوں کے جلوس میں تارا نے منّو کو دیکھا۔

"ارے ——— !" اس نے گھبرا کر کہا "بھلا اتنے چھوٹے بچوں کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔" منّو کو کیا پتا کہ وہ کس لیے جمع ہوئے تھے، کیا کرنے والے تھے، کیا کر رہے تھے۔ اس ساری سکیم میں کہیں نہ کہیں غلطی رہ گئی تھی "ساری سکیمیں یونہی فیل ہوتی ہیں۔" اس نے کانپ کر سوچا "کوئی نہ کوئی ضرورت سے زیادہ جذبہ دکھاتا ہے، ضرورت سے زیادہ ہوشیاری، ضرورت سے زیادہ تگ و دو اور کوشش وہ گھبرا کر اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھ رہی تھی "آدھی سے زیادہ آبادی تو بچے ہی تھے۔ بڑے یا سمجھ دار، ناسمجھ یا جیسے بھی ہوں۔"

ہائی سکول کی ساتویں جماعت یونیورسٹی والوں کے جذبات کو کیا سمجھ سکتی تھی مگر ظاہر ہے کہ ان بچوں کو یہاں تک لایا گیا تھا۔ ہنستے ہوئے گول مٹول چہرے جو چیزوں کے لیے ضد کرتے تھے اور بات بات پر روتے تھے۔

"بھگوان کرے منّو کو کچھ نہ ہو۔" تارا قدم بڑھاتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں یہ سارا جلوس اس کے لیے ایک دم زندہ ہو گیا تھا۔ عجیب بات ہے ان سارے چہروں میں اب جان پڑ گئی تھی۔ گلاب کے سے چہرے معصوم، دیواروں پر سے گیند کے لیے جھانکتے ہوئے شور مچاتے۔ تنگ کرتے اور بھاگتے ہوئے یہ بچے، اسے رہ رہ کر ان سب پر پیار آ رہا تھا جیسے وہ ان سب کی ماں ہو، ایک گمبھیر ذمہ داری کا احساس تھا۔ یوں لگتا تھا اگر کسی کو تیز دھوپ نے چھو لیا تو وہ پریشان ہو جائے گی۔

لڑکیوں اور عورتوں کا جلوس گزر گیا اور پچھلے جلوسوں میں یہ سارے چہرے پھر گڈمڈ ہو گئے۔ چمکتا ہوا دن تارا کی آنکھوں میں اتر آیا "قوموں کو اپنا حق منوانے، اپنا حق لینے کے لیے یونہی کوشش کرنا ہوتی ہے جو"

"بھلا دنیا میں انصاف کیوں نہیں ہے؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔
"انصاف کب کب رہا ہے کہاں کہاں رہا ہے؟" اس نے پھر اپنے ہی کو پوچھا
"تم جو تاریخ پڑھاتی ہو، تم ہی بتاؤ آدمیوں نے آدمیوں کا حق کب چُپ چاپ دے دیا ہے؟" اور پھر اس کے دماغ میں جانے کون کون سے نقشے گھوم گئے۔ زمانے اُس کے ساتھ چل رہے تھے، وہ زمانوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ "کیا بے کار کا خیال ہے" اُس نے سر کو جھٹک دیا۔

"ادی ناش ہم سب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔"
"افوہ! تو گویا یہ ساری بھری ہوئی سڑکیں محض ادی ناش کی وجہ سے ہیں" سارے کالجوں نے اپنے اپنے جھنڈے بنا رکھے تھے اور پُر غرور، پُر اعتماد قدم ایک ساتھ اُٹھ رہے تھے۔

"لوگ کہتے ہیں تعلیم کا مقصد نہیں رہا" لوگ کتنا غلط کہتے تھے۔
وہ اس بڑے چوک میں پہنچ گئے تھے اور انھوں نے جھنڈے ایک قطار میں جمع کر دیے تھے۔ ان جھنڈوں کو اٹھانے والوں کے دِل امّیدوں سے پُر تھے اور خوش تھے جیسے کسی بڑی جنگ کے لیے یہاں جمع ہوئے ہوں۔ یہ جنگ ہی تو تھی۔
تارا کا جی چاہا وہ مُنّو سے پوچھے "یہاں کیوں آئے ہو؟"
پھر وہ سب قومی ترانہ ایک ساتھ گا رہے تھے۔ گانا، جس میں اپنے ہونے کا غرور، اپنی آن بان شان کا ذکر تھا۔ ترانہ، جس میں جوش اور ولولہ تھا اور جس میں ایک ہونے اور ایک رہنے کا وعدہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آکاش اور دھرتی چُپ ہو کر اس لے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ پولیس والے دم سادھے سُن رہے تھے۔ فضا جھنڈوں کے رنگوں اور آوازوں سے بھری تھی۔ ایسی خموشیوں کی دھمک سے جو آنے والی ہو اور جن کی چاپ آتما میں سنائی دے۔
جانے کس نے ایک بوتل پھینکی جو بچوں کے سروں پہ سے ہوتی ہوئی ایسی سپاہی کے جا لگی۔ سپاہی نے چیخ ماری اور سر کو پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ بچے کھکھلا کر

ہنسے اور جلوس کی سنجیدگی قہقہوں کے شور میں ڈوب گئی۔ لڑکے سیٹیاں بجانے لگے اور اچک اچک کر ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ کر سپاہی کو چڑھانے لگے، دھکم دھکا کرنے لگے

دھوپ پیلی ہو چلی تھی کہ پولیس والوں نے سخت غصے میں سیٹیاں بجائیں اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جانے کدھر سے پتھروں کی ایک بوچھاڑ ہوئی جیسے یک لخت بارش کا چھینٹا سب کچھ بھگو جاتے۔ سپاہی اپنا آپ بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ قہقہوں اور نعروں میں سیٹیاں بڑی ڈراؤنی لگ رہی تھیں اور بھری پُری سڑک شمشان کی طرح لگتی تھی جہاں چِتا کو بس آگ دکھائی جانے والی ہو۔

امن اور شانتی کا یہ جلوس، جانے اس کا کیا ہوگا۔" تارا کو مہیلا کالج کی لڑکیوں کی فکر تھی" بھگوان اب کیا ہوگا۔"

پھر گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک لمحے کو موت سے پہلے کا سناٹا ہو گیا۔

بچوں کے ہجوم پر گولی چلا دی گئی تھی۔ ڈر اور موت کے خوف نے ہر چہرے پر سے زندگی کھینچ لی تھی۔ پھر اپنے بچاؤ کے لیے بچے اِدھر اُدھر بھاگے جیسے پانی کا دھارا کوئی بند توڑ کر بہہ نکلے۔ اس لمحے تک سکون سے جھنڈے کو تھامے قومی ترانہ گاتے دُور سے آتے ہوئے نڈر، دلیر اور جذبے سے سرشار بچے چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے مانو ان میں سے ہر ایک کے پیچھے موت تھی۔

تارا نے کہا "اب کیا ہوگا، جانے اب کیا ہوگا!!"

وہ ہاتھ مل رہی تھی اور سروں کے اس دریا میں اکیلی ڈوب رہی تھی وہ بھاگ نہیں رہی تھی، کھڑی تھی جیسے چٹان ہو۔ گرنے کو بھلا جگہ ہی کون سی تھی۔ دہشت زدہ لڑکے اور لڑکیاں ایک دیوار کی طرح اس سے آکر ٹکراتے اور گزر جاتے۔ وہ گرنا چاہتی بھی تو گرنے کے لیے زمین کا ایک انچ ٹکڑا اسے نصیب نہ ہوتا۔ تیز دھارے دس سے لگ کر جھاگ کی طرح بکھر رہے تھے۔

پھر اس کے بازو پر کوئی گرفت مضبوط ہوتی گئی جیسے لوہے کا شکنجہ ہو۔ سرد انگلیوں نے اس کا بازو تھاما اور اس کے پتھر ہوئے قدموں میں جنبش ہوئی، کوئی اسے

اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ اس کا پلّو اس کے سر پر ڈھنپا تھا مگر وہ چل نہیں رہی تھی گھسٹ رہی تھی۔ کوئی طاقت اسے ہولے ہولے بڑے دھیرج سے اس بےپناہ چیختے بھاگتے لوگوں میں سے نکال رہی تھی۔

"جانے کدم کہاں ہو؟" اس نے گھبرا کر ارد گرد دیکھا۔ کیدار کو وہ پہچان ہی نہیں پائی ـــــ!

"تارا! میں کدم کو اس سڑک پار کی بلڈنگ کے پچھلے برآمدے میں کھڑا کر کے آیا ہوں۔"

پچھلے برآمدے میں ایک ستون کے ساتھ لگی کدم سسک رہی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں جیسے آندھی کے زور سے دو ٹوٹی شاخیں ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں۔ سیٹیاں بجتی رہیں، گولیاں چلتی رہیں۔ سناٹے کے جادو کو توڑنے کے لیے بچے چیختے رہے جیسے سائیں سائیں کرتی ہوا میں پھول شاخوں سے ٹوٹ کر گریں اور بگولوں میں گھومیں۔

وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی اور اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، وہ کچھ سن نہیں رہی تھی۔ دن غبار میں چھپ گیا اور پھر دن ڈوب گیا۔

لمبے راستوں سے اور ایسی سڑکوں سے جو اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی وہ انھیں گھر واپس لے آیا۔ منّو کی ماں نے آج دیوار پر سے جھانکا "تارا بی بی آپ نے کہیں منّو کو دیکھا ہے؟" اس کی آواز گھبرائی ہوئی، آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی، دہشت زدہ اور میٹھی ہوئی وہ نہایت بے چین تھی بار بار کتے کو پچکار رہی تھی جو بھونکتا اور سیڑھیوں پر لپکتا۔

"چپ ہو جا سیزر، بھگوان کے لیے مجھے کچھ سوچنے دے۔" تارا نے اسے بولتے سنا۔

وہ تھوڑی دیر میں پھر دیوار پر تھی "کدم بی بی میرا جی ہول رہا ہے۔"

کدم دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی "موسی میں نے منّو کو نہیں دیکھا۔ کہیں گیند

کھیلتے میں دُور نکل گیا ہوگا۔ کہیں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہوگا۔"

"سویرے کا گیا ہے، کہہ رہا تھا میں بھی جلوس میں جاؤں گا۔"

"جلوس میں جاؤں گا؟" کدم کو پہلی بار لگا کہ یہ گھبراہٹ اس کو بھی ہو رہی تھی مگر اس نے اس سے یونہی پوچھ لیا تھا۔

"چھوٹے بچّوں کا کیا کام تھا موسی" جانے اس نے یوں ہی کہا تھا یا انجان بن رہی تھی۔

"کیا اُس نے اِن ہنستے مسکراتے بچّوں کو نہیں دیکھا تھا؟" کدُم کی بات سُن کر تارا نے سوچا۔

"اس کے بابا اسے ڈھونڈنے گئے ہیں، سنا ہے گولی چلی ہے!" وہ یوں دیوار پر سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے بیل کا کوئی پتہ ان کی طرف لٹکا ہو۔

تارا نے اپنے کمرے کے اندھیرے میں طاقچے میں رکھی دیوی ماں کی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک کر کہا "ماں! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مُنّو گھر واپس آجائے؟"

کیدار، چاچا کے پاس بیٹھا تھا اور بابو پچھلے برآمدے میں آنند کو سُلانے کی کوشش میں زور زور سے لوریاں گا رہا تھا۔

رات بجھتے ہوئے تاروں کے دیے لیے ہولے ہولے یوں چلتی آئی تھی جیسے کوئی بڑھیا لاٹھی ٹیکتی، ایک ہاتھ میں ٹمٹماتا دیا پکڑے، جھکی ہوئی، دھول میں اپنے گرے ہوئے پیسے تلاش کرنے نکلے جیسے آنکھوں سے کچھ سجھائی نہ دے مگر وہ تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنے کی قسم اٹھائے ہوتے ہو۔

شیام داس تھکے ہارے سے آکر باپ کے برابر بیٹھ گئے۔

"کیوں بابا کچھ پتا چلا، کوئی کامیابی ہوئی؟" کدُم، صبح کے گئے شیام داس کے لیے جیتین کو چائے کا کہہ کر آئی تھی۔

"نہیں!" انھوں نے بیزاری سے کہا "پتا ہونے پر بھی کامیابی یقینی نہیں ہے، کوئی بات ہی نہیں سُن رہا۔"

"تارا کہاں ہے؟" انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"اوپر کمرے میں ہیں" کدم سویرے سویرے تھکی ہوئی تھی اور رات بھر جاگے ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ آدھی رات تک سب لوگ پھرتے رہے تھے، مُنو کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔

پولیس زخمی ہونے والوں کو گاڑیوں میں بھر کر ہسپتالوں میں لے گئی تھی اور ہسپتالوں پر پہرہ تھا۔ بچّوں کے والدین دیوانوں کی طرح پھاٹکوں سے سر ٹکراتے پھرتے تھے اور انھیں اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ روتی ہوئی مائیں سروں پر خاک ڈالتی ہوئی آتیں اور ایک ایک کی منّت کرتیں۔

"ارے میرے گڈّو کا پتا ہے؟ گوراسا رنگ ہے، بڑی بڑی آنکھیں ہیں، سنہرے بال ہیں!"

"ہائے رام! میرا پپو سانولا سا ہے، سیاہ بالوں والا، عام لڑکوں سے ذرا نکلتے قد کا، بھیّا، اے بھیّا سپاہی! ذرا ایک کر جانا، دیکھنا تو، ارے اسے تو میرے بنا چین نہیں آتا تھا، اب اِس بھیڑ بھڑکے میں کہاں ہوگا؟ اے بھیّا بھگوان کے لیے دیکھ تو دے، ارے اس کے تو سر میں ذرا سا درد ہو تو رونے لگتا ہے۔" اور وہ بے ہوش ہو کر گرنے والی تھی۔ ساتھ والے کسی نے اسے تھام کر پانی کے دو قطرے اس کے منہ میں ٹپکائے۔

"ہائے میرا دلجیت! میں واری جاؤں، دلجیت، جیت، جیت۔۔۔"
سننے والوں کو لگا اِن کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

سپاہی ان سب کو ڈانٹ کر بھگا رہے تھے۔ باپ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، بہنیں دہشت سے بھری آنکھیں لیے گھوم رہی تھیں، یونہی آوازیں دے رہی تھیں۔ لوگ سپاہیوں کے پاؤں پڑ رہے تھے اور وہ بہت لاپروائی سے بھاری بُوٹوں سے پُر شور آوازیں نکالتے ناک ہوا میں اٹھائے رائفلیں سنبھالے آگے پیچھے یہاں سے وہاں تک گشت کر رہے تھے جیسے سن ہی نہ رہے ہوں۔ کچھ رونے والوں سے

بحث کرنے میں لگے تھے۔

"جب سپاہیوں پر اینٹیں برسائی گئی ہیں اس وقت آپ لوگ کہاں تھے"

"اے بھائی ہمارے بچے تو ایسے نہ تھے۔ وہ تو کبھی گلی میں بھی کسی کے ساتھ نہیں جھگڑتے۔ جانے کس نے سپاہیوں پر زیادتی کی ہے"! بچاٹک سے سر ٹکراتی ایک ماں نے کہا۔

پھر کسی اور نے جواب نہ دیا۔ بھلا بحث میں کون الجھتا، جواب دینے کا ہوش کسے تھا؟ سارا شہر یوں سُن ہو گیا تھا جیسے درد نے کسی عضو کو بے کار کر دیا ہو، اس میں حرکت کرنے کی طاقت ہی نہ رہی ہو۔

یہاں وہاں سے پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ منّو کو ٹانگ میں گولی لگی تھی مگر وہ کہاں تھا؟

شیام داس اور دیوی دیال بابو جانے کہاں کہاں پھرتے پھرے تھے۔ کیدار اپنے طور پر الگ سے لگا ہوا تھا۔ تارا اور کدم ایک دوسرے سے بات کیے بنا بیٹھی رہیں۔ پھر دادا نے آواز دی "کدم اِدھر آؤ"۔

"راگھو تو ٹھیک سے ہے نا"! انھوں نے اپنے تکیے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"دادا وہ ٹھیک ہی ہوگا نا جیل میں ہے"۔ کدم نے دھیرے سے کہا۔

"پھر یہ تم لوگ چپ کیوں ہو؟ شیام داس کہاں ہے"؟ دادا آس پاس کی بے چینی سے متاثر لگتے تھے۔

تارا نے کدم کو اشارہ کیا جو شاید ارادہ کر رہی تھی کہ دادا کو ساری صورت حال سمجھائے۔

"کہیں کام سے گئے ہوں گے اور آجائیں گے۔ چلیے میں آپ کو اندر پہنچادوں" کدم نے ان کا بازو پکڑا۔

"مجھے لگتا ہے کوئی انہونی ہوئی ہے۔ ہواؤں سے لہو کی باس آتی ہے"۔ دادا اٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"برابر کے لان پر سے خشک پتّوں کو کسی نے جلایا تھا، اب دھواں تو نہیں تھا صرف جلی ہوئی باس تھی جو ہوا کے رُخ کے ساتھ آتی تھی مگر یہ لہو کی باس تو نہ تھی جانے دادا یہ کیوں کہہ رہے تھے۔" کدم ان کا ہاتھ اپنے کندھے پر ٹکائے جاتی تھی۔

دادا نے کہا "آجکل عجیب بے ڈھنگے سپنے آتے ہیں مجھے!" اور وہ بڑی اداس ہنسی ہنسے۔

"کیسے سپنے دادا؟" کدم نے ان کی بات کا جواب دینے کے لیے بات کی۔

"یہی کہ مہابھارت لڑی جا رہی ہے مگر لڑنے والے بچّے ہیں بڑے نہیں۔" وہ چپ ہو گئے۔

کدم نے ان کا بستر برابر کرتے ہوئے کہا "آپ کو راگھو کا خیال رہتا ہے اسی لیے ایسے سپنے آتے ہیں۔"

"راگھو بھی دیوانہ ہے بھلا جیل جانے کی کیا ضرورت تھی! اب انگریز چلا گیا ہے ہم لوگ آزاد ہیں، پہلے تو جیل جانا ضروری تھا اب کیا ہوا ہے؟" انھوں نے کدم کی طرف دیکھنے کے لیے اپنی بے نور آنکھیں اس کی طرف اٹھا دیں۔

"انگریز تو چلا گیا ہے۔" کدم نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "پر اور بھی تو کئی چیزوں کی ضرورت ہے!"

"ہوں!!— انھوں نے زور سے کہا "آدمی کی ضرورتوں کا تو کوئی انت ہی نہیں۔"

"ہے دادا، انت ہے۔" کدم نے اُٹھتے ہوئے کہا "اب آپ لیٹ جائیے نا بہت رات ہو گئی ہے آپ کو سو جانا چاہیے۔" پھر اس نے رضائی ان پر اوڑھا دی اور کمبل ڈال دیا۔ نیلا بلب جلا کر، کھڑکیوں کے پردے برابر کیے اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔

کیدار تخت پر تارا کے برابر بیٹھا تھا، دونوں باتیں کر رہے تھے۔

"کچھ پتا چلا؟" کدم نے مُنّو کے گھر کی طرف دیکھا جہاں لوگ جمع تھے اور پھر بھی

خاموشی تھی۔ اس کی ماں کو ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن دیا تھا مگر وہ گھڑی گھڑی کراہتی تھی۔ کسی کا بچہ رو رہا تھا اور عورت اُسے چپ کرانے کے لیے تھپک رہی تھی۔

"مُنّو کی لاش وہاں مردہ خانے میں پڑی ہے مگر یہ تو میں نے اپنے طور پر معلوم کروایا ہے۔" کیدار کہہ رہا تھا۔

"ہائے رام!" کدم وہیں تخت پر دوہری ہو گئی۔ "موسی! مُنّو نہیں رہا۔" اس نے اپنے دل کی جگہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے وہ آنکھیں یاد آئیں جو دیوار پر سے جھانکا کرتی تھیں۔ وہ آواز، جو اب اسے کبھی سنائی نہ دے گی۔

"کاکا کو ابھی معلوم نہیں ہوا ہوگا!" تارا نے اتنی عام طرح سے کہا کہ کدم کو لگا موسی نے مُنّو کی موت کا ذرا بھی اثر نہیں لیا۔

نیچے سُروں میں باتیں کرتے اسے تارا اور کیدار بڑے بے حس لگے۔

"کدم چُپ رہو!" تارا نے بات کرتے کرتے اسے ڈانٹا "ابھی اچھی طرح تو پتا نہیں چلا نا!" اس نے کیدار سے بات جاری رکھی۔

"جس ڈی ایس پی سے میں نے معلوم کروایا ہے وہ خود بہت خوفزدہ معلوم دیتا ہے۔ اس کا بھی کوئی رشتے کا بھتیجا شاید زخمی ہوا ہے۔ وہ بھی اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" کیدار نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔

کدم اٹھ کر بیٹھ گئی "منو کی لاش آپ نے خود نہیں دیکھی کیا؟"

"نہیں جبھی یہی تو بات ہم کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے وہ کوئی دوسرا لڑکا ہو مُنّو نہ ہو!" کیدار نے کدم کو بتایا۔

"بچے صرف ایک ہسپتال میں تو نہیں ہیں جانے کرن کہاں ہے۔" تارا نے اس سے نہیں، اپنے آپ سے بات کی۔

"بھگوان کرے منو صرف زخمی ہُوا ہو اور زندہ ہو!" کدم ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ وہ من ہی من پرارتھنا کر رہی تھی۔

"چھوٹے بچوں پر گولی چلانا کتنا بڑا ظلم ہے۔" کیدار نے کہا "اور جہاں اتنا ظلم ہوتا

بھو وہ حکومت زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتی۔"

"یہ کسی کے پروگرام میں بھی نہیں تھا کہ اینٹیں اور پتھر پھینکے جائیں"۔ تارا نے کہا

"ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جس پروگرام کے تحت کام کرنے نکلو اس سے زیادہ ہو جاتا ہے یا کم، سبھی کچھ ویسا تو نہیں ہو سکتا، جنگوں میں بھی ہر وقت پر فوجی اپنے طور پر خود سوچتا، پیچھے ہٹتا یا آگے بڑھتا ہے۔ اجتماعی سوچیں آخر اکیلے آدمی کی سوچیں بھی تو ہوتی ہیں"۔ کیدار نے سلجھانے والے انداز میں بات ختم کی۔

تارا نے پھر سوچا کہیں وہ سب اوی ناش کی فوج کے ہراول دستے تو نہیں ہیں؟

وہ ہنستے گلنار چہرے، وہ جوش سے اٹھتے ہوئے قدم، وہ دلوں کے عزم سے ماتھوں پر فتح کے نشان۔ سپاہی بھی ان سے بڑی اپنائیت کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ "بس شانتی سے چلتے جاؤ بچو!" ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

"ہم لوگ تو تمہارے ساتھ ہیں"۔ کسی دوسرے نے کہا تھا۔

اس جلوس میں ان کے رشتہ دار، ان کے اپنے بچے، بچوں کے دوست تھے اور وہ کسی کے دشمن نہیں تھے، قانون نے انھیں مخالف صفوں میں کھڑا کر دیا تھا۔

"ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا کہ گولی چلانے کا حکم کس نے دیا تھا"۔ تارا نے پوچھا۔

"میں اس لیمپ پوسٹ کے قریب کھڑا تھا جو سفید چوک میں ہے، بچوں کا جلوس آگے بڑھ کر، بس اس پوسٹ کے قریب آیا ہی تھا کہ گولیاں چلی ہیں۔ اپنا بچاؤ کرنے کے لیے کچھ بچے گھبرا کر اس پر چڑھ گئے تھے اور گولیوں کی زد میں تھے۔ پھر میں نے انھیں گرتے دیکھا اور سوچا کہ بس سب ڈھیر ہو گئے ہیں مگر ان میں سے چند اٹھ کر بھاگے اور ہجوم کے پیچھے چلے، بھاگتے رہے اور آس پاس کی عمارتوں میں چھپ گئے"۔ کیدار نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"کل دفتروں کا دن تھا نا، چھٹی تو نہیں تھی اور جلوس کو دیکھنے کے لیے لوگ دفتروں کی کھڑکیوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ لڑکے اوپر دیکھتے اور انھیں ہاتھ ہلاتے ان کو نیچے آنے کے اشارے کر رہے تھے۔ لگتا تھا کوئی بارات جا رہی تھی۔"

"ہاں —" تارا نے کہا "ہمیں کیا معلوم تھا اس کا انجام یہ ہوگا۔"

"اگر پتا ہو کہ آئندہ گھڑی کیا ہونے والا ہے تو آدمی سنبھل کر نہ چلے!" کیدار نے کہا "میں اب چلوں گا۔"

"سنیے کیدار بابو!— کدم نے کہا "کیا آپ نے نہیں دیکھا تھا کہ ان میں کتنے زخمی ہو گئے ہیں؟"

"بی بی، جو گرے تھے وہ پاؤں تلے آ گئے ہوں گے۔ جو لیمپ پوسٹ پر سے نیچے کودے یا گرائے گئے — جو کچھ بھی ہوا مگر وہ تو یوں تھا جیسے کوئی کنکر تالاب کے پانی میں پھینکا جائے۔"

"کنکر تالاب میں پھینکا جائے!" کدم نے دہرایا "اور آپ کہتے ہیں آپ نے ان میں سے بہتوں کو اٹھ کر بھاگتے دیکھا ہے۔"

"کدم تم بے فائدہ جرح کر رہی ہو۔ ایسی افراتفری میں آدمی ٹھیک سے کب دیکھ سکتا ہے!" تارا نے غصّے سے کہا۔

"موسی، میں بھی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ منّو کہاں ہو سکتا ہے۔" کدم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اب استادوں سے الگ پوچھا جائے گا کہ انھوں نے بچّوں کو سکول کے وقت میں کس طرح جلوسوں کے لیے نکلنے دیا!" کیدار پھر بیٹھ گیا۔

"کیا کیا نہ انکوائریوں کے چکّر چلیں گے۔" تارا نے بے دلی سے کہا "جانے کون کون اور اس کی لپیٹ میں آئے۔"

"جوان خون کا بہاؤ، پہاڑی ندی کا بہاؤ ہے۔ پُر شور اور اپنے ساتھ پتھروں کو بھی لے جانے والا، کوئی شے اس راہ میں نہیں رک سکتی۔" کیدار نے اپنے اردگرد دیکھا۔

"یہ سیلاب جانے کب سے اس انتظار میں تھا۔" تارا اٹھتے ہوئے بولی۔

کیدار اپنا تھیلا اُٹھا کر برآمدے سے نیچے اُتر گیا۔

پھاٹک پر شیام داس بھی کیدار کو مل گئے اور وہ دونوں واپس آ گئے۔

کدم نے باپ سے پلٹتے ہوئے کہا "آپ منو کو لاتے ہیں ؟"

انھوں نے بہت بے زاری سے اس کے بازو اپنے گرد سے ہٹاتے ہوئے کہا "یہ اتنا آسان نہیں ہے اور شہر میں چونکہ بہت گڑبڑ ہے اس لیے کرفیو لگنے والا ہے میں اسی لیے واپس آ گیا ہوں ۔"

"کرفیو لگنے والا ہے !" کیدار ایک دم کھڑا ہو گیا "اب میں چلوں گا ۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا سائرن کی کرخت آواز گونجی جیسے موت کی چنگھاڑنے اور چیخنے والی صدا ہو اور پھر موٹر کے ہارن سنائی دیے اور لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرتی لاریاں شور مچاتی ہوئی گزر گئیں ۔

فون کرنے کے بعد کیدار نے کہا "دیوی دیال آ گئے ہیں کیا ؟"

شیام داس اٹھتے ہوئے بولے "وہ تھانے میں بیٹھے تھے ۔ پولیس والوں کا رویہ اتنا دل توڑنے والا ہے ، سدا سے ایسا ہی ہوتا ہے مگر اب تو حد ہو گئی ہے ۔"

"کیا ہوا بابا ؟" کدم اندر جاتے جاتے پلٹ آئی ۔ وہ مہمان والے کمرے میں کیدار کے لیے بستر ٹھیک کروانے کے لیے جا رہی تھی ۔

"کچھ نہیں !" شیام داس پھر بیٹھ گئے "آدمی بڑے حوصلے سے چلتا رہتا ہے اچانک اسے بہت ڈر لگنے لگتا ہے ۔ خوف اور یہ احساس کہ تم جہاں ہو وہاں محفوظ نہیں ہو ۔ جانے ساری دنیا میں ایسا ہے کہ ہمارے ہاں ہی ایسا ہوتا ہے افسروں کا رویہ بگڑا ہوا ، سپاہیوں کا طریق حاکمانہ ، کوئی کسی کی بات ہی نہیں سنتا ۔" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر بولے "میرا تو اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا ۔"

کیدار سر جھکائے بیٹھا تھا اور اپنے گرد سے بھرے جوتے کے سرے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔

تارا نے کہا "کاکا کوئی جا کہاں سکتا ہے ۔"

"ہاں ! کہاں جایا جا سکتا ہے !" شیام داس اٹھے اور ہاتھ اپنے پہلوؤں پر مار کر کہنے لگے "کہیں بھی تو نہیں جایا جا سکتا ۔ جس دھرتی سے ہمارا سمبندھ اتنا گہرا ہے اسے

چھوڑ کر کوئی کہاں جائے گا؟"

کیدار نے کہا "آپ دھرتی کے سمبندھ کو نہ سوچیے اور نہ جانے کی بات کے لیے ساری دنیا میں بھی بے چینی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ بے چینی کا ایٹم بم پھٹ گیا ہے اور سارا زمانہ اس کے اثر میں ہے۔"

تارا بڑی اداس ہنسی ہنس کر بولی "یہ زمانہ ایٹمی تجربوں کا ہے نا؟"

اس کی طرف کیدار نے یوں مڑ کر دیکھا جیسے اس سے پہلے اسے اس کے وہاں ہونے کا پتا ہی نہ ہو اور اچانک اس کے دل میں روشنی ہوئی۔ اُسے میوزیم کا وہ انمٹ لمحہ یاد آ گیا، وہ دوپہر جو کبھی نہیں ڈھلے گی جو اس کی رگوں میں خون کی روانی تیز کر دیتی ہے اور اس نے سوچا "آج ساری مخالف طاقتیں اور زمانے جمع ہوئے ہیں کہ مجھے اور تارا کو پھر ایک چھت کے نیچے اکٹھا کر دیں۔"

کدم نے آ کر کہا "آپ اگر آرام کرنا چاہیں تو میں نے بستر لگوا دیا ہے۔" وہ کیدار سے مخاطب تھی۔

"بڑے کام کی بیٹی ہے۔" شیام داس اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ پتا نہیں وہ اچانک اتنے جذباتی کیوں ہو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے انھیں رُویا یاد آ رہی ہو یا جانے وہ دل کی اداس سوچوں کو کسی اور طرف منتقل کرنا چاہتے ہوں یا راگھو کے لیے اداس ہوں۔

دیوار پر سے جھانک کر چھنو نے کہا: "کدم دیدی! کیا آپ کے بابا آ گئے ہیں؟"

"ہاں چُنو!" کدم بھاگ کر دیوار کی طرف گئی۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا "سنو! ماں کیسی ہے؟"

"ماں تو ابھی تک سوئی پڑی ہے۔ میرے چاچا پوچھ رہے ہیں آپ کے بابا کو" چُنو نے اُسی طرح چھپتے چھپتے کہا۔ وہ کدم کو چمکتی ہوئی آنکھوں والا خرگوش لگا جو ایک لمحے بعد بھاگ کر پتوں میں چُھپ جائے گا۔

"تمھارے بابا کو وہ تھانے میں چھوڑ آئے ہیں۔ رات رفو ٹنگ گیا ہے۔ جلنے

وہ کب آسکیں" کدم نے بھاری دل سے کہا۔

"کرفیو کیا ہوتا ہے دیدی؟" چنو جب باتیں کرنے پر آتا تو کیے ہی جاتا تھا۔

"باہر نہیں جا سکتے نا! پولیس پکڑ لیتی ہے" کدم مڑتے ہوئے بولی۔

"دیدی! بھیّا کو بھی تو پولیس نے پکڑا ہے نا اور منّو کو بھی، وہ کرفیو میں باہر گئے ہوں گے" کدم واپس آگئی۔

شیام داس کیدار سے کہہ رہے تھے "آپ کہتے ہیں یہ دنیا کی عام بے حسی ہے، مگر دنیا کے کسی کونے میں بھی پولیس اتنی مغرور اور لاپرواہ نہیں ہے، میں تو آدھی دنیا گھوم چکا ہوں"

ہم ابھی بن رہے ہیں اور بنتی ہوئی قوموں کا مزاج پختہ نہیں ہوتا۔ ہماری پولیس کا رویہ بھی کچا ہے، ہو سکتا ہے کہ جب بن چکیں تو یہ حالت نہ رہے" تارا بولی

شیام داس ہنس کر بولے "تارا! کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تمھارے خیال میں قوم کا مزاج بننے کے لیے کتنا وقت چاہیے"

"کاکا صدیاں لگتی ہیں" وہ سکڑ کر تخت پر بیٹھی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور بھیگتی رات کے ساتھ اس میں نمی آتی جاتی تھی۔ برآمدے کے بھاری پردے چھٹے ہوئے تھے مگر لگتا تھا آسمان تلے بیٹھے ہیں۔

"صدیاں" کیدار نے اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ وہ مذاق کر رہی تھی۔

شیام داس کہنے لگے "میں اب آرام کروں گا، تم لوگ بحث میں اُلجھے رہو"

اور وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تارا نے آنکھیں اٹھا کر کیدار کی طرف دیکھا "آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

"نہیں"——کیدار کرسی میں دھنس کر بیٹھ گیا۔

"اس میں یقین نہ کرنے کی کوئی بات نہیں۔ دو سو سال میں ہمارا مزاج ایسا بنا ہے۔ اپنوں سے نفرت، اپنوں پر ظلم، اپنی روایتوں سے بیزاری اپنی ہی

باتوں پر ہنسنا، یہ سب کیا دس بیس سال میں آگیا ہے؟"

"ہاں تم تاریخ پڑھاتی ہو اور تم سے بحث کرنا بے کار ہے۔" کیدار نے اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

تارا نے آنکھیں نیچی کرلیں۔ اسے لگا گہرے پانیوں میں اس کی کشتی ڈول رہی ہے۔

کرفیو ختم ہوا تو وہ منّو کو گھر لائے۔ انھوں نے کہا تھا "اسی وقت اس کو شمشان لے جاؤ، رونے، شور مچانے اور واویلا کرنے سے آپ لوگوں کا ہی نقصان ہوگا۔ ہم لاش نہ دیتے مگر بچّہ ہے نا اس لیے دے رہے ہیں۔"

دیوی دیال نے بیوی سے کہا "بھاگوان! رونے کو ایک عمر پڑی ہے اور میں جن کوششوں سے اسے لایا ہوں اگر تمھیں معلوم ہوں تو تم اپنی آواز کو سینے میں دبائے ارتھی کے ساتھ گنتی کے آدمی تھے۔ شہر میں پھر دفعہ ۱۴۴ لگ گئی تھی اور وہ سب دو دو تین تین ہو کر ذرا فاصلے سے جا رہے تھے اور دیوی دیال یوں چل رہا تھا جیسے کسی فتح کا جلوس لیے جا رہا ہو۔

"اچھا تو منّو نہیں رہا" کدم ہولے ہولے آنسو پونچھ رہی تھی "منّو لگتا ہے کبھی تھا ہی نہیں۔ خوشبو کا جھونکا تھا کہ آیا اور نکل گیا، پھول کی طرح شاخ سے گرا اور ہوا اسے اڑا کر لے گئی۔ وہ آنکھیں جو دیوں کی طرح روشن تھیں کسی نے پھونک مار کر انھیں بجھا دیا وہ آنکھیں جو روشن رہتیں تو جانے کیسے کیسے سپنے دیکھتیں۔ روپہلی دھوپ کے دھاکے نے اسے نگل لیا۔"

ساری عورتیں چپ تھیں، بچے آنگن میں رینگ رہے تھے، گھٹنوں چل رہے تھے، رو رہے تھے، جھگڑ رہے تھے، لکڑی کے گھوڑوں پر سوار تھے اور انھیں دوڑاتے پھرتے تھے، مائیں گودیوں میں لیے دودھ پیتے بچوں کو تھپکتی سوچ رہی تھیں "جانے ان کو کیسا زمانہ دیکھنے کو ملے۔" یہ اُداسی وقتی نہیں تھی۔

تارا نے دل میں کہا "دن اسی طرح ہے روشن اور چمکتا ہوا اور سورج آنچ دیتا

ہوا۔ پھُول اور بیلیں ہوا میں جھومتے ہیں۔ فوّارے کا پانی اچھل رہا ہے اور اوپر جا کر نیچے آ رہا ہے، نہ بھگوان کو پرواہ ہے کہ منّو نہیں رہا اور نہ دُنیا کو، ہائے۔" اس کا دِل اوپر کی طرف آ رہا تھا "میں کیوں منّو کو ڈانٹتی رہتی تھی؟ کبھی جو میں نے اس سے ڈھنگ سے بات کی ہو اور اب وہ نہیں ہے تو میں اس سے بُرا یا بھلا کسی طرح کا سلوک بھی نہیں کر سکتی۔ بیتے وقت کو بھلا کوئی واپس لا سکتا ہے؟ اور یہ وقت ہی تھا جس کے جادو میں وہ تھے، عجیب ہے منّو کے گھر بیٹھے اسے کیسے پتا چلا تھا کہ وہ سب آکاش تلے قید تھے اور وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ اس کا دل یوں گھبرا رہا تھا جیسے وہ کسی کال کوٹھڑی میں ہو۔

رات وہ اور کیدار بیٹھے رہے تھے۔ کدّم وہیں تخت پر اس کے برابر میں لیٹ گئی تھی اور اپنے چادرے میں لپٹی بہت بے بس لگ رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ یک لخت چُپ ہو گئے۔ اس مرتی مارتی پریشان حال گھڑی میں انھیں اپنے اپنے وجود کا بے پناہ احساس ہُوا تھا اور تارا کو اپنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے اپنی حدوں کا اپنے بڑھنے کا، اپنے رکنے کا معلوم تھا "میں اپنے آپ کو کس بے پناہ اذیت میں مبتلا کیے ہوتے ہوں۔" وہ سوچ رہی تھی۔

کیدار نے اپنے جی میں کہا "کاش ہم دس پندرہ سال پہلے، بیس سال پہلے ملے ہوتے پر اب وقت بیت چکا تھا۔" وہ وقت کا شکار ہو چکے تھے اور بھاگ نکلنے کی ساری راہوں پر پہرے تھے۔

رات کی آوازوں میں ڈوبا پچھلے پہر کا چاند نکلا۔

"سردیوں کی چاندنی اور غریب کی جوانی بے کار جاتی ہے۔" تارا کو جانے یہ کس کی سنائی یہ کہاوت یاد آئی۔ وہ تخت سے اٹھی تو کیدار بھی اٹھا مگر وہ ننگے پاؤں اس کے برابر سے گزر کر پردہ اٹھا کر دالان میں اتر گئی۔ زمانوں پہلے سنے ایک گیت کے بول اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی اس گھٹن سے چھٹکارا پانے کیلئے گنگنائے مگر گونج لفظوں میں ڈھل نہ سکی صرف اس گیت کا مطلب اسے یاد آ رہا کچھ یوں:

میں نے اپنے دنوں کا سکون تم کو دے دیا ہے
رات کو تو میرے لیے چھوڑ دو
کہیں نہ کہیں ہر شے کا انت ہے
اندھیکار میں تو آدمی اپنے ساتھ اکیلا ہوتا ہے
پھر تمہاری آواز اس اندھیکار میں سے کیوں دو دھاری تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہے
کیا تمھارے دوار پر نیند کی بانسری نہیں بجتی
کیا تمھاری چھت کے گنبدوں پر ستارے نہیں چڑھتے
کیا پھول تمھارے باغ میں شاخوں سے نہیں کودتے
تم مجھے کیوں پکارتے ہو
بے چین یادوں کے ناطے مجھے کیوں بلاتے ہو
محبت کی اداس آنکھوں کو باٹ تکنے اور رونے دو۔
اکیلے گھر میں دیوا جلتا رہے۔
میں اپنے خوابوں کو پیچھے چھوڑ کر تمھاری پکار سنتی ہوں میں آتی ہوں۔

وہ فوارے کے کنارے بیٹھ گئی اور کنول کے بڑے بڑے پتوں پر چمکتے پانی کے قطروں کو دیکھتی رہی جو موتیوں کے سے روشن تھے اور انجانے دیسوں کی طرف جانے والے مسافروں کی طرح ڈولتی ہوئی ناؤں میں چپ چاپ بیٹھے تھے، ان کی منزل ابھی دور تھی۔

کسی گدھے کی ڈھینچو، ڈھینچو سنائی دی پھر کہیں مرغ زور سے بولا۔ کوئی کتا بھونکا۔ درخت کی گھنی شاخوں میں اُلو نے ہانک لگائی، سوئی سوئی چڑیاں نیند میں ڈر کر چوں چوں کرنے لگیں اور پھر خاموش ہو گئیں، آکاش پیلاہٹ میں اپنے ستاروں سمیت روشن، جاگتا ہوا اور کچھ سنتا ہوا لگنے لگا۔ چاند بے آواز قدموں سے تیز تیز چل رہا تھا جیسے اسے کہیں جانے کی جلدی ہو۔

اب رُوپا نہیں ہے تو دنیا اسی سکون سے ہے۔ آدمی کے ہوتے نہ ہوتے

سے کوئی فرق نہیں پڑتا" تارا نے سوچا اور شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ مر جائے، منو نہیں ہے تو کیا کچھ رک گیا ہے، بھلا سب کچھ اسی طرح سے ہے اور اسے یاد آیا کہ منو کی ماں بے ہوش تھی اور دیوی دیال ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے اور وہ سب بہت سوگوار تھے، بہت ہی۔

"اچھا ہی ہے راگھو جیل میں ہے۔" کدم اٹھ کر بیٹھی تھی اور کیدار سے باتیں کر رہی تھی۔

"آجکل تو دوسری گھڑی کا پتا نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی سنا ہے سکول اور کالج بند ہو رہے ہیں اور لڑکے یہاں اکٹھا ہو رہے ہیں" کیدار نے اسے سنایا۔

"ارے مجھے تو معلوم ہی نہیں۔" تارا نے تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اسے فرش کے پاس بیٹھے یک بخت سخت ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی اور پاؤں سُن ہو گئے تھے اب وہ کدم کے چادرے کو ٹھنڈے پاؤں سے لپیٹے انھیں ہاتھوں سے مسل رہی تھی

"آپ کو بھی ٹھنڈ محسوس ہونے لگی ہے" کیدار نے کہا۔

"کیوں میں کیا انسان نہیں ہوں" تارا نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں!" کیدار نے نہایت انجان بن کر بہت سادگی سے کہا "آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کوئی کمزوری کبھی چھو ہی نہیں گئی۔ ٹھنڈ اور آزردگی اور دکھ آپ کے پاس سے نہیں گزرے ہوں گے۔"

"ہاں!" تارا کا دل اندر ہی اندر کانپ گیا۔ اس نے سانس روک کر اپنے سے کہا "اب کیدار بابو بہت بڑھتے جا رہے ہیں۔" پر یوں اُس نے کیدار کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

"آپ موسی کو کیا جانتے ہیں" کدم نے کہا "ذرا ذرا سی بات پر تو ان کی آنکھ بھر آتی ہیں کسی کو روتا دیکھ کر رونے لگتی ہیں۔ کیا آپ کو یہ ایسی کٹھور دکھتی ہیں؟ یوں ہمیشہ منو کو لیکچر دیا کرتی تھیں، پر اب......" کدم کی سانس اکھڑ گئی آنسوؤں

سے اس کا گلا بند ہو گیا۔

سویرے دو گھنٹوں کے لیے کرفیو کھلا اور جلدی جلدی منّو کو شمشان لے جایا گیا

مجسٹریٹ نے کہا تھا "آپ پہلے اس لکھے پر دستخط کریں۔

دیوی دیال نے کہا "آپ جس کاغذ پر مرضی دستخط کروالیں چاہے وہ میری پھانسی کا حکم ہی کیوں نہ ہو مگر مجھے میرا بچہ دے دیں۔"

"آپ ہمیں اتنا ظالم سمجھتے ہیں۔ قانون آخر قانون ہے، اس کی عزت کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔" مجسٹریٹ گڑبڑا کر میز پر اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔ پھر اس نے کہا "کیا آپ انسپکٹر پولیس سے لکھوا کر لاتے ہیں؟"

"انھوں نے ہی ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔" دیوی دیال کے بازو اس کے پہلوؤں پر لٹک گئے۔

"تو پھر آپ اُن کا لکھا لائیے۔" مجسٹریٹ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا لکھوا کر لائیں؟" دیوی دیال کا چہرہ مایوسی سے سیاہ ہو گیا تھا۔

"قانون کے مطابق وہ جو کچھ لکھ کر دیا کرتے ہیں۔ مجرموں کی لاشیں جب ان کے ورثا کے حوالے کی جاتی ہیں۔" مجسٹریٹ نے دیوی دیال کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔

"میرا بچہ مجرم نہیں تھا وہ گولی لگنے سے مرا ہے۔" دیوی دیال نے کہا۔

"اگر آپ اسی طرح بحث کرتے رہے تو لاش نہیں مل سکتی۔" مجسٹریٹ پھر میز کے کاغذ دیکھنے لگا۔

شیام داس نے دیوی دیال کا بازو پکڑا اور چپ چاپ موٹر میں آکر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر نے پُرغرور نظروں سے بہت اکڑ کر ان کی طرف دیکھا اور کہا "ڈاکٹر اگر لکھ دے کہ یہ موت حادثاتی تھی تو ہم آپ کو سرٹیفکیٹ دے دیں گے۔"

دیوی دیال خالی خالی نظروں سے اپنے سامنے دیکھتے رہے۔

شیام داس کہنے لگے "بھیّا اس طرح اگر تم بے ہوش ہو کر گر پڑو تب بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر کے ملنے میں بہت وقت لگ گیا۔ وہ شاید رات بھر کا جاگا تھا اور ڈیوٹی پر پہرہ دار انھیں اندر نہیں جانے دیتا تھا پھر اُسے دس روپے کا نوٹ تھما کر شیام داس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔

آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکل کر ڈاکٹر نے بڑی تلخی سے کہا "ہم بھی انسان ہیں" پھر شیام داس کی طرف دیکھ کر طنزاً کہا "کیا حکم ہے؟"

شیام داس نے کہا "زخمی ہونے والوں میں سے رات ایک بچہ مر گیا ہے۔ اس کے لیے سرٹیفکیٹ جاری کریں تو لاش مل سکتی ہے۔"

ڈاکٹر کچھ دیر کھڑا سر کھجاتا رہا پھر اس نے رات کی ڈیوٹی والی نرس کو بلوایا جو سوتے میں سے اٹھائی گئی تھی اور بہت ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا "دیکھیے آپ کو آدھ گھنٹہ انتظار کرنا ہوگا۔"

شیام داس بولے "صاحب دو گھنٹے کے لیے تو کرفیو کھلا ہے، آدھ گھنٹہ یوں گیا تو باقی وقت اسے شمشان تک لے جانے کا کہاں سے آئے گا؟"

ڈاکٹر نے کہا "آپ لوگ ابھی تک مذہب کے چکروں میں ہیں اور دنیا کہاں کی کہاں نکل گئی ہے۔ امریکہ اور روس نے ایٹم بم بنا لیا، جانے کیا کیا ہو رہا ہے اور ہمارے ہاں ابھی تک شمشان بھومی اور پرانی رسموں پر یقین کیا جاتا ہے۔"

وہ چپ ہو گیا تو نرس نے کہا "لیجیے یہ کاغذ ہے اور یہ اس بچے کا چارٹ ہے۔"

ڈاکٹر دیر تک چارٹ دیکھتا رہا پھر شیام داس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "آپ اس بچے کے باپ ہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب میں سرٹیفکیٹ لینے آیا ہوں۔" شیام داس بہت مشکل سے اپنے کو قابو میں رکھے تھے۔ نرس اور ڈاکٹر دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ آخر کاغذ پر انھوں نے لکھ دیا کہ "یہ موت حادثاتی تھی۔"

تھانے میں بہت بھیڑ تھی جانے کس جرم میں لوگ لائے گئے تھے۔

انسپکٹر نے کاغذ کو نہایت لاپروائی سے دیکھا اور وہ دونوں صبر سے اسے دیکھتے رہے، یہاں تک کہ اس نے سرٹیفکیٹ دے دیا۔

مجسٹریٹ نے کہا "قانون کا احترام ہر شہری کا فرض ہے۔"

ہسپتال واپس آکر انھوں نے لاش لی، بیروں اور چپڑاسیوں کو روپے دیے جیسے وہ اسے تندرست لیے جاتے ہوں اور یوں ہنستا کھیلتا منو، چُپ چاپ کھسکتے جانے کے بعد گھر لوٹ کر آیا اور پھر گھٹے گھٹے سانسوں اور چیخوں کو روکتے ہوتے اس کی ارتھی پھر شمسان کو چلی۔

ماتم کے اس گھر میں موت کے ساتھ ساتھ تارا کو کیدار یاد آرہا تھا "عشق موت کی مانند زبردست ہے۔ اس کا کہنا کر لگتا ہے تم پر کسی شے کا اثر ہی نہیں ہوتا۔"

مُنّو کی ماں کو انھوں نے مستقل مارفیا دے رکھا تھا۔ کرفیو جانے کتنا لمبا ہو؟ اس لیے باقی عورتیں جلدی جلدی اپنے گھروں کو جا رہی تھیں۔ باہر سے انھیں پکارا جا رہا تھا۔ بچے رخصت ہوتے ہوتے رشتہ دار عجیب افراتفری تھی۔ کدم اور تارا بیٹھی تھیں قریب کی رشتہ دار عورتیں بھی جو انھیں جانتی تھیں آکر بیٹھتیں اور پھر کسی کام سے اٹھ جاتیں ڈرے ہوئے دل، سہمے ہوئے چہرے۔

چیتن نے پکار کر کہا "کیدار بابو جاتے ہیں بی بی!"

"اچھا" کدم نے اٹھتے ہوئے کہا "موسی، مَیں ان کی چیزیں الماری میں رکھ آئی تھی، ڈھونڈ رہے ہوں گے انھیں دے آؤں۔"

"چلو مَیں بھی چلتی ہوں" اور وہ دونوں باڑھ پھلانگ کر آئیں جہاں کیدار بہت بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ شیام داس ابھی دیری دیال کے پاس ہی بیٹھے تھے۔

کدم اس کا تھیلا لینے چلی گئی تو کیدار نے کہا "تارا، عجیب اتفاق ہے کہ ایسی بھیانک رات مجھے تمھارے ہاں گزارنا پڑی۔ تمھیں میری وجہ سے پریشان ہونا پڑا۔ ساری رات جاگ کر۔"

تارا نے کیدار کی طرف دیکھے بنا کہا "آپ کو ہماری وجہ سے پریشان ہونا پڑا۔"

کدم تھیلا لٹکائے آئی اور کہا "کیدار بابو اب بھاگ جایئے کرفیو لگنے میں بس پندرہ منٹ باقی ہیں"
پھر تارا نے اپنی اداس آنکھیں اٹھا کر کیدار کو دیکھا اور گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔
"کیا تم نے مجھے پکارا ہے"______
کیدار سر جھکائے پھاٹک میں سے نکل گیا اور لمورنگ صبح بجھتے ہوئے سورج اور دھندلکے میں چھپی ہوئے ہولے روتی رہی جیسے وہ نویلی دلہن ہو ______
راگھو جیل سے آیا ہے تو اس کا چہرہ جوش سے تمتایا ہوا اور غصے سے سیاہ ہو رہا تھا۔ شیام داس نے کہا "اب تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جس سے دوبارہ ہم سب مصیبت میں گرفتار ہو جائیں"
"آپ سمجھتے نہیں ہیں بابا" اس نے تارا کے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔
"کیا نہیں سمجھتا میں"______ شیام داس کو تارا نے اس سے پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔
"یہی کہ ہر کسی کو حق کی خاطر لڑنا ہے" وہ موڑھے سے اتر کر سیدھا اپنی میز کی طرف گیا، پھر اس نے تیزی سے دراز باہر نکال لے، ایک ایک شئے پھینکی اور لکڑی کے ڈبے کو جلدی سے کھولا، تارا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور فرش پر اخبار کو پڑھنے میں لگ گئی۔
کدم بھاگی ہوئی آئی یہ پوچھنے کہ "بھیا، کیا تم آلو کے پکوڑے کھاؤ گے؟" مگر جب اس نے اس کی شکل دیکھی تو پیچھے ہٹ گئی۔
"کیوں کیا ہوا ہے بھیا؟" اس نے اس کا سفید پڑا چہرہ دیکھ کر کہا۔
وہ کھڑا تھا بیٹھ گیا اور خالی ڈبے کو تکتا رہا۔
"کیا ہوا ہے اس ڈبے کو؟" کدم نے حیران ہو کر پوچھا۔
"کچھ نہیں"______ راگھو نے پورے جوش سے ڈبہ پھینکا جو کھلی کھڑکی میں سے

اتنے زور سے گرا کہ فوارے میں اس کے گرنے کی آواز تارا کو سنائی دی "غڑاپ"۔

"راگھو، کیا ہوا ہے؟" تارا نے کھڑکی سے پرے فوارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں موسی۔" وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ارے بس غصہ تو بھتیا جیل سے ساتھ لاتے ہیں۔" کدم نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

"چپ لڑکی۔" تارا نے برابر میں آکر راگھو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ کدم بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی تو تارا نے کہا "راگھو، آدمی بہت کچھ کھو کر جیتا ہے، جینا پڑتا ہے۔"

"نہیں موسی کوئی بات نہیں۔" راگھو نے اس کا ہاتھ کندھے سے الگ کرتے ہوئے کہا "بس ایسے ہی ذرا خیال آگیا تھا، جذباتی ہو گیا ہوں۔" وہ الماری میں یونہی منہ دیئے کتابیں اوپر نیچے کر رہا تھا، جانے وہ رو رہا تھا۔

تارا ذرا دیر کو رکی پھر وہ بھی رسوئی میں چلی گئی جہاں چیتن اور کدم جانے کیا کچھ پکا رہے تھے اور چیتن ہنس رہا تھا "آج رات تو ہم ناچیں گے بھیا کے گھر آنے کی خوشی میں۔"

"نہیں نہیں ناچنے اور گانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" تارا نے کہا "منو کی ماں ذرا تو اب ہوش میں رہنے گی ہے۔ بھلا دیوار سے دیوار تو ملی ہے، ہم اپنے گھر میں یہ سب خوشی کیسے کر سکتے ہیں؟ تم لوگوں کو تو زور سے ہنسنا بھی نہیں چاہیے، دوسرں کے دل کا خیال کرنا اچھی بات ہے۔"

کدم نے میدے میں سنے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے بالوں کی ایک لٹ سر جھٹک کر پیچھے کی اور تارا سے کہنے لگی "موسی، مجھے اپنی خوشی میں اس بات کا خیال تو رہا ہی نہیں۔"

"راگھو کی اور منو کی تو خاصی دوستی تھی۔ اب اسے پتا چلے گا تو کتنا دکھی ہوگا۔" تارا نے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا جی چاہا کہ دیوار کے پار خوب جھگڑے اور شور کی آواز اسے پھر سنائی دے۔ گیند کی ٹپ ٹپ پھر ان کے گھر چھن سی ہو،

کوئی شے ٹوٹے، گیند اچھل کر باورچی خانے میں آئے، ساری چیزیں کرچیں بن جائیں بکھر جائیں، دیوار پر سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانکیں اور وہ اسٹول پر سے اُٹھ کر جائے، کان پکڑ کر منو کو لائے اور اپنا لیکچر شروع کرے۔ مگر دیوار کے اُس طرف خاموشی تھی، بے وقت کوئل کُوہُو، کُوہُو بول رہی تھی۔ بھگوان کیدار اور اس کا دل دُھک دُھک کر رہا تھا۔ پتا نہیں یہ بے وقت کوئل کیوں بولتی ہے؟

وہ دونوں میٹنگ سے تھک کر گھر لوٹے۔ کیدار اسے پہنچانے آیا۔ مہینوں سے یہ ہوتا تھا وہ اُٹھتی تو وہ بھی اس کے ساتھ آتا۔ دونوں کدم کے ہاتھ کی بنی چائے پیتے اور شیام داس کو اپنا آئندہ کا پروگرام بتاتے۔ شیام داس اب بڑے رودا ہو گئے تھے۔ وہ راگھو سے یہ کہنے کے باوجود کہ یونیورسٹی کے ناٹک اب ختم ہونے چاہئیں امتحان کا زمانہ آگیا ہے۔" برابر اس کی باتیں سنتے، اس سے پوچھتے اور یہ انتظار کرتے رہتے کہ وہ خود کچھ بتائے مگر راگھو کسی سے کھل کر بات ہی نہیں کرتا تھا۔ گھر آتا تو کمرے میں گھسا رہتا۔ اسے سدا کہیں نہ کہیں جانے کی جلدی ہوتی۔ کبھی کتابیں لیے جاتا ہے، کبھی فائلیں لا رہا ہے۔ سائیکل برآمدے کی سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی رہتی چیتن اور بابو اسے ہٹا نہیں سکتے تھے۔

دادا کہتے "راگھو! ارے باؤلے کبھی تو میرے پاس بھی دو گھڑی کو بیٹھا کر۔"

سائیکل پر چڑھتے ہوئے کہتا "دادا بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر بہت وقت ہوگا، آپ کے پاس سے ہٹوں گا نہیں۔" اور زنّاٹے سے سائیکل پھاٹک سے نکل جاتی۔

تارا نے کہا "چاچا! جوان ہوتے لڑکے بھلا کہیں چین سے ٹک کر بیٹھ سکتے ہیں، خون میں اتنی گرمی ہوتی ہے۔"

کیدار نے اس کی طرف دیکھے بنا زیر لب کہا "خون سبھی کی رگوں میں گرم ہوتا ہے۔"

"آپ نے کیا کہا؟" کدم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "میں نے سنا نہیں۔"

وہ چائے پیالیوں میں ڈال رہی تھی۔

"تم نہ ہی سنو تو اچھا ہے۔" کیدار اس کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔

جب کیدار ہنستا تو تارا کا دل ڈول جاتا۔

"اچھا اب آپ ایسی ایسی باتیں بھی کہنے لگے ہیں جو میں نہ سنوں تو اچھا ہے"

کدم بھی ہنس دی۔

تارا نے کہا "ان کی باتیں چھوڑو، میٹنگ سے آتے ہیں نا، آج میٹنگ میں بہت جوش رہا یہ بہت لمبی تقریریں کرتے رہے ہیں۔"

"آج کیا کچھ ہوا؟" شیام داس بھی کونے سے اٹھ کر چائے کی میز کے قریب آگئے۔

"کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔" کیدار کرسی سے اٹھا۔

"ارے بھئی بیٹھے رہیے نا، میں اور کرسی منگوائے لیتا ہوں۔" انھوں نے پیالی ہاتھ میں اٹھالی۔

تارا نے کہا "کاکا، اصل میں سوچنا آدمی کے لیے سب سے بڑی پریشانی کی بات ہے، اب جب سوچتے ہیں تو لگتا ہے ظلم سہتے سہتے یہ دن آگئے ہیں کوئی بھی تو کام سیدھا نہیں ہوا۔"

"مگر گورنمنٹ استادوں کی تنخواہوں کو بڑھانے کا جو سوچ رہی ہے"

شیام داس صبح کے اخبار کا حوالہ دے رہے تھے۔

وہ بھی بس سوچ ہی سوچ ہے۔ سب سے ایک سا سلوک کہاں کیا جائے گا۔

گریڈ بن رہے ہیں، لیاقتوں اور کالجوں میں پڑھانے کے سالوں اور جانے کیا کچھ سے۔

تنخواہ بڑھے گی جو کئی لوگوں کے لیے نقصان کا سبب بنے گی۔ جن لوگوں کو کام کرتے دس دس سال ہو گئے ہیں ان کو تو الٹا پڑے گا، آئندہ کے لیے وہ تو اپنے کو ختم سمجھیں"

کیدار نے چائے کی پیالی پکڑی۔

"کیدار بابو چائے ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی" کدم نے ٹی کوزی چائے دانی پر

ڈھکی۔

"کدم! تمہارے ستار کا کیا حال ہے؟" راگھو نے سائیکل برآمدے کے ساتھ کھڑی کی اور اندر آ کر تخت کے کنارے دادا کے پاس ٹک گیا۔

"بھیا تمھیں کیسے خیال آگیا ہے؟" کدم نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"ابھی ابھی تمھارے ستار ماسٹر برابر والے گھر سے نکل رہے تھے، انھیں دیکھ کر یاد آگیا کہ تم بھی سیکھا کرتی تھیں۔ ویسے میرا تو اپنا یہ خیال ہے کہ تم ستار وِتار بجانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔" اس نے دوسری طرف دیکھا۔

"ارے آپ کو اپنے اوندھے سیدھے دھندوں سے تو فرصت نہیں ملتی آپ کیا جانیں کون کیا کرتا ہے۔" کدم نے اس کے لیے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی لڑکی ہوں۔" راگھو ناک میں بولنے لگا "جسے فرصت ہی فرصت ہو۔" تارا اور کیدار زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔

"واہ، نہیں دیتے ہم چائے، جاؤ۔" کدم روہانسی ہو گئی۔

"جب ہم چلے جائیں گے تو منہ پھیلا کر روؤ گی اور ہمیں نہیں پاؤ گی۔" راگھو نے سنجیدگی سے کہا۔

"شرم نہیں آتی بُری باتیں کر کے بہن کا دل دکھاتے۔" تارا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس میں بُری کیا بات ہے موسی، جانا تو ہر کسی کو ہے۔" پھر کدم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "لاؤ چائے دو، تم نے مفت میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔"

شیام داس کہنے لگے "بات سوچ سمجھ کر منہ سے نکالنی چاہیے اور بہنوں کے ساتھ تو اچھی بات ہی کیا کرو۔ ان کے دل کو میلا کرنا ان کا جی دکھانا۔"

"بابا، میں اس کا جی کب دُکھاتا ہوں۔" اس نے اُٹھ کر چائے کی پیالی پکڑی۔ کدم ہنستے ہوئے چپ ہو گئی تھی اور تخت کے کنارے دادا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ راگھو کھڑا تھا اور بہار کی ہوا کو اپنے بالوں میں رینگتے محسوس کر رہا تھا، اسے

میوزیم میں رکھی وہ پینٹنگ یاد آرہی تھی جو کسی انگریز نے جاتے ہوئے تحفے کے طور پر وہاں رکھوائی تھی، اس میں ایک خاندان کے لوگ اپنے بیمار بزرگ کے گرد تھے، رشتے کی دوری اور نزدیکی سے ہر چہرے کا تاثر مختلف تھا کچھ محض دیکھنے آتے تھے، کچھ رنجیدہ تھے اور کچھ موت کی آمد کو محسوس کر کے خوفزدہ تھے۔ وہ بھی کبھی تصویریں بنانے کا شوقین تھا رنگ گھیر رہا ہے۔ آرہا ہے جارہا ہے ہر وقت بے قراری سے اپنے بڑا مصوّر بننے کے خواب دیکھتا ہوا اور جب کالج میں گیا ہے تو اس کے خیالات یکسر بدل گئے نہ اسے رنگوں سے دلچسپی رہی اور نہ تصویروں سے انہی دنوں اس کی دوستی ادی ناش سے ہوئی تھی اس نے کہا تھا :

”دیکھو یار تم ساری عمر لگا دو تب بھی ان آرٹسٹوں سے نہیں بڑھ سکتے جنھوں نے ایلورا اجنتا اور رامیشورم بنائے ہیں، اگر خون کا چلنا رگوں میں محسوس کرتے ہو تو اسے کسی اور بہتر کام میں لگاؤ۔“

راگھو نے بہت دنوں سوچا تھا ٹھیک ہی تو کہتا تھا ادی ناش، مگر آج اس گھڑی اس کا جی چاہا کاش وہ اس مکمل گھڑی کو ہمیشگی دے سکتا۔ اس بہار کی گدگدی ہوا کی تازگی اور نرمی کو ان چیزوں کی کیفیتوں کے ذریعے بیان کر سکتا۔ پر اُسے تو یونیورسٹی کے کاموں سے فرصت نہیں تھی اور کل ہنگامے شروع ہونے والے تھے۔

اس نے پیالی میز پر رکھ دی پھر کدم کے پاس بیٹھ کر اس کے گلے میں بازو ڈال کر کہا ”کدم بھئی تم تو خفا ہو گئیں، میں اپنی مُنی بہن کو بھلا خفا کر سکتا ہوں۔“

”ہٹو بھیا، کبھی تو سنجیدگی سے بات کیا کرو، ابھی دل ہولا دیا تھا اور اب یہ دلار کر رہے ہو ہمیں تمھاری فضول باتیں نہیں اچھی لگتیں۔“ کدم بدستور ناراض تھی۔

”اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”بھگوان! راگھو، کبھی تو امن سے گھر بیٹھو۔“ تارا نے اس کی طرف دیکھا۔

”جب امن ہوگا تو بیٹھیں گے نا!“ راگھو نے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھا۔

”کب تک آؤ گے لوٹ کر؟“ شیام داس نے پوچھا۔

"بابا، اب میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں کہ آپ فکر مند ہوں۔ میں ذمہ دار شہری ہوں اور ۔۔۔۔۔"

سائیکل ذرا دیر کو ڈگمگائی پھر وہ گھاس میں سے بنے پتلے سے راستے پر تیزی سے گزرا اور لان کے سبزے کے برابر سے ہوتا ہوا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

تارا نے کہا "میں اوپر چلتی ہوں، ان فائلوں کو سنبھالوں صبح کا لکچر تیار کرنا ہوگا۔"

کیدار نے اس کے ہاتھ سے فائلیں لے لیں "چلیئے میں آپ کو پہنچا آؤں۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وہ آخری سیڑھی پر کھڑا تھا۔

تارا نے فائلیں اس سے لے کر میز پر ڈال دی تھیں۔ شکریہ کے لفظ اس کے ہونٹوں سے نکل ہی نہیں چکتے تھے۔ کیدار کا قرب اُسے بہت کمزور کر دیتا تھا جیسے اس میں بولنے، بات کرنے کی سکت ہی نہ رہی ہو یا پھر یہ بہار کی ہوا تھی جو جسم سے چھو جائے تو آدمی دیوانہ ہونے لگتا ہے، پتّوں کی، پھولوں کی اور شہر کی وہ تمام باسیں اکٹھا ہو کر گھوم رہی تھیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور پھر کیدار کے ہونے کا عجیب احساس، وہاں سیڑھی پر کھڑا کچھ سوچتا ہوا۔

کمرے میں جا کر بتی جلانے کے لیے اس نے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر وہ بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ ایک لمحے کو اس نے گرم سانسوں کی سختی کو اپنے ہونٹوں، دانتوں اور رخساروں پر محسوس کیا مگر وہ ایک جھٹکے سے آزاد تھی۔

"چلے جاؤ کیدار، بھگوان کے لیے چلے جاؤ۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تارا! اتنی کٹھور نہ بنو۔" کیدار نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، فوراً جاؤ۔ ایک دم۔" وہ ایک حاکم کی طرح اسے سختی سے کہہ رہی تھی۔

"تارا۔" کیدار نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا "جانے تم کیا چاہتی ہو ——!"

"کیدار، کیدار" اس کے دل نے پکارا، مگر وہ قالین پر گری سسکیاں بھر

رہی تھی "بھگوان میں کیا چاہتی ہوں، میں کیا چاہتی ہوں؟" اس نے جانے کتنی سینکڑوں بار دُہرایا۔

"میں کیدار سے کیا چاہتی ہوں؟" اس نے سوچا "اُس کی آواز سن کر میرا دل کانپتا ہے مگر میں اُس کے قریب آنے سے دہشت زدہ ہوں، کیا میں اسے چاہتی ہوں؟

"بس میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی آواز سنتی رہوں جیسے جادو کے نگر میں ہوں۔ میں ایک دس سالہ بچی کی طرح کیوں اپنا آپ خواہ مخواہ کھلا رہی ہوں میری تو بات یوں ہے جیسے کوئی آگ کے پاس بیٹھے بھی اور اسے تاپنا بھی نہ چاہے"

"موسی!" نیچے سے کدم نے پکارا "آپ نیچے آجایئے نا، بابا آپ سے کوئی بات پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"ہائے رام" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ سامنے لگے آئینے میں اُسے جو اپنی شکل دکھائی دی وہ ایک زرد چہرے والی ڈھلتی عمر عورت کی تھی، جس کے بال بھونرے کی طرح سیاہ نہیں رہے تھے اور جس کی آنکھوں کی چمک مدھم سی تھی جیسے دیئے میں تیل کم ہو رہا ہو اور جو شعلے کی طرح لپک نہ سکتی ہو۔

"بیٹھو تارا" شیام داس نے کہا "میں کیدار کے سامنے یہ بات تم سے کہنا نہیں چاہتا تھا مگر میں نے کہیں سے سُنا ہے یونیورسٹی میں اور باہر جو ہنگامے ہوتے ہیں، ان کے پیچھے ملک کی سیاسی جماعتیں ہیں۔"

"نہیں کاکا، آپ نے یونہی سنا ہوگا، جب کوئی ہنگامہ ہوتا ہے تو لوگ خواہ مخواہ ہی مختلف طریقوں سے اُسے اُلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"مگر تارا، میں نے جس آدمی سے سُنا ہے وہ کوئی معمولی آدمی نہیں بڑا ذمہ دار اور اہم ہے۔" شیام داس بہت آہستہ بات کر رہے تھے۔

تارا کچھ سوچتے ہوئے بولی "میں تو کبھی سیاسی جماعتوں میں دلچسپی لیتی نہیں، کسی سے سیاست کی گفتگو نہیں کرتی یہاں تک کہ اخبار بھی نہیں پڑھتی ڈھنگ

سے۔"

"یہ سب اخباروں میں نہیں چھپ سکتا، اخباروں کی بات نہیں، اندرخانے جو باتیں ہیں یہ وہ ہیں اور تم تاریخ کیا پڑھاتی ہو؟ کیا اس زمانے سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے؟" شیام داس خفگی سے کہہ رہے تھے۔

"کاکا، تاریخ بیتا وقت ہے۔" تارا نے جواب دیا۔

"جو دن بھی بیت جاتا ہے، تاریخ بن جاتا ہے، مگر میں اس لیے پریشان نہیں ہوں، میں نے سُنا ہے اوی ناش کے باپ نے کسی فیکٹری میں حصّہ خریدا ہے۔ بھلا ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا جبکہ اوی ناش ابھی کماتا نہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے بچوں والے ہیں۔"

"ہاں ——!" تارا نے پوری آنکھیں کھول کر شیام داس کی طرف دیکھا۔

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں، جس کے کارخانے سے اس نے حصّہ خریدا ہے، اس نے مجھے خود بتایا ہے۔" وہ اُٹھ کر باہر دیکھنے لگے جیسے چاہتے ہوں کہ کوئی یہ گفتگو سُنے نہیں۔

تارا نے سوچا "کیا ہم سب اوی ناش کی فوج کا ہراول دستہ تو نہیں ہیں؟"

"مُنو کی لاش ایک دن اور ایک رات مُردہ خانے میں سڑتی رہی وہ تو سردی تھی اس لیے نہ جانے گرمی ہوتی تو وہ کیسا اُبل جاتا اور ہم سب کتنے جوش اور جنون کے ساتھ نکلے تھے۔ غلطی کس کی تھی؟ دوسروں پر اندھا دُھند یقین کر لینے کی اور اب راگھو اس کے جال میں گرفتار تھا، بھگوان میں کیا کروں۔" اس نے بڑی بے بسی سے سوچا۔ اُس کا جی چاہتا تھا اسی وقت اُٹھے اور اوی ناش کے ہاں جائے اور راگھو کو وہاں سے پکڑ لائے۔

"تبھی اوی ناش کے چہرے پر اتنا سکون ہوتا ہے، غریب گھر کا بیٹا اور نوابوں کے بچّوں کی طرح کتنے سالوں سے یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے۔" وہ سوچتی رہی۔

"کھانا لگ گیا ہے۔" چیتن نے آکر کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" تارا تخت کے کونے پر ٹکی بیٹھی تھی۔
کدم نے اندر سے پکارا "موسی آجائیے نا، آج آپ کی من پسند چیز بنی ہے
گوبھی کی بھجیا اور بھات۔"

شیام داس اندر جاتے ہوئے کہنے لگے "اب آجاؤ تارا!"

اُس کے اپنے دُکھ کیا کم تھے۔ اس کی اپنی ذات، اس کا اپنا وجود، یہ بے مصرف چاہت، یہ سدا، ہر گھڑی، ہر لحظہ گونجتی اور اس کا پیچھا کرتی ہوئی پکار "کیدار کیدار" جانے کیدار میں کیا تھا؟ یا وہ محض ایک ایسی عورت تھی جس کی طرف مدتوں کے بعد کسی نے ذرا سی توجہ دی ہو اور اس آنچ سے اس کی آتما پگھل رہی ہو۔ پر وہ پگھل کہاں پائی تھی۔ برف کی دیواریں جو اس کے آس پاس تھیں جن میں رہنے کے لیے اس نے انھیں ٹھیک ٹھاک کیا تھا وہ کبھی پگھل نہ پائیں گی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ بس کیدار کو پکارنے کی حد تک چاہتی ہے۔ وہ برف کی دیواروں کو اپنے آگے پیچھے سے ہٹا کر انھیں توڑ نہیں سکے گی، اس کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہ تھی اور ایسا کرنے کا فائدہ؟ اس کے ہونٹ یوں جل اُٹھے جیسے لوہے کے گرم ٹکڑے ہوں۔ من سے آتما تک، ہونٹوں سے دل تک دھڑ دھڑ جل رہا تھا مگر وہ بس کیدار کو پکارنے کی حد تک چاہتی ہے، وہ ایک شہزادی تھی جسے اس جلتے جنگل سے کوئی نکال نہیں سکتا کیونکہ وہ عمر کے وقت کے اور اپنے آپ کے جادو میں قید تھی، کیدار وہ راجکمار نہ تھا جو اُسے چھڑانے آنے والا تھا، بھلا ذرا سی مُدت کے لیے کوئی کیوں حیران ہو۔" عجیب فلسفہ ہے تمھارا بھی۔" تارا نے اُٹھتے ہوئے اپنے سے کہا۔ کیونکہ کدم اسے پکار رہی تھی۔

"موسی، شام تک تو آپ اچھی بھلی تھیں اب کیا ہو گیا ہے؟ دیکھیں تو سہی کتنی پیلی ہو رہی ہیں۔"

تارا نے گھبرا کر یونہی پلو سر پر اوڑھ لیا جیسے یوں اس کی پیلاہٹ چھپ جائے گی۔"

"بھیا کہہ رہا تھا چیتن سے میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" کدم نے اچار کی پیالی

اس کے آگے سرکائی۔ ڈونوالے کھا کر وہ اُٹھنے لگی تو کدم نے کہا" کیوں موسی ، بھوک نہیں رہی کیا ؟"

" آج میٹنگ اتنی لمبی چلی تھی کہ تھک گئی ہوں ۔" تارا نے بالوں کا جوڑا بنانے کے لیے بازو اٹھائے ، باندھ کر پن ان میں اڑستے ہوئے بولی" ابھی تو مجھے لکچر تیار کرنا ہے ۔"

" ہمارے ہاں تو مزے ہیں ، ہماری لکچرار اگر کبھی لکچر تیار کر کے نہیں آتیں تو چھٹی دے دیتی ہیں اور ہم باغ میں بیٹھ کر گپ ہانکتے ہیں ۔"

" تمھارا بڑا کالج ہے کوئی کچھ نہیں کہتا نا ، ہمارے ہاں یہ نہیں چل سکتا ، اور پھر لکچر نہ تیار کرنے کی کوئی وجہ بھی ہو ۔" تارا اُوپر چلی گئی ۔

" اب شاید کیدار کبھی نہ آئے ، میں اسے کبھی دیکھ ہی نہ پاؤں !" اس نے مرنے والے کی طرح سوچا ۔

راگھو ، آدھی رات کے بعد لوٹا ، تارا کے کمرے کی بتی جلتی دیکھ کر وہ اُوپر چلا آیا تھا ۔

" موسی مجھے آشیرباد تو دو ۔" وہ بہت خوش تھا اور اس کی آنکھیں رُوپا کی طرح مدھ ماتی ہو رہی تھیں ۔

" کاہے کے لیے ؟" تارا نے لیٹے سے اُٹھ کر کہا ۔

" سویرے ہم لوگ بہت بڑا جلوس نکالنے والے ہیں ۔" وہ جوش سے باؤلا ہو رہا تھا ۔

" راگھو ، تم لوگ کس پارٹی کے لیے کام کر رہے ہو ؟" تارا کی آواز بہت پُرسکون تھی ، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ کوئی چھوٹا پتھر نہیں ، پہاڑ کا پہاڑ لُڑھکا رہی تھی ۔

راگھو جو دیوار پر ٹنگی تصویر کی طرف منہ کیے کھڑا تھا ، یوں پلٹا جیسے اُسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو ۔

"موسی!"

"ہاں راگھو، یہ بات تو مجھے بہت دنوں سے تم سے پوچھنا ہی تھی، بلکہ بہت دیر سے پوچھ رہی ہوں۔" تارا کی آواز میں بے پناہ نرمی تھی۔

"موسی، یہ آپ سے کس نے کہہ دیا ہے؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ گھائل سا اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"راگھو دُنیا بے وقوف نہیں ہے اور نہ لوگ پاگل، اوی ناش کو کیا پڑی ہے کہ اپنا خون خشک کرے اور جان مصیبت میں ڈالتا رہے۔" تارا کے سینے میں جوالا سی اُبل رہی تھی۔

"اوہ، یہ بات ہے۔" گویا اس نے جسے بہت بڑی مصیبت سمجھا تھا وہ تو کچھ بھی نہیں۔ راگھو نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا۔ "موسی! لوگ طرح طرح کی باتیں اس کے لیے کرتے ہیں مگر وہ بہت سادہ ہے اور بڑا ہی اچھا دوست ہے، سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے والا۔ پھر آپ جانتی ہیں میرا اور اس کا پانچ سال کا ساتھ ہے، مَیں نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی، مَیں نے کبھی رات یا دن کو سوائے دوستوں اور کام کرنے والوں کے اس سے ملتے نہیں پایا، لوگ جھوٹ کہتے ہیں، کوئی کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔

تارا نے محسوس کیا کہ راگھو کو وہ اس طرح نہ سمجھا سکتی ہے اور نہ ہی جلوس میں شامل ہونے سے روک سکتی ہے۔ وہ ٹھیک کہتا ہے، جس دوستی پر اسے پانچ سال سے وشواس تھا وہ اس کی ایک بات سے کہاں ٹوٹ سکتا ہے، صبح جلوس میں وہ ضرور جائے گا اور اس کے بعد وہ اسے سمجھائے گی۔ ایسے وقت میں جب بچے سیاسی پارٹیوں اور باہر کی طاقتوں کے اشاروں اور پیسوں پر ہنگامے کھڑے کریں، جلوس نکالیں، ملک کا امن و امان اپنے ہاتھ میں لے لیں تو ان کا نشہ کہیں ایک آدھ بات سے اتر سکتا ہے؟

راگھو نے کہا "موسی آپ ہمیں آشیرباد دیں اور ہم میں وشواس رکھیں۔"

"میری اشیرباد سے کیا ہوگا راگھو، تم کو خود یقین ہونا چاہیے کہ جو چاہتے ہو اس میں تم اتنے اٹل ہو کہ چاہے بھگوان بھی چاہے تم کو ناکام نہیں بنا سکتا۔" تارا کے چہرے پر روشنی سی تھی۔

"ہیئر ہیئر" راگھو نے تارا کے کندھے پر ہاتھ دھرا۔

"مسخرہ پن مت کرو اور غور سے میری بات سنو، تمھارے بابا سن کر آئے ہیں بلکہ کسی بہت ہی ذمہ دار آدمی سے کہ اوی ناش کو کہیں سے پیسہ ملتا ہے، اس کے باپ نے کسی کارخانے میں حصّہ خریدا ہے۔"

راگھو کے چہرے پر سوچ کی بدلی سی امنڈ آئی، وہ کھڑے سے بیٹھ گیا اور بہت دیر چپ بیٹھا رہا پھر اس نے ہولے سے کہا "موسی، آپ مجھ پر وشواس رکھیں، میں اس بات کی تہہ تک پہنچوں گا، میں مکمل چھان بین کروں گا، یوں لگتا ہے جیسے ایکدم میرے آگے کی روشنیاں بجھ گئی ہوں مگر کل کا دن گزر جائے تو۔"

"تم کل جلوس میں نہ جاؤ تو اچھا ہے۔" تارا کو اپنی بات بڑی سطحی لگ رہی تھی، اسے معلوم تھا راگھو اب پیچھے نہیں ہٹے گا، اس کے کہے تو بالکل ہی نہیں۔

"نہیں موسی یوں نہ کہیے، اب میرا اٹھا ہوا قدم بلاوجہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا مجھے اپنے طور پر بھی پتا لگانا ہوگا اور یہ بنا اوی ناش کے ساتھ ساتھ رہے ممکن نہیں" راگھو کھڑا ہو گیا۔

تارا کو اس کی بات میں وزن لگا "ٹھیک ہی کہتا ہے، پر اوی ناش سے کیا جو گا جانے اور کتنے ہیں؟"

"مجھے اور کتنوں سے غرض نہیں، اوی ناش تو ہماری ہر سوسائٹی کی جان ہے اگر وہ ہی اندر سے سڑا ہوا ہے تو باقی تو اس سے بھی خراب ہوں گے۔" پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا "آپ کی بات اگر مان ہی لوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پانچ سال سے میں ایک دھوکے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ رہا ہوں۔"

"یہ میری ہی بات نہیں ہے راگھو، تم ہی کان اور آنکھیں بند کیے رہتے ہو

لوگ یونہی تو بات نہیں کرتے، مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی ہے" تارا کو ایک دم لگا جیسے وہ بہت تھک گئی ہے۔

"اچھا موسی اب میں چلوں گا، ذرا سی تو رات باقی رہ گئی ہے" اور اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی وہ سیڑھیاں اُتر گیا، اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ تارا کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس نے راگھو کے کتنے خواب چکنا چُور کر دیے تھے آخر اُس نے ہی یہ ناخوش گوار کام کیوں کیا؟

شیام داس نے کہا "راگھو ادھر آؤ۔"

راگھو نے کہا "بابا، میں سب کچھ موسی سے سُن کر آیا ہوں اور آپ کے بنا کہے میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے، آپ آرام کریں۔"

اور وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جلوس بہت پُر امن تھا۔ وہ بڑے بڑے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور نہایت آہستہ چل رہے تھے۔ سپاہی جلوس کے آگے آگے سڑک پر آتی جاتی موٹروں کو روک کر انھیں دوسرے راستوں سے جانے کا اشارہ کرتے، کئی جگہ ٹریفک رُک گیا تھا اور تماشائی سڑک کے دونوں طرف پولیس والوں کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے، کچھ لوگ اپنی موٹروں کو سڑک کے ایک طرف کھڑا کر کے ان پر چڑھے بیٹھے تھے جیسے یہ کسی غیر ملکی مہمان کی سواری ہو اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے یہاں رکے ہوئے ہوں۔ صبح خوش گوار تھی، سورج بہت گرم نہیں تھا اور بہار کی ہواؤں میں لوگ بہت خوش خوش پھر رہے تھے۔ اسکولوں کو جاتے بچے بسوں کے راستہ پھر جانے کی وجہ سے صرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔ لگتا تھا سارا شہر ان کا سواگت کر رہا ہے بڑے بڑے بورڈ اٹھائے ہوئے جن پر سُرخ رنگ سے مختلف نعرے لکھے تھے وہ آگے بڑھ رہے تھے اور ان کے سروں پر پیپل کے پتّوں میں ہوا گیت گاتی تھی، پتّے یُوں ہل رہے تھے جیسے تالیاں بجا رہے ہوں، اٹھتے ہوئے قدموں کے تال پر ناچ رہے ہوں، ایک بڑی فوج کی طرح قدم سے قدم ملائے ہوئے جوان چہروں پر صبح کی

تازگی اور جوش نے رنگ بکھیرے تھے۔ ان کے تپتے ہوئے گال جن پر ماؤں نے بوسے دیئے ہوں گے۔ ان کے ڈھنگ سے بنے بال جن پر ان کے باپوں نے ہاتھ پھیرے ہوں گے، ان کے گلے میں اسکارف تھے جو شاید ان کی دوست لڑکیوں کے تحفہ ہوں گے۔ وہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن اور کتنے سروں کا غرور ہوں گے بیٹے اور بھائی جوش سے دیوانے ہوتے ہوتے مگر پھر بھی اپنے کو قابو میں رکھے ہوئے یہ تو ہنگامہ کرنے والے نہیں تھے، سکولوں اور کالجوں میں سکھائے ہوئے ڈسپلن کی وجہ سے بہت سلیقے سے چل رہے تھے، پولیس پتا نہیں کیوں اتنی پریشان تھی۔

سفید چوک میں کچھ لڑکوں نے جلوس کے آگے آگے بھنگڑا ناچ ناچنا شروع کر دیا، وہ سب ایک جوان شاعر کی نظم پڑھ رہے تھے جس میں حکومت کے ظلموں اور زیادتیوں کا ذکر تھا۔ ایک بند پڑھ کر وہ ہائے ہائے کرتے، ہنستے ناچ کے تیز چکروں میں گھومتے اور پھر خوب صورت گمبھیر آواز والا جوان اپنے سنہری بالوں کو جھٹک کر دوسرا بند پڑھتا پیچھے آنے والے تالیاں بجاتے، لوگ ہنس رہے تھے لگتا تھا دیوی ماں کے مندر میں بھجن کیرتن والوں کی ٹولی ہے اور وہ سب کوئی منت اتارنے جا رہے ہیں۔ سپاہی لڑکوں کے ساتھ چل رہے تھے اور فضا بڑی دوستانہ تھی۔

ایک موڑ پر کسی کار والے نے ہارن بجا کر راستہ لینا چاہا، سپاہیوں نے اسے روکا تو اس نے لڑکوں کو گالیاں دیں۔

"کیا مصیبت ہے ان کو روکا نہیں جا سکتا، جانے حکومت کس مرض کی دوا ہے؟ روز جلوس نکلتے ہیں اور شہریوں کا امن غارت ہو جاتا ہے۔"

"چلیں آپ ہمارے ساتھ۔" وہ موٹر والے کے گرد جمع ہو گئے، "ان گالیوں کی یہی سزا ہے۔"

وہ ہنس رہے تھے اور انھوں نے اسے پکڑ کر اپنے درمیان چلنے پر مجبور کر دیا وہ اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے اس کو اپنے ساتھ گھسیٹ رہے تھے "کیا آپ کا کوئی لڑکا نہیں جو جلوس میں ہو؟"

وہ غصّے سے دیوانہ ہو رہا تھا اور بہت خفا تھا۔ دائیں بائیں غلیظ گالیوں سے انہیں بھی دیوانہ کیے دیتا تھا۔

وہ ہنستے ہنستے یک لخت چپ ہو گئے اور انھوں نے اسے ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر اس کی موٹر کی طرف اچھال دیا، ایک پولیس والے نے انھیں کہا۔

"یہ سفید وردی میں پولیس کا افسر ہے، آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" لڑکے جوش میں آ گئے اور انھوں نے اس سپاہی کو پیٹنا شروع کر دیا "کیا ہم گالیاں کھائیں اور پولیس والوں سے ڈریں؟"

پولیس کی لاریاں بھاگنے لگیں اور اعلان ہونے لگا کہ

"جلوس فوراً ختم کر دیا جائے، یہ سٹی مجسٹریٹ کا حکم ہے۔"

پولیس ایک بڑی سیاہی مائل لاری پر تھی جس کو شاید قیدی لانے لیجانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ اس میں چھپے ہوئے تھے اور لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیے جاتے تھے۔ کچھ پُرجوش اور کچھ جھجکتے ہوئے لڑکوں نے سڑک کے کنارے والی دکانوں میں گھس کر سامان توڑنا شروع کر دیا، پھر انھوں نے ایک مرمّت ہونے والی بلڈنگ کے عمارتی سامان اور اینٹوں کے ڈھیر سے اینٹیں اٹھا کر سپاہیوں کی طرف پھینکیں۔ جنگ شروع ہو گئی۔

لڑکے بھاگ کر پاس کی عمارتوں میں چھپ رہے تھے اور پولیس ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ انتقامی کارروائی تھی اور ہر شخص اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر بار بار دہرایا جا رہا تھا "سڑک خالی کر دو اور جلوس ختم۔"

موجوں کی طرح بڑھتی ہوئی صفوں نے پولیس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

ایک ڈی۔ ایس۔ پی لڑکوں کے نرغے میں پھنس گیا اور پھر جانے کس نے حکم دیا، سپاہیوں نے پوزیشنیں لے لیں، لڑکے ابھی تک ہنس رہے تھے، بھاگ رہے تھے، توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ سڑک ٹوٹی ہوئی اینٹوں اور جانے کاہے کاہے سے بھری تھی۔

"ہمیں یہ حکومت نہیں چاہیے، اپنا حکم واپس لے لو یہ سڑک ہماری ہے"۔
وہ مل کر زور زور سے چیخ رہے تھے جیسے ہولی میں رنگ اچھالتے اور گلال پھینکتے ہیں۔ وہ خوشی اور جوش سے پاگل ہوئے جاتے تھے۔

"سڑک پر سے ہٹ جاؤ فوراً"۔ لاری میں سے کسی نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا۔

"سڑک تمہارے باپ کی نہیں، ہماری ہے، ہم یہ حکومت نہیں چاہتے"۔ وہ اپنے سکارف ہلا رہے تھے اور کئی لڑکوں نے اپنی قمیصیں اُتار لیں، انھیں جھنڈوں کی طرح اٹھائے تھے اور ننگے سینوں پر ہاتھ مار کر شور مچا رہے تھے۔

"آنسو گیس پھینکی جائے گی، آپ لوگ سڑک خالی کر دیں"۔

اعلان بار بار، ذرا ذرا وقفے سے ہو رہا تھا مگر کوئی اُسے سننے کو تیار نہ تھا۔ وہ آج پُرامن رہنے کا جو عہد اپنے سے کر کے نکلے تھے اس پر قائم نہ رہ سکے۔

آنسو گیس، پھینکنے والوں سے چھین کر لڑکوں نے گیس واپس ان کی طرف پھینکی جو پوزیشن سنبھالے بیٹھے تھے اور کئی بھاگتے ہوئے پولیس والوں سے انھوں نے بندوقیں چھین لیں۔ جب فائر کرنے کا حکم دیا گیا تو لڑکے تب بھی مذاق سمجھے۔

گولی چلی اور پھر موت کا سناٹا سارے میں چھا گیا۔

تڑاتڑ کے سامنے اچھل کر گرنے والوں کے جسم تڑپتے رہے۔

تماشائیوں کے چہرے زرد پڑ گئے، ان کی رگوں سے کسی نے ساری گرمی کھینچ لی، پتہ نہیں اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایک لمحے کے لیے کسی کو یقین نہیں آیا، پھر لوگ چیختے ہوئے واپس بھاگے، پناہ گاہوں اور سڑک کے پیچھے گلیوں کی طرف لڑکے بھی شور مچاتے ہوئے پیچھے پلٹے کچھ ان دکانوں میں گھس گئے جن میں وہ توڑ پھوڑ کرتے رہے تھے۔

چلیں کے تالیاں بجاتے بتوں نے اب افسوس سے ہاتھ ملنے والوں کی طرح ماتم کرنا شروع کر دیا تھا۔ سورج پوری آنکھیں کھولے خون میں لت پت ان جوانوں کو دیکھ رہا تھا جن کی دھوپ کی سی صورتیں اور اجلی ہنسی اب مٹی کے رنگ کی ہو گئی

تھی، بھاگتے ہوئے، تڑپتے ہوئے، سسکتے ہوئے دم توڑتے ہوئے بچے جو سرور بھی
برداشت نہیں کرسکتے ہولی کھیلتے ہوئے وہ گلال سڑک پر بکھیر کر خود چپ چاپ
لیٹ گئے تھے، ان کے پروگرام میں شاید یہ بھی شامل تھا۔
درخت کا کاٹنا کتنا آسان اور اس کو پروان چڑھانا کتنا مشکل ہے؟

دیوی دیال آج قرض چکانے والوں کی طرح بہت تنگ و دو سے شیام داس
کے ساتھ لسوم پھر رہا تھا۔ وہ ہسپتالوں میں زخمی ہونے والوں کا پتہ کرتے پھر رہے
تھے۔ ایک ایک بستر پر جاکر انھوں نے دیکھا، پہرہ داروں کے پاؤں پڑے، منتیں
کیں، گلی گلی خاک چھانتے پھرے، تھانوں میں گئے، جلوس میں شامل لڑکوں کے
گھروں پر جاکر ڈھونڈتے پھرے مگر راگھو کو تو جیسے دھرتی نے نگل لیا تھا۔
دادا اپنی اندھی آنکھوں کو اندھیرے میں دیکھنے کے لیے کھولتے اور لاٹھی ٹیکتے
برآمدے تک آکر پکارتے، "راگھو نہیں آیا ابھی؟"
کوئی ان کی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔
ادی ناش بھی اپنے گھر پر نہیں تھا، اس کے باپ نے کہا "وہ جلوس کے ساتھ
گیا تھا، ہوسکتا ہے کہیں چھُپ گیا ہو اس لیے کہ پولیس لڑکوں کو گھروں سے گرفتار
کرتی پھر رہی ہے۔ حکومت کو اس بات کا افسوس تو نہیں کہ لڑکے مارے گئے
ہیں۔" اس کے چہرے پر نہ گھبراہٹ تھی اور نہ ہی وہ شیام داس کی طرح پریشان تھا
"لالہ، میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں مجھے ادی ناش سے پوچھ دیجیے تاکہ میرا
بیٹا کہاں ہے؟ شیام داس نے اس کے پاؤں کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔
"نہ، نہ، ارے، ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" اس نے پرے ہٹتے
ہوئے کہا "مجھے کیا معلوم ادی کہاں ہے؟"
"پر آپ کو اتنا فکر معلوم نہیں ہوتا۔" دیوی دیال نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا "لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"دھیرج سے کام لیجئے، میرے گھر آپ اپنے بچے کا پتہ کرنے آئے ہیں کرو نے اور اگر مجھے پتہ ہو اور میں نہ بتانا چاہوں تو آپ کیا کریں گے میرا؟" اوی کا باپ اب بدتمیزی پر اتر آیا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" شیام داس نے آہستہ سے کہا "کارخانہ داروں کا کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

"مالک ہیں آپ۔" وہ اب ہی۔ ہی ہنس رہا تھا "بھلا میں کس لائق ہوں میں کوئی کارخانہ دار نہیں آپ کا داس ہوں۔"

شیام داس اور دیوی دیال موٹر میں بیٹھ چکے تھے کہ وہ بھاگ کر آیا "مہاراج آپ نے یہ کارخانے کی بات کیسے کہی ہے؟ میں غریب آدمی ہوں مارا جاؤں گا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں لالہ، ہم اپنے دکھ سے فارغ نہیں ہیں آپ کا ڈھنڈورا نہیں پیٹیں گے۔" موٹر کی دھول کے درمیان وہ کھڑا رہا۔

تین راؤنڈ چلے تھے اور مرنے والوں میں سے باقیوں کا کچھ پتہ نہیں تھا، دو لاشیں پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بعد وارثوں کے حوالے کر دی تھیں۔

"کہیں چھپا ہوگا بھیا۔" کدم کو وشواس تھا کہ اس کے بھائی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔

تارا یوں چپ تھی جیسے اس نے بات سنی ہی نہ ہو۔ "راگھو! ارے میں نے اس سے ڈھنگ سے بات کی ہوتی تو وہ کبھی جاتا ہی نا۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہو گا۔" وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھی تھی اور بیراگن لگ رہی تھی۔ بے سُدھ اور بار بار کہہ رہی تھی "اب کیا ہوگا؟ ہائے اب کیا ہوگا؟" پھاٹک کے سامنے سے لاریاں اور موٹریں گزر رہی تھیں، گھری، گرد سے بھری اور دل کو اداس کرنے والی شام میں کوئل کوہو کوہو بولتی ہے، جانے وہ کسے پکارتی ہے۔

رات گئے ریڈیو پر اعلان ہوا جو لڑکے چھپے ہوئے ہیں وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں، ان کا کیس سننے کے بعد شاید معافی دے دی جائے۔ خبروں کے

غیر معمولی بلیٹن براڈکاسٹ کیے گئے۔ پریذیڈنٹ نے اعلان کیا "مجھے افسوس ہے جو کچھ ہُوا۔ مگر حکومت سے ٹکر لینے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو چاہیے اپنے بچوں کو گھروں میں سنبھال کر رکھیں اور انھیں سیاست سے علیٰحدہ رہنے کی تاکید کریں۔ جائز شکایات اور مطالبات تو مانے جا سکتے ہیں مگر امتحان کے قریب غنڈہ گردی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ میری حکومت نہایت سختی سے ان لوگوں سے باز پرس کرے گی جو جلسے جلوسوں میں طالب علموں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

آخر میں انھوں نے مرنے والوں کے والدین کے نام پیغام دیا کہ وہ صبر سے کام لیں اور یہ کہ صرف دو لڑکے مرے تھے۔ جو زخمی تھے وہ بھی بہترین ڈاکٹروں کے علاج سے اچھے ہو جائیں گے۔ پھر ان کے مقدموں کی سماعت ہو گی اور انھیں ضرور سزا ملے گی اس میں کوئی رعایت نہیں ہو سکتی۔ اگر ان کا قصور ثابت ہو گیا تو انھیں یونیورسٹی سے نکال دیا جائے گا۔

کدم نے دل تھام کر تقریر سُنی اور پھر بھاگی ہوئی اوپر آئی "موسی! صرف دو لڑکے ہی تو مرے ہیں۔ ارے، بھیا زندہ ہے۔" اس نے تارا کو کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلایا۔ تارا اسی طرح گم سُم بیٹھی تھی۔

"ارے خوش ہو جائیے نا، کہیں چھُپا ہو گا۔" کدم بولائی بولائی سی پھر نیچے کی طرف بھاگی، پھاٹک سے شیام داس کی موٹر داخل ہو رہی تھی۔

"بھگوان، میں براہمنوں کو بھوجن کراؤں، دیوی ماں کیا ہو اگر میرا رگھو بھی موٹر سے اترے، دیوی ماں۔" اور تارا نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا "بس مجھے رگھو کی آواز ایک بار سنائی دے جائے، ایک بار مجھے موسی کہہ کر پکارے، اے بھگوان اور دیوی ماں!!" جانے شیام داس کے ساتھ کون کون تھا۔ تارا نے کھڑکی بند کر دی کوئی شے مسلسل اس کے کلیجے سے پیٹ میں گر رہی تھی۔ گرم دھار اُسے جیسے خون کی کوئی نالی پھٹ گئی ہو بوجھل قدموں سے وہ قالین پر لیٹ گئی۔ اس حالت کا ذمہ دار کون تھا؟

"ہائے رگھو۔" اس کا دل بار بار دھک دھک کر رہا تھا "ہائے رُوپا۔" اس کا

جی چاہتا تھا کاش کوئی بم پھٹے، آکاش سے بجلی گرے، کچھ ہو تو سہی۔ یوں بے خبری میں نا اُمیدی میں مسلسل باٹ دیکھتے رہنے سے کیا ہوگا؟

"موسی، نیچے آئیے نا! کیدار بابو آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی ہے۔ وہ شاید کچھ بتا رہے ہیں۔" کدم الٹے قدموں نیچے بھاگ آئی۔

اس کے دل میں کیدار کا نام نہ تھا، کوئی یاد نہ تھی۔ پچھلی شام برسوں پہلے گزری تھی۔ اس شام کے اور اس رات کے درمیان صدیاں گزر گئی تھیں، کیدار کوئی اجنبی تھا جو کاکا کے ساتھ آیا تھا، وہ اٹھی اور ننگے پاؤں ہی سیڑھیاں اتر گئی۔

شیام داس اندر غسلخانے میں منہ دھو رہے تھے، تخت کے پاس کرسیاں بچھی تھیں۔ بڑے چچا اس پر لیٹے تھے۔ ان کی حالت جیسے مرنے والے ہوں۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا وہ پھوپھو کر رہے تھے، مانو اندر لگی آگ کی وجہ سے پھنک رہے ہوں۔

"کوئی پتہ چلا کیدار بابو؟" انھوں نے کیدار کی طرف منہ کر کے کہا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" کیدار نے ہولے سے کہا۔

تارا نے دیکھا کاکا ایک دم کتنے بوڑھے لگ رہے ہیں۔ وہ غسل خانے سے نکل رہے تھے اور تولیے سے اپنے سفید بالوں کو پونچھتے ہیں ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ایک خالی کرسی کو گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے کہا "کدم، چائے کے لیے کہو۔"

"نہیں نہیں۔" تیسرے اجنبی نے اپنا کیمرہ اتار کر کرسی کی پشت سے لٹکاتے ہوئے کہا "ابھی نہیں۔"

"جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔" شیام داس کی آواز بہت نارمل تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا آپ اتنے فکرمند کیوں ہیں۔ صبح سے جتنی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں آپ کے بیٹے کو بھی کرنا چاہیے تھا۔" اجنبی نے بڑے وثوق سے

سے کہا۔

تارا نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں نے راگھو بھیا کو جلوس میں دیکھا تھا" پرکاش نے کہا۔

"کیا تم اب کے جلوس میں نہیں تھے" تارا نے اس سے پوچھا۔

"نہیں میں نے پچھلے ہنگاموں میں زخمی ہونے کے بعد معافی مانگ لی تھی"
وہ کچھ شرمندہ سا تھا "ڈیڈی کی نوکری کا سوال تھا نا" وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔

"اچھا" تارا نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"راگھو بھیا نے ایک جھنڈا اٹھا رکھا تھا" پرکاش نے بات جاری رکھی۔

"جب گولی چلی ہے تب تم کہاں تھے" شیام داس نے اس سے پوچھا "کیا گولی چلنے کے بعد بھی راگھو کو دیکھا ہے؟"

"میں تو جلدی سے اس پیڑ پر چڑھ گیا تھا جو سڑک پر سایہ کیے ہوئے ہے اور جس کی اوٹ میں کئی اور لڑکے چھپے تھے مگر کسی کو اوپر چڑھنے کا خیال نہیں آیا سوائے میرے"

"اوپر چڑھ کر تم نے کہیں راگھو کو دیکھا" تارا کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"میں نے ان کو دیکھا تھا، وہ درخت سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھے انھوں نے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے جدھر سے گولیاں آ رہی تھیں"

"وہ بھاگا نہیں؟" شیام داس نے کسی غیر آدمی کی طرح اس سے سوال کیا۔

"نہیں، پھر شاید بھاگ گئے ہوں کیونکہ میری توجہ اور لڑکوں کی طرف ہو گئی تھی ایک لڑکے کو میں نے دیکھا وہ خون کے دریا میں لیٹا تھا جیسے پچھلی ہولی کے دن کئی سحر یونہی رنگ پر سے پھسل کر اس میں گر رہے تھے، پھر میں نے اپنے ایک ہم جماعت کو دیکھا وہ دوسرے کا پیٹ اپنے اسکارف سے باندھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ سرخ تھے جیسے لال پینٹ سے رنگے ہوں"

"ایک کے سر میں سے خون یوں اُبلا تھا جیسے فوارے سے پانی نکلتا ہے تو اُچھلتا ہے۔"

وہ چُپ ہو گیا۔

"اور کچھ۔" شیام داس نے نہایت غیر جانبدار جج کی طرح سوال کیا۔

"مجھے لگا تھا جیسے میں درخت پر سے گر جاؤں گا، مجھے اپنے اندر انتڑیاں باہر کو آنے والی لگیں۔ میں نے مُنہ درخت کی شاخوں میں چُھپا لیا اور پتے مُنہ میں ڈال لیے کہیں مجھے قے نہ ہو جائے، میری آنکھیں اتنا بہت کچھ دیکھ رہی تھیں کہ اور دیکھ نہیں سکتی تھیں۔" پرکاش کو لگا پھر اس کی انتڑیاں باہر آنے والی ہیں وہ کُرسی سے اُٹھ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا اور منہ کو نیچے کر کے اندر کے طوفان کو روکنے میں لگ گیا۔

"تم نے بھیا کو نہیں دیکھا نا؟" کدم نے چائے پیالوں میں انڈیلی اور اس سے سوال کیا۔

پرکاش نے سر کو دائیں بائیں کیا اور پیٹ کو دباتے ہوئے باہر کی طرف بھاگا۔

چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر اجلبی نے اپنا تھیلا اٹھایا پھر احتیاط سے اُسے کھولا اور تصویریں میز پر پھیلا دیں۔

یہ تصویریں ایسی تھیں جیسی کسی پرانے زمانے کی جنگ کی ہوں ایسی تصویریں جو غدر کی یا اس سے پہلے کی تھیں، تارا کو یاد آیا اس نے میوزیم میں ایک بڑی پینٹنگ دیکھی تھی جس میں لارڈ ڈلہزی کے عہد کی ایک جنگ کا نقشہ تھا، تلواروں سے حملہ کرتے ہوئے انگریز اور غصے میں اپنی داڑھیاں چباتے ہوئے حملے کا جواب بھاگ کر دیتے ہوتے دیسی سپاہی۔

پہلی تصویر بھی ویسی ہی تھی، سپاہی حملہ کر رہے تھے لڑکے بھاگ رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا، زمین پر گرے ہوئے جھنڈے ان کو روندتے ہوئے لڑکے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے نہتے اور چلاتے ہوئے حیران پریشان جیسے انھیں یقین نہ

ہو کہ ان کے ساتھ یہ ہونے والا ہے۔

دوسری تصویر میں خون تھا بہتا ہوا اور گرے ہوئے لڑکوں کے لاشے تھے کسی کا منہ اس کے بازوؤں میں چھپا تھا کوئی اپنا پیٹ پکڑے تھا اور گھٹنے سینے سے لگائے تھا، جیسے درد کی شدت کو کم کرنے کی کوشش میں ہو، ان کے چہرے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس میں بھاگتے ہوئے لڑکوں کی جو تصویریں تھیں معلوم ہوتا تھا انھوں نے بجلی کے ننگے تار چھو لیے ہوں۔

"آپ نے یہ تصویریں اخبار کے لیے کھینچی ہیں۔" کیدار نے کہا۔

"مگر یہ اخبار میں چھپ نہیں سکیں گی اس لیے کہ اس سے حکومت کی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور کوئی حکومت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے اپنے اخبار اس کی زیادتی کی داستان بیان کریں۔" اجنبی نے تصویروں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔

تارا نے تصویریں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور بتی کی روشنی میں انھیں اور قریب سے دیکھنے کے لیے وہ کمرے میں چلی گئی، ہو سکتا ہے ان چہروں میں وہ کہیں راگھو کی ایک جھلک دیکھ سکے۔

وہ سب بہار کی ہوا کو محسوس کرتے ہوئے وہاں بیٹھے تھے، صرف شیام داس اُٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔ لان میں ٹہلتے ہوئے انھوں نے دیکھا تارے سدا کی طرح آکاش کی نیلاہٹ میں بہت روشن تھے اور جانے کیوں لاکھوں کی تعداد میں ان گنت تھے کہکشاں دھول کی طرح جیسے کسی گزرنے والے جلوس کی گرد ہو۔

دیوی دیال بابو باڑھ پھلانگ کر اندر آئے "میں ابھی ابھی آیا ہوں۔" انھوں نے شیام داس کے پاس وہیں کھڑے ہو کر کہا۔

"کوئی پتہ چلا؟" شیام داس فوارے کے کنارے پر ٹک گئے۔

"ہاں۔" دیوی دیال بھی وہیں ان کے قریب بیٹھ گئے۔

کدم بھاگتی ہوئی ان کی طرف چلی گئی، ہو سکتا ہے راگھو کا کوئی پتہ چلا ہو۔

"لڑکے ناچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے جیسے میلے میں آئے ہوں تو اندر سے کوئی گواہی دے رہا تھا کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا"۔ اجنبی نے تارا سے تصویریں لے کر تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پولیس والے کہتے ہیں کہ انھوں نے خود حفاظتی کے لیے گولیاں چلائی ہیں" کیدار نے کہا" وہ کہتے ہیں کہ ہمارے سپاہی اس قدر زخمی ہوئے ہیں کہ ان کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔"

اجنبی نے قہقہہ لگایا تو اس کا سر کرسی کی پشت سے جا لگا، ہاہا کی آواز اس سنجیدہ ماحول میں بڑی خوفناک لگی۔ دیوی دیال اور شیام داس دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

"ہمیشہ یوں ہوتا ہے اگر وہ ایسا نہ کہیں تو انھیں اپنی بے رحمی کا جواب دینا پڑے" اجنبی نے بالآخر کہا۔

تارا چاچا کے پاس بیٹھی تھی اور وہ درد کی شدت سے تڑپ رہے تھے۔ دائیں بائیں سر پھیر رہے تھے۔

"کم از کم یہ تڑپ تو سکتے ہیں" اس نے سوچا" اور میں تو ایسا بھی نہیں کر سکتی"۔ ان کا جی چاہا وہیں برآمدے کے فرش پر لیٹ جائے اور کبھی نہ اُٹھے۔

"جب جلوس چلا ہے تو آپ کو پتہ ہے پولیس کے چہرے کتنے پُرسکون تھے، وہ کیسے ہنس ہنس کر لڑکوں سے باتیں کر رہے تھے"۔ اجنبی نے کیدار سے کہا" انھیں پورا یقین تھا کہ جلوس گورنمنٹ ہاؤس تک جا سکے گا"۔

"سب گاتے ہوئے جا رہے تھے"۔ پرکاش نے کہا" میرا بھی جی چاہتا تھا پرانے دنوں کی طرح ان میں مل کر چیخ۔۔۔۔" اس نے بات مکمل نہیں کی۔ اس کا گلا بند ہونے لگا تھا۔

"ہاں جلوس بڑے جوش اور بڑی رواداری سے جا رہا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ صرف گورنمنٹ ہاؤس تک ہی تو جانا چاہتے تھے۔ اگر وہ بیہودہ آدمی درمیان میں آ جاتا تو، مگر وہ بھی شاید کوئی اسکیم تھی، پولیس کو شاید اس سگنل کا انتظار تھا"۔ اجنبی اب قصے

لکھنے والے کی طرح آسودہ ہو بیٹھا۔

جب لڑکوں نے اس عمارت سے اینٹیں اُٹھا کر پھینکنی شروع کی ہیں تو پولیس نے اس سے پہلے ہی اپنی بندوقوں کا رُخ اُوپر کی طرف کر رکھا تھا، وہ پیچھے ہٹے اور انھیں لڑکوں کی طرف تانے ہٹتے گئے۔"

"یہ تصویر آپ نے دیکھی ہے؟" اجنبی نے پھر تھیلا کھولا اور تصویروں کا پلندہ میز پہ رکھ کر اس میں سے وہ تصویر نکالی اور پھر اسے کیدار کی طرف بڑھایا "دیکھا آپ نے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کیدار کی کرسی کے قریب جا کھڑا ہوا "اس سے پہلے کہ لڑکے ان پہ حملہ کریں پولیس نے ان کو اپنی بندوقوں کے نشانوں کی زد میں لے رکھا ہے۔"

تارا نے تصویر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی بھلا اب تصویروں سے کیا ہو سکتا ہے جو خون میں لت پت تڑپتے رہے ان کو تصویریں کہیں دوبارہ لا سکیں گی۔

اجنبی نے تصویر واپس تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا "جب پولیس والے پچھلی طرف سے نسبتاً محفوظ ہو گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ وہ لڑکوں کی پہنچ سے دور ہیں تو انھوں نے لڑکوں کو نشانہ بنا لیا اور بچے کبھی بھی انکے اتنا نزدیک نہ ہوئے کہ اپنی اینٹوں سے ان میں سے کسی ایک کو زخمی کر سکیں، دیکھا آپ نے کوئی بھی تو سپاہی زخمی نہیں ہے تصویر میں گرے ہوئے تمام کے تمام لڑکے ہیں۔"

پھر انھوں نے فائر کھول دیا۔ گولیاں تڑتڑ برسنے لگیں جیسے اولے ننگی زمین پہ برسیں۔ لڑکے حیران تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی جلوسوں میں یہ سب کر چکے تھے اس سے بھی بڑے بڑے جلوس نکل چکے تھے وہ اس سلوک کے لیے اتنی جلد تیار نہیں تھے۔ اس آواز کو اور دائیں بائیں بندوقوں کی اٹھتی ہوئی نالیاں اپنی طرف دیکھ کر بھی انھیں اعتبار نہیں آیا، وہ کھڑے کے کھڑے رہے۔ پھر وہ چیخے اور پناہ گاہوں کی طرف بھاگے۔ ان میں سے کئی ایک سڑک کے کنارے کھڑی موٹروں کی اوٹ میں چھپے، کچھ ان دکانوں کی طرف بھاگے جن کو ذرا دیر پہلے وہ لوٹ کر برباد کر چکے تھے، ان میں سے کئی ایک ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور گولیاں ان کے دائیں بائیں سے

گزر رہی تھیں۔

پھر ایک دم انھوں نے فائر کرنا بند کر دیا جیسے دوسرے حکم کے منتظر ہوں، اعلان کرنے والی گاڑیاں بھاگتی رہیں "سڑک خالی کر دو اور جلوس ختم کرو۔"

"پھر زخمیوں کو اٹھانے والی گاڑیاں شور مچاتی آئیں اور سڑک پر سے خون دھونے کے لیے مرنے والوں کو ہٹا کر کارپوریشن کی چھڑکاؤ کرتی ہوئی لاریاں گزریں اور سب پندرہ منٹ سے بھی کم عرصے میں ہو گیا، کیا یہ سب یونہی ہو گیا، کیا یہ سب سوچی سمجھی اسکیم نہیں تھی؟"

کیدار نے کہا "میں یہ تو نہیں کہہ رہا مگر حکومت کو اتنی بے رحمی سے کیا فائدہ ہوتا ہے"

اجنبی اٹھا "آپ کو یہ باتیں کبھی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ حکومت کی مشینری کے کل پرزے ہیں۔" اس کی آواز میں بلا کی کاٹ تھی۔

اچھا شیام داس بابو میں اب چلتا ہوں اس نے تھیلا کندھے سے لٹکایا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ان کی طرف گیا۔

"اگر حکومت اعلان کر چکی ہے کہ صرف دو لڑکے مرے ہیں تو وہ باقی لاشیں کسی صورت نہیں دے گی۔"

اجنبی نے دیوی دیال سے کہا "آپ لاکھ کوشش کریں، سفارشیں اور منتیں کوئی شے انھیں اس رحمدلی کے مظاہرے پر مجبور نہیں کرے گی۔"

دیوی دیال نے کہا "کون مسخرہ رحمدلی کی بھیک مانگتا ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ راگھو کا پتہ چل جائے وہ زندہ ہے یا مُردہ۔"

اجنبی نے شیام داس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اچھا اب میں چلتا ہوں مجھے آپ لوگوں کی کامیابی کی اُمید تو کم ہے مگر پھر بھی میں دُعا کروں گا۔"

شیام داس نے سر جھکا دیا۔ اجنبی نے تارا کو نمسکار کیا۔ کدم کی طرف ہاتھ جوڑے اور چپ چاپ پھاٹک میں سے نکل گیا پھر کیدار اور پرکاش بھی اپنے آپ کو اس سارے ماحول میں اجنبی سمجھ کر اٹھے اور کسی سے کچھ کہے بنا سڑک پر نکلے جہاں اعلان کرتی ہوئی لاری ہارن بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ لاؤڈ سپیکر کہہ رہا تھا شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگ گئی ہے قانون

کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

وہ دونوں اس تختی کے گرد موم بتیاں جلا کر ابھی واپس آئی تھیں جسے طالب علموں نے ہنگامے میں مرنے یا لاپتہ ہونے والوں کی یاد میں اُسے بڑے درخت کے تنے میں لگایا تھا، دن کے وقت تو راہگیروں کو معلوم ہی نہیں ہو پاتا تھا مگر رات کے سمے اس تختی کے گرد روشنی ہوتی تو وہ نام چمکتے اور تیز موٹروں میں گزرنے والے سوچتے کبھی دن کو آکر وہ اُن سب ناموں کو غور سے پڑھیں گے، کچھ سوچتے، بجلی کی تیز روشنی میں یہ ذرا ذرا سی کمزور بتیاں جلا کیا روشن کر سکتی ہیں، یونہی بیکار یہ بتیاں جلاتے ہیں لوگ۔

کدم نے تخت پر بیٹھے ہوئے کیدار کو دیکھا، وہ سر جھکائے اس روش پر سے آرہا تھا جس پر سے کبھی راگھو کی سائیکل زناٹے سے گزرتی تھی اور بہار کی اس شام کی یاد اُسے آئی جب وہ آخری بار اس پر سے گاتا ہوا گزرا تھا، فوارے کے پاس پاؤں ٹکا کر ایک لمحے کو وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا تھا اور پھر وہ شام گزر گئی تھی اور اب گرمی بیت چلی تھی، ہوا میں ٹھنڈ کا احساس تھا جو بہار کی طرح نرم اور جی کو بے گائے گیتوں سے بھر رہا تھا، دیوانے خیال سر میں گھومتے تھے، زندگی کا چکر چلتا ہی رہتا ہے، تیزی سے اور بنا رُکے۔

تارا نے پلّو سر پر اوڑھ لیا۔

"آیئے آیئے۔" کدم نے کرسی ذرا پرے روشنی کے قریب کرتے ہوئے کہا، وہ برآمدے کی سیڑھی پر ذرا کی ذرا رُکا، اپنے گرد سے اٹے جوتوں کو پائیدان پر رگڑا اور پھر اندر آکر بیٹھ گیا۔

"میں چائے کے لیے کہوں۔" کدم نے سلیپر گھسیٹے اور جلدی سے چیتن کی طرف چل دی۔

"استعفا کیوں بھجوا دیا ہے؟" کیدار نے تارا کی طرف دیکھا۔ وہ فائلیں جوڑ کر رکھ رہی تھی۔

"یونہی" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، یہ یونہی نہیں ہو سکتا! راگھو کے گم ہونے اور چاچا کے مرنے کے باوجود تم کام کرتی رہی ہو، اب کوئی تو بات ہوئی ہوگی!" وہ بہت جلدی میں تھا اور بے حد پریشان لگتا تھا۔

"کیدار بابو، آپ یہ تو مانتے ہیں ناکہ آدمی کو کبھی کبھار گیان ہوتا ہے۔" تارا نے پوچھا "تو سمجھ لیجیے کہ مجھے بھی گیان ہوا ہے۔ ایسوسی ایشنیں بنانے اور جان کھلانے وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، یہاں تو کم از کم یہی ہوتا ہے، پھر بے کار کام کرنے سے فائدہ، آدمی کو زندگی میں اور ناکامیاں کیا کم ہیں کہ اس میں ایک اور بڑھائی جائے، حکومت کو جب کچھ کرنا ہوگا تو کر ڈالے گی۔" تارا چُپ ہو گئی۔

"تمھارے اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں اور پھر تم نے یہ یکایک فیصلہ از خود کیسے کر لیا؟" کیدار اپنا مطلب واضح نہیں کر پا رہا تھا۔ "میں میٹنگ سے اٹھ کر سیدھا آرہا ہوں اور لوگ ابھی آنا چاہتے تھے مگر میں نے سوچا پہلے میں دریافت کر لوں۔ تمھیں بنا کوئی وجہ بتائے ایسوسی ایشن کو چھوڑنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔"

"ادھیکار تو میں نے کبھی اپنا بھی اپنے پر نہیں جانا کیدار بابو۔" تارا نے دھیرے سے کہا۔

اُس کی آواز میں کیدار کو لگا پُرانے دِنوں کی آہٹ ہے۔

"تمھارے بنا کام نہیں چل سکتا۔" کیدار نے منت سے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، بچّوں کی سی۔ کسی کے مرنے سے کسی کا کام نہیں رُکا اور پھر میں تو آپ لوگوں کے ساتھ مل کر سوچتی تھی، میرے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تارا نے تیزی سے کہا۔

"تمھارے نہ ہونے سے مجھے لگتا ہے میرے آگے پیچھے اندھیرا ہے، مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔" کیدار جذباتی ہو رہا تھا۔

تارا نے قہقہہ لگایا جیسے کوئی تالاب میں ذرا سی کنکری پھینکے "یہ بھی آپ کا

وہم ہے، کسی کے بنا کسی کی زندگی میں اندھیرا نہیں ہوا کرتا۔ اب دیکھ لیجیے رگھو نہیں رہا تو کیا ہم جی نہیں رہے ہیں؟ بھگوان نے آدمی کو بنایا ہی ایسا کٹھور اور بوجھ سہارنے والا۔" وہ چُپ ہو گئی۔

"تارا، مَیں نے زندگی میں بہت غم سہے ہیں، بہت بوجھ میرے کندھوں پر ہیں، ان میں لگتا ہے اگر ایک تنکا بھی اور بڑھا تو مَیں ڈھے جاؤں گا۔" کیدار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "میں تمھیں دیکھے بنا نہیں جی سکتا، مَیں تمھاری پُوجا کرتا ہوں۔ تارا، تم نہ رہیں تو مَیں کیا کروں گا؟"

"پوجا کوئی کسی کی نہیں کیا کرتا اور پھر مَیں تو عجیب عورت ہوں، کسی کے لیے بھی کچھ نہیں بن سکتی۔ آپ بیٹھ جائیے نا!"

"تمھیں پوجنا مجھے خوشی دیتا ہے تارا۔" کیدار بیٹھ گیا۔

"کیدار بابو ساری چاہتیں فضول اور محبتیں بکواس ہیں، آخر ختم ہو جاتی ہیں کوئی سدا ایک سی شدت سے کسی کو چاہ نہیں سکتا، ہولے ہولے، وقت بڑے سے بڑا زخم بھر دیتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم رگھو کے لیے کیسے بیتاب ہوئے ہیں، اُن دنوں یوں لگتا تھا ہم زندہ نہیں بچیں گے۔ چاچا تو اس دُکھ سے چلے گئے مگر ہم لوگ کھاتے ہیں، ہنستے ہیں۔ زندگی کسی کے بنا نہیں رکتی، نہیں رکے گی۔" تارا سانس لینے کو رُکی۔ "اور یہ بھی بھلا کوئی چاہت تھی؟ پھول کو توڑنے اور اسے مسلنے کی شدید خواہش، میرا خیال آپ کے لیے چیلنج بن گیا ہے، آپ کے لیے میں دردِ سر بن گئی ہوں، اس لیے کہ آپ بہت جذباتی آدمی ہیں۔" تارا نے سر پر پلّو پھر ڈھانپا، کیدار نے دیکھا اس کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے جیسے پھول کی تازگی اور اس کی باس ٹہنی پر لگے لگے ختم ہو رہی ہو۔

کیدار کوئی بات کہنا چاہتا تھا مگر کدم کو آتے دیکھ کر چُپ ہو گیا۔

"آپ لوگ چُپ بیٹھے ہیں؟" اُس نے بیٹھتے ہوئے کہا "بیتین چائے لا رہا ہے بس۔"

پھر شیام داس کھنکارے، وہ دیوی دیال کے ہاں سے آ رہے تھے اور باڑھ میں سے بنے راہ سے اندر آئے تھے۔

کیدار نے اُٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا، وہ دونوں سیاست اور ہڑتالوں اور نہ جانے کاہے کا ہے کی باتیں کرنے لگے وہ پہلے دنوں کی طرح بڑی دلچسپی سے اُن کی ایسوسی ایشن کا پوچھ رہے تھے وہ بڑی ہمت سے بیٹے کی جدائی برداشت کر رہے تھے۔ صرف وہ راگھو کا نام کسی کی زبانی سن نہیں سکتے تھے، غم سہنے کے اپنے اپنے انداز ہیں نا!

تارا اُٹھ کر جانے کب کی جا چکی تھی اور لان پر رات کا اندھیرا سٹرک پر جلتی بتیوں کی وجہ سے بڑا دھندلا اور میلا لگ رہا تھا، اس میں کوئی شے دکھائی بھی نہیں دیتی تھی۔

"موسی، موسی" کدم نے پکارا "یہ فائلیں کیسی ہیں؟ کیا کیدار بابو کو دے دوں؟"

"یہ ایسوسی ایشن کی ہیں، کیدار بابو کو دے دو" اس نے لان میں سے کہا، وہ شاید فوارے کے پاس بیٹھی تھی۔

فائلیں لیے لیے وہ کتنی دیر کھڑا رہا اور پھر شیام داس کو نمسکار کر کے وہ فوارے کی طرف آیا۔

"یہ فائلیں مکمل ہیں کیدار بابو" تارا نے اسے قریب آتا دیکھ کر کہا۔

"تارا، میں کچھ اور پوچھنے آیا ہوں" کیدار نے حوصلے سے کہا۔

"میرے خیال میں اب تو کچھ بھی کہنے اور سننے کو باقی نہیں رہا"

اس کی آواز میں نرمی کے باوجود بہت تلخی تھی اور دھیرج میں اتنی بے رُخی جانے کیوں کیدار کو گیان ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، شاید کہنے اور سننے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

اور پھر وہ فائلیں لیے لیے اسی روش پر سے ہوتا ہُوا باہر نکل گیا۔

شبِ تار کا رنگ

پتہ نہیں آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے کہ نہیں۔ میرے ساتھ تو سدا یوں ہی ہُوا ہے جب بھی میں نے اپنے پیچھے دیکھا ہے تو اندھیرا ہی دکھائی دیا ہے کوئی نقش بھی صاف نہیں، ساری چیزیں جن سے میں نے اپنا دل لگایا ہے، ریت کی بنیادوں پر کھڑی لگی ہیں کہ بس ڈھے گئی ہیں۔ مجھے تو دنیا نمائش گاہ میں سجائے گئے اسٹالوں کی طرح لگتی ہے کہ بانس اور کچی اینٹوں کو ڈھانپ کر ایک جادو گھر بنایا گیا ہے اور ختم ہونے کے بعد بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ویرانی ہوتی ہے اور میرے ساتھ تو ہونا بھی یونہی تھا۔

جیل کی اس کوٹھری میں آہنی سلاخوں کے پار سے جانے کیسے ایک کرن کبھی کبھار آنکلتی ہے۔ گشت کرنے والے سپاہی کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ کے سُر تال پر گھڑی بھر ناچتی ہے اور پھر خاموشی سے واپس چلی جاتی ہے۔ مجھے رجھانے کے لیے یہ مارجری سے بھی زیادہ بے چین دکھائی دیتی ہے۔ اپنے جلو میں بہاروں اور خوشبوؤں کو لانے والی یہ کرن یادوں کے دیے جلا جاتی ہے۔ میرے اینٹ کے تکیے کو سہلاتی، وہ مجھے بے قرار کر جاتی ہے میں جو اپنے مقدر کو قبول کر کے چند دنوں خالی الذہن تھا اداس ہو جاتا ہوں۔

جون کے مہینے کی تنہائی نے بھی مجھے کبھی اتنا بے پناہ اداس نہیں کیا تھا۔

رات کا پرندہ تیز تیز پر مارتا ان کوٹھڑیوں کے اوپر سے گزر رہا ہے ـــــ اندھیرے میں رنگوں کی چھوٹ سی نکلتی ہوئی جیسے کوئی جادو کا فوّارہ ہو جیسے مارجری کی کوئی نظم ہو جس کو اس کے مصوّر عاشق نے تصویر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

عجیب بات ہے کہ جن لوگوں اور یادوں کو میں بھلانا چاہتا ہوں وہی اُس اکیلی کرن کے ساتھ میری اس اندھیری کوٹھری میں گھس آتے ہیں۔

شارلٹ کا وہ خط بھی باقی کاغذات کے ساتھ کسی پولیس افسر کی ڈائری میں لگا ہوگا جس میں اس نے لکھا تھا۔

بیکار کی تنہائیوں اور پاگل آرزوؤں کو جوڑ کر میں نے ایک دیوتا بنایا ہے اور وہ ہے جنگ کے دنوں میں امن کی خواہش۔ گرجتے اور برستے جنگی جہازوں کی بے پناہ یورش میں بموں کے سائے میں سکون کا ایک مجسمہ۔ تم کہتے تھے میں وقت کا شکار اور فرصت کی ماری ہوں۔ تم کو جھٹلانے کے لیے نہیں، یونہی میں نے جہنم میں جنت کا تصور قائم رکھنے کے لیے یہ سب سوچا ہے اور جب میرا یہ خط تمھیں ملے گا میں ویتنام کی طرف پرواز کر رہی ہوں گی۔ ممّا کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ تمھارے جانے کے بعد سے وہ اور زیادہ مصروف ہو گئی ہیں۔ مستقل مہمانوں کے ٹھکانے بھی جلد جلد بدلتے ہیں۔ آج کل ایک مصوّر کا ڈیرہ ہے جو تم سے بھی کم عمر ہے۔ ممّا کو پوجنے کی حد تک چاہتا ہے مگر اب جب کہ تم واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بھلا تم کو حسد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر ممّا کا اپنا زندگی گذارنے کا طریقہ ہے۔ وہ جاگتے جسم اور سوتی حسوں والی عورت جو اتفاق سے میری ماں ہے جس کا زہر آلود جسم ہر زندگی میں زہر بھر دیتا ہے جس نے صرف جنس کے سہارے خیالوں کو پرورش کیا ہے جس کے گرد ہمیشہ تو، میں اکٹھا رہے ہوں بھلا وہ ڈھلتی عمر میں بے سہارا کیوں کر رہے گی (میں اس عاشق بدلتے رہنے کی عادت کے سخت خلاف ہوں) اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ میری چھوٹی بہن نے شادی کر لی ہے تو بھلا تمھیں کیا خوشی ہوگی مگر مجھے خوشی ہے کہ اس نے گھر بسا لیا۔ کچھ عورتیں گھر بسانے، بچے پیدا کرنے

اور دنیا کی آبادی بڑھانے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور میری طرح کی عورتیں اس لیے پیدا کی جاتی ہیں کہ وہ صحرانوردوں کی طرح اپنا بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھائے پانی کی تلاش میں ماری ماری پھریں۔

تم پوچھو گے کہ میں نے یہ خط تمھیں کیوں لکھا؟

میں سوچتی ہوں کہ مما کے چاہنے والوں میں سے صرف تم تھے جو اس کے جادو میں گرفتار نہ ہوئے۔"

شارلٹ کو کیا پتہ کہ میں اس کی مما کے جادو میں کس حد تک گرفتار رہوں۔ بھلا اسے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ جس زہر کا اس نے ذکر کیا ہے اس نے میری زندگی میں کس حد تک زہر پھیلایا ہے۔ خود اس کی زندگی کس حد تک زہر میں رنگی ہے اسے اس کی بھی خبر نہیں۔

وہ ساری عمر یونہی ماری ماری پھرتی رہے گی اور آخر میں اسے پتہ چلے گا کہ اپنی مما کی ضد میں اس نے جس سنہرے زمانے کو ٹھکرایا ہے وہی اس کا زمانہ تھا۔ ہر عورت کا ایک زمانہ ہوتا ہے اس کے بعد وہ گزر جاتی ہے۔ عورت ہوا کا ایک جھونکا ہے یا پھر ایک کرن جو اندھیروں میں بیتی گھڑیوں کو جگاتی ہے۔

شرلے کا موت کے رقص میں جانا بھی مجھے ایسا ہی لگا ہے جیسے وہ سڑک کے دوسری طرف کھڑی فلم کے آخری شو میں جانے کے لیے ضد کرے اور پھر سینما ہال میں جا کر کسی سیٹ پر لڑھک جائے۔

جب ڈم ڈم کے ہوائی اڈے پر میں نے اسے رخصت کیا تھا تو سیڑھی پر قدم دھر کر اس نے کہا تھا "مرلی، تم غلط کہتے ہو کہ عورتیں اپنے دیوتا آدمی ہی کو بناتی ہیں اور اب میں تمھیں تب ہی لکھوں گی جب میں اپنا دیوتا کوئی اور بنا لوں گی۔" آس پاس کھڑے اور جہاز میں چڑھنے کے منتظر لوگوں نے اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا تھا۔

مارجری نے ہنس کر اسے اوپر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹی اب دیر ہو رہی ہے اور لوگ بھی اوپر جانے کے منتظر ہیں۔ یہ سب باتیں

تو تم لکھ کر بھی کہہ سکتی تھیں۔"
شرلے نے بھاگ کر اوپر جانے سے پہلے کہا تھا" مگر میں مستقبل قریب میں اُسے خط لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، بالکل نہیں۔"
ہم دونوں ہنسنے لگے۔
مارجری نے باہر آتے ہوئے کہا تھا" شرلے کبھی بالغ نہیں ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں بچپن اسی طرح جھانکتا رہے گا۔"
میں نے کہا تھا" آدمی زیادہ دوسرے کے تجربے سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا مگر اچانک بچپن آنکھوں سے یوں الگ ہوتا ہے جیسے کسی نے کھال ادھیڑ دی ہو۔"
مارجری نے کہا تھا" مُرلی تم بہت خطرناک باتیں کرتے ہو۔"
میں نے کہا تھا" چاہو تو ان کی سچائی آزما دیکھو۔"
اس نے میرے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا تھا" تمھارا خون بہت گرم ہے مُرلی۔ تم ہر بات کی سچائی آزمانے پر تُل جاتے ہو۔ جب وقت گزرنے کے ساتھ خون کی گرمی کم ہو جاتی ہے۔ گالوں کے گلاب مرجھا جاتے ہیں۔ بالوں کی سیاہی میں سفیدی ملنے لگتی ہے۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑتی ہے تو آدمی کی سوچ بہت مختلف ہو جاتی ہے میں یہ سب باتیں اپنی نبضوں پر بیتے حادثات کو یاد کر کے کہہ رہی ہوں۔ ابھی تو تم ایک تجربے میں سے گزر رہے ہو۔"
میں نے اس گھڑی کندھے اُچکا کر خالص امریکن انداز میں "لعنت" کہا تھا کیونکہ میں ان دنوں امریکن انداز سے سوچتا تھا اور مارجری کی شاگردی کرتا تھا۔ مارجری سے میری ملاقات ایک خالص ادبی جلسے میں ہوئی تھی۔
لوگ اپنی لمبی لمبی نظمیں پڑھ کر سنا رہے تھے ان پر بحث ہو رہی تھی۔ نئے نئے مطالب وضع کیے جا رہے تھے۔ آزادیٔ وطن سے لے کر آزادیٔ فکر اور آزادیٔ فرد تک ہر بات پر اظہارِ رائے ہو رہا تھا۔ کچھ لوگوں پر اس ساری گفتگو سے رعب طاری تھا، کچھ چپ چاپ بیٹھے تھے وہ بھی اس جلسے میں کسی دوسرے غیر ملکی کے ساتھ آئی تھی جسے مشرقی زبانیں سیکھنے

کا دعویٰ تھا مگر جو کوئی بات بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا اور پھر جب وہ تشریح کرنے کے لیے مضحکہ خیز انداز میں اس کی طرف جھکتا تھا تو اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ ایک عجیب مسکراہٹ تھی جو ان نظموں اور نثروں کا تمسخر اڑاتی ہوئی لگتی تھی۔

میں ان کے قریب بیٹھا تھا اور گفتگو کے ٹکڑے میرے کانوں میں بھی پڑ رہے تھے پھر میں نے بنا اپنے تعارف کے اُس کی طرف جھک کر کہا "اگر آپ سمجھنا چاہتی ہوں تو میں تشریح کرنے کی کوشش کروں گا۔"

مگر ان سب باتوں کی کوئی شرح نہیں ہو سکتی کیونکہ ان سب نظموں کا کوئی مطلب نہیں۔ نوجوانوں کا ایک گروہ پرانے شاعروں اور ان کے کلام کی اہمیت کو کم کرنے اور غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی انفرادیت کا الگ مینار تعمیر کرنے کی کوشش میں تھا۔ سارے جواں سال لوگ تھے جن کے خون گرم اور دماغ کچے تھے۔ وہ اپنے پیمانے خود بنانا چاہتے تھے اور اپنی ناپختہ تمناؤں کے چراغ لیے تاریک ایوانوں میں گھومتے تھے۔ وہ خونِ جگر لگائے بنا شہرت کے طالب تھے۔ میں نے اُن دنوں نیا نیا اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ مجھے بھی اس ماضی سے کوئی پیار نہیں تھا جس ماضی میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا مگر میں اس نئے پن میں ایک بوکھلاہٹ پاتا تھا جیسے کوئی کھسیانہ ہو کر گالیاں بکنے پر اُتر آئے۔ ہم ماضی کی روایتوں سے اپنا رشتہ تبھی توڑ سکتے ہیں جب اس کی روشنی میں نئی روایتوں کو بنانے کے اہل ہوں۔ ہم لوگ جو دو دنیاؤں کے سنگھم پر ہیں پچھلی دنیا جو مردہ ہے اور نئی جو تخلیق کے درد میں مبتلا ہے۔ کبھی کبھار ایسی مجلسوں میں بیٹھے میں بھول جایا کرتا تھا کہ میں کہاں ہوں بحث دُور سے آتی شوش آمیز صداؤں کی طرح سمجھ سے بالاتر ہوتی۔ بڑے اُلجھے ہوئے بھاری بھرکم لفظوں اور مغربی ادب کے حوالوں سے بوجھل جس میں بولنے والے کو بات کہنے سے زیادہ اپنی علمیت جتانا مقصود ہوتا تھا۔ پھر ہم سب مل کر کسی مبہم سی دُور از کار بات میں اُلجھ جاتے۔ مارجری اپنے نئے انداز سے سجا ہوا سر ہلاتی رہتی اور مسکراتی رہتی۔ ان دنوں میرے درد کو کم کرنے کے لیے اس کا وجود ایک نعمت سے کم

نہیں تھا۔

پونم کی اس رات اس کرن کے ساتھ اترتی ہوئی نرمی ماں کے ہاتھ کی طرح ہے۔ میرے اندر کی سختیوں پر اپنا محبت بھرا لمس ایک مہر کی طرح ثبت کرتی ہوئی اور پھر فوراً بعد مجھے مارجری کا وجود اپنے وجود کے اندر سے اُبھرتا ہوا لگتا ہے۔ پھر پہریدار کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ ہے اور واپس جاتی ہوئی اس کرن کی ٹھنڈک، چاند اپنے سفر پر اور آگے بڑھ گیا ہے اور ایک رات دن کے گلے ملتے بادلے کے گھونگھٹ میں چپکے سے مسکراتی ہے۔

"یہ راہیں تاریک ہیں مُرلی" ماں کی طرح کوئی آواز میرے کان میں کہتی ہے۔ یہ تو مارجری کی آواز ہے، میں اُٹھ بیٹھا ہوں اور اس تاریک کوٹھری کے باہر اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

(کبھی کبھار کوئی گھڑی آدمی کی زندگی میں ایسی آتی ہے کہ وہ فیصلہ کن ہوتی ہے تم سمجھتے ہو کہ اور فیصلوں کی طرح تم اس کے بدلنے پر قادر ہو گے مگر ہوتا یوں ہے کہ تم اسے بدل نہیں سکتے۔ پھر تم پر بڑے دکھ کے لمحے میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ اس ایک گھڑی کے غلط فیصلے کا نتیجہ ہے مگر تم گزرے وقت کو کیسے واپس لا سکتے ہو؟)

اب اگر میں جھنجلاہٹ میں ان دیواروں کے ساتھ سر پھوڑوں اور اس زہر کو تھوکنے کی کوشش کروں تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زہر کی نیلاہٹ مجھے صرف مُرلی رہنے دے گی۔ مُرلی منوہر نہیں بنائے گی گو مارجری نے میرے نام کی تشریح اور ملنے سلنے کے بعد مجھے ہمیشہ مُرلی منوہر کہا ہے۔ من ہر گردھر۔ کرشن کنہائی۔ اور اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے میرے وقت اور میری زندگی پر اس نے ڈاکہ ڈالا تھا۔ وہ مجھے یہ سب سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو رادھیکا کہتی تھی۔ اس کونے میں جیل کی اس تاریکی میں جب میں کچھ بھی نہیں صرف ایک قیدی ہوں وہ بیتا وقت بھی مجھے کوئی تسلی نہیں دے سکتا کوئی یاد نہیں کوئی خوش آئند واقعہ نہیں۔ بس دل کو ٹکڑے کرنے والا پچھتاوا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ امریکی عورت جو میری ماں ہو سکتی تھی؟

رتی کی ضد میں مَیں نے یہ سب کیا۔
بابا کی ضد میں مَیں نے اپنے آپ کو تباہ کیا۔
کالج کا وہ زمانہ جب مَیں اپنی ہر بات کو منوانے کا عادی ہو چکا تھا۔ کالج یونین کا سیکرٹری تھا اور نت نئے ریزولیوشن پاس کرواتا رہتا تھا۔ پرنسپل مجھ سے ناراض ہوتا مگر میری ذہانت کی وجہ سے مجھے برداشت کیے جاتا تھا۔ ہماری میٹنگوں میں بحثیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ مَیں اپنے کیس یوں تیار کرتا تھا جیسے ایک ماہر فن وکیل کو عدالت میں پیش ہونے سے پہلے اپنے مقدمہ کی تیاری کرنا ہو۔ لڑکے میرے مداح تھے اور استاد میری لیاقت کے قائل تھے، حکومت کی جو بات بھی ہمیں ناپسند ہوتی ہم اس کے خلاف ریزولیوشن پاس کرتے، تقریریں ہوتیں، غصے کا اظہار کیا جاتا اور بعض حالات میں ہم لوگ کامیاب ہو جاتے۔ ہمارے جوان خون کی گرمی ہمیں بے قرار رکھتی تھی اور یہ بے قراری زندہ قوموں کے افراد کے لیے ضروری سمجھ کر حکومت کبھی ہمارے کاموں پر معترض نہیں ہوتی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں جمہوری حکومت ہو، عوام کو اپنی بات کہنے اور منوانے کا حق تو ہوتا ہے۔

ہولے ہولے ان جلسوں میں ایک اور آواز اُبھری اور وہ آواز رتی کی تھی۔
تب مجھے معلوم ہوا کہ میں کس قدر کمزور ہوں اور کتنا بے بس۔ رتی کی آواز اور اس کے حسن سے مَیں متاثر نہیں ہوا۔ کئی سالوں سے ہم لوگ ہم جماعت تھے۔ وہ معمولی خدوخال کی ایک عام سی لڑکی تھی جو دھیان سے لیکچر سنتی اور گھر سے سیدھی کالج اور وہاں سے گھر جاتی تھی۔ اس کے گرد سہیلیوں کا جمگھٹا نہیں ہوتا تھا۔ وہ حیران کرنے والی حد تک ذہین بھی نہ تھی۔ مَیں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ دراصل مجھے توجہ دینے کا وقت کہاں تھا، میرا دماغ یونہی آسمانوں پر رہتا تھا۔ پڑھنے اور خون کی بے چینی دور کرنے سے جو وقت ملتا اس میں لڑکیاں اور لڑکے میرے گرد رہتے۔ کالج کی اتنی اہم ہستی کو بھلا ایک غیر اہم سی لڑکی کی کیا

پرواہ۔

پھر جب رتی نے جلسوں میں بولنا شروع کیا ہے تو اس میں وہ جھجک نہ تھی جو عام طور پر لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ اس کی آواز سیدھی سپاٹ تھی، وہ مطلب کی بات کہنے میں بہت ہی اختصار سے کام لیتی۔ یونین میں میرے خلاف ایک گروہ بن رہا تھا جو رتی کی آواز پر کان دھرتا تھا مگر اس گروہ کو میں نے کبھی رتی کے گرد نہیں دیکھا، وہ اپنے گرد لوگوں کو جمع کرنے کے خلاف تھی، اگر کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اسے بڑے روکھے پن سے جواب دیتی۔ میرا خیال ہے میری طرح اسے کسی شئے سے ضد تھی اور وہ دکھاوے اور شور سے تھی۔

اس کی وجہ سے کئی ریزولیوشن جو میں پہلے سمجھتا تھا کہ چٹکیوں میں پاس کیے جا سکتے تھے اب ہفتوں کی بحث کے بعد بھی وہیں کے وہیں رہتے۔ مجھے رتی سے اتنی ضد ہو گئی کہ وہ ہولے ہولے میرے خوابوں کی پرچھائیں بن گئی اور پھر میرے لاجانے ہی وہ میرے دل میں آ بسی۔

اگر رتی کو میرے دل کے ان آگ کی طرح کے جذبوں کا پتہ چل جاتا تو جانے کیا ہو جاتا مگر اسے تو آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ میں یہ کھلی شکست کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میرا رویہ اس کے خلاف اور سخت ہوتا گیا۔ میں نے اپنی بات منوانے اور اس سے ٹکر لینے کے لیے اپنے گروہ میں بیٹھ کر اس کے خلاف وہ زہر اُگلا ہے یوں اس زہر کے رستے سے میں نے اسے اپنے دل سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی ہے مگر اسے شاید ضد تھی۔ ہم نے جماعت میں کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کی کبھی ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھا مگر رتی کے وجود کا اتنی شدت سے احساس مجھے ناکارہ کر گیا۔ میں اپنی بحثوں میں دلائل سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگا۔ میں ہر قیمت پر اسے شکست دینا چاہتا تھا۔ وہ سٹیج پر آتی تو میرا گروہ تالیاں بجاتا۔ فقرے بازی کرتا مگر اس کی ہمت اور جرأت کہ اس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ وہ ڈیسک کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی اور سب کی طرف دیکھ کر اپنی بات کہتی اور نیچے اُتر

جاتی۔ میں گرم خون کی رَو کو اپنے دل سے دماغ کی طرف آتے محسوس کرتا مگر کچھ نہ ہو پاتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے۔

پھر امتحان سر پر آگئے۔ ہمیں تیاری کی چھٹیاں ہوگئیں۔ تب لائبریری میں بیٹھے یکایک میں نے محسوس کیا کہ رتی میری زندگی میں کیا بن گئی ہے۔ لمبی دوپہر میں کھلی کتاب سامنے رکھے میں اس کی ایک ایک حرکت، ایک ایک نگاہ یاد کرتا۔ کتاب کے لفظ میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ ان دنوں میرا رنگ زرد پڑ گیا ہوگا کہ ایک دن ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے بلا کر مجھے کہا:

"مُرلی، تم اپنے کھانے کا دھیان رکھا کرو۔ اتنی محنت ضروری تو ہے مگر تمھاری صورت پر کھنڈی زردی اس بات کا نشان ہے کہ یہ تمھیں راس نہیں آرہی۔"

دوست ملنے آتے اور کوئی بحث چھیڑتے تو میں بیزار ہو کر پلنگ پر لیٹ جاتا اور چادر سے منہ ڈھانپ لیتا۔ امتحان اور قریب آگئے ــــــــ امتحان ختم ہو گئے۔

رتی ایک ایسی یاد بن گئی تھی جس میں دُکھن ہی دُکھن ہو۔

آخر مجھے کس شئے کی چاہت تھی؟ مجھے کس چیز کی تمنا تھی؟ کبھی دل چاہتا تھا کہ رتی سے جا کر معافی مانگ لوں، اس کے قدموں میں سر رکھ دوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ماں کی طرح میرے سر پر ہاتھ رکھ دے، مجھے ایک بار مُرلی کہہ کر پکارے، اور جانے میں کیا سے کیا ہو جاؤں۔ میں سوچتا تھا محبت کا ایک بول آدمی کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ ان دنوں میں نے شدت سے جاسوسی کہانیاں پڑھی ہیں۔ پرانے محبت کے قصے، مثنویاں، انگریزی کے ناول مگر دُکھن میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نتیجہ تک میں اس اُمید پر ہوسٹل میں رہا کہ شاید نتیجے کے بعد رتی کالج میں آئے اور اس کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔

ساری باتیں کتنے پاگل پن کی ہیں، دیوانگی اور بے وقوفی کی۔

مَیں شہر کی سڑکوں پر یونہی گھومتا، ایک ایک چہرے کی طرف دیکھتا، اس امّید پر کہ شاید کہیں اس کی ایک جھلک دکھائی دے جائے، شاید وہ بازار میں کبھی نکلے۔ مَیں ایک جگہ جاتا اور وہاں سے نا امّید ہو کر دوسری جگہ کی طرف بھاگتا۔ وہاں سے تیسری طرف، ایک پاگل کی طرح میں چکروں میں گھومتا اور جب رات گئے لوٹتا تو تھکن سے چُور ہو کر سو جاتا۔ جون کی بے پناہ گرمی میں میں ننگے سر لوئی اڈہ کی طرف جاتا، پسینے سے شرابور ہو جاتا مگر چلتا رہتا۔ پھر واپس آتا اور ہوسٹل جاتا۔ ایسا پاگل پن، آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ وُہ دن، جب میرے برابر ایک ٹیکسی آن کر رکی اور کسی نے کہا تھا:

"مرلی صاحب، آیئے میں آپ کو لفٹ دے دوں، میں بھی اتفاق سے شہر جا رہی ہوں۔"

مَیں رتی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر گھبرا کر بنا کچھ جواب دیے آگے کی طرف چل پڑا۔ کیا وہی تھی جس کے لیے مَیں نے یہ سب کچھ برداشت کیا تھا؟ جب ٹیکسی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو مَیں اس سڑک پر میلوں رتی کو پکارتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ مجھے لگا تھا درختوں میں چھُپے بیٹھے پرندے میری ہنسی اڑا رہے ہیں۔ شاخوں میں سے جھانکتے وہ مجھے دیکھ کر میرے گرد اڑتے ہیں۔ راہ کے ریستورانوں اور چائے خانوں میں لوگ کھڑکیوں اور دروازوں سے لگے مجھے پکارتے رہے، پتہ نہیں اس شام میں کس طرح سے ہوسٹل پہنچا ہوں۔

دنوں بعد میں ایک نظم پڑھ رہا تھا جس کو لکھنے والا مَیں ہی تھا۔ مجلس میں بیٹھے سارے لوگ چُپ چاپ سن رہے تھے میں خود حیران ہو رہا تھا کیا یہ نظم میں نے ہی کہی تھی۔ میں تو ایک نیا شاعر تھا جس کو لوگ ایک نادر نمونے کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیے پھرتے تھے۔ میری نظم ایک ہی نشست میں گویا بس گئی۔ لوگوں نے اُٹھ اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملائے۔ بزرگ شاعروں نے میرے کندھے تھپتھپائے

جوان لڑکوں نے مجھے گلے سے لگایا۔ میرے اندر کا آدمی سٹپٹایا، پریشان ہوا مگر میں شاعر بن چکا تھا۔ جُون کی اُس دوپہر نے مجھے شاعر بنا دیا۔ اس دن کی گرمی نے میرے اندر کی گرہیں کھول دیں، میرے دل کا سیسہ گرم لاوا بن کر لفظوں میں ڈھلا۔

اظہار کی یہ ساری صورتیں عدم سے وجود میں آنے کے یہ سادے قصّے۔

مَیں رزلٹ کے بعد ہوسٹل سے گھر اُٹھ آیا تھا اور میری شامیں کافی ہاؤس میں گزرتیں۔ ہم لوگ بے تحاشا چائے پیتے اور بے کار کی بحثوں میں اُلجھے رہتے، میرا دل کہیں نہ لگتا، مَیں مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور میرے خوابوں میں خوبصورت بنگلے اور سرکاری گاڑیاں بھی لفظوں کے ساتھ ساتھ اُبھرتی ڈوبتی صورتوں کی طرح تھیں اس سے پہلے لفظ میرے لیے بے جان کھلونے تھے مگر اب وہ میری نبضوں کے ساتھ دھڑکتے تھے اور میری سانسوں میں ان کی خوشبو رچی تھی۔ ہم دو ساتھیوں کی طرح تھے میں اُن کے لیے ایوان سجاتا تھا اور وہ میری آرزوؤں کا محل تھے۔ میری نظمیں محبت کا المیہ نہ تھیں سرخوشی اور نئی امیدوں سے پُر تھیں۔ رتی کے وجود کی کوئی پرچھائیں بھی ان میں نہ تھی۔ اس زہر نے میرا علاج کیا تھا، مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ نئے پائے ہوئے خزانے کی خوشی میں مَیں ہر روز ایک نظم کہتا، میرے خیال آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔

مَیں جانے کیا بن گیا تھا۔

انہی دنوں میری دوستی چنڈی سے ہوئی۔

چنڈی داس نے بھی مارجری کی طرح مجھے تحفظ کا احساس دیا تھا۔ وہ ادب کے میدان میں کہنہ مشق تھا مگر ہم سب کی طرح کافی ہاؤس میں بیٹھتا تھا۔ اس نے ابھی وہ ترقی نہیں کی تھی جو لکھنے والے آدمی کو آدمی کم اور المیہ زیادہ بنا دیتی ہے۔ اس کی بات میں وزن اور رائے میں بالغ نظری تھی نئی پود حوصلہ افزائی کے لیے اس کی طرف دیکھتی تھی۔ مَیں نے کتنا طویل راستہ چنڈی کی انگلی کو پکڑ کر پار کیا ہے۔

جانے وہ اور مَیں اتنے قریب کیسے آئے تھے۔ کچھ یاد نہیں پڑتا۔ شاید اس نے

میرے خیالوں کی ناپختگی اور میرے اندر کے گھبرائے ہوئے نئے آدمی کی بے وقوفی کو محسوس کیا تھا کہ مجھے مشورہ دیا تھا "روز ایک نظم لکھنے سے تم بہت جلد اپنے جذبات کے ذخیرے کو ختم کر لوگے۔"

مَیں جو اپنے زعم میں بہت آگے نکل آیا تھا اس مشورے سے گھبرا سا گیا۔

چنڈی داس نے کہا "تم کو اگر وقت ہو تو میرے ساتھ گھومنے چلا کرو۔ کافی ہاؤس میں سگریٹ کے دھوئیں، شور اور چائے کی گرمی میں آدمی مدہوش ہونے لگتا ہے باہر سکون ہوتا ہے اور پھر آدمی جب چلتا ہے تو اس کے اندر خون تیزی سے گردش کرتا ہے۔"

مَیں ہنس پڑا تھا۔ کس بزرگانہ شفقت سے وہ مجھے بچانا چاہتا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا مَیں وہ سب باتیں چنڈی سے کہنے لگا جو مَیں نے کبھی سوچی تھیں۔ وہ بہت اچھا سننے والا تھا۔ اس نے کبھی مجھے نہیں ٹوکا۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا وہ اپنی بڑی بڑی ستاروں کی سی آنکھیں کھولے رہتا اور مجھے بولنے دیتا۔ مجھے کبھی کوئی مشورہ نہ دیتا اس کا خیال تھا۔

"محبت میں مشورہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی بھاگتے گھوڑے کو لگام پہنانے کی کوشش۔"

ان دنوں میں نے جی بھر کر رتی کی باتیں کیں۔ مَیں اور چنڈی ہنگامے سے دُور روشنی کی بجائے اندھیری اور خاموش سڑکوں پر چلتے رہتے، ہاتھ میں ہاتھ دیئے میلوں چلے جاتے اور مَیں رتی کی باتیں کرتا رہتا۔ ان ساری تنہائیوں اور دُکھوں کا ذکر کرتا جو مجھ پر بیتے تھے۔ وہ ساری طویل تقریریں سناتا جو مَیں نے کالج یونین میں کی تھیں۔

پھر جب کہنے کو کچھ باقی نہ رہا تو مَیں نے اس سے مشورہ چاہا۔

"اصل میں آدمی کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ آدمی کو بنایا ہی اس طرح گیا ہے کہ وہ ہر شے میں اپنے کو پوجتا ہے۔ میں نے تمھارے خیالات اور حالات سے تو کم از کم یہی اندازہ لگایا ہے کہ تم عمر کے حسین دَور سے گزر رہے ہو اس میں اپنے آپ سے محبت

ہونا لازمی ہے۔ تم نے خود اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔"

یہ انکشاف مجھے سرور کی طرح لگا۔ ٹھنڈک میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔

چنڈی نے اس چاندنی رات میں کسی بڑے بنگلے کے باہر رات کی رانی کی خوشبو کو پیتے ہوئے کہا تھا "افلاطونی محبت کا کوئی وجود نہیں۔"

"اس طرح سے تو تم محبت کے وجود سے ہی منکر ہو۔"

چنڈی داس نے ہنس کر کہا تھا "میں محبت کو خالص لمس سمجھتا ہوں۔ رتی کی کہانی تو کسی دیومالا کی کہانی ہے۔ تم کسی محبت میں سے جنس کو نفی نہیں کر سکتے۔"

"تمھارے نظریے کتنے زمینی ہیں۔ میں تو تمھیں بلند اور عظیم سمجھتا تھا۔" میری آواز میں تلخی تھی۔

چنڈی نے کہا "میں ایک اندھے کی طرح ہوں، مجھے حسن کا ادراک صرف لمس کے ناطے ہو سکتا ہے۔ مجھے دنیا اس وقت تک حسین نہیں لگتی جب تک چاندنی اور ہوا مجھ سے چھو نہ جائیں، اندھیرے کی مخملیں سطح کو بھی میں محسوس کرتا ہوں، چادر کی طرح اسے اپنے گرد لپیٹتا ہوں۔"

"اسی طرح میں بھی رتی کو محسوس کر سکتا ہوں۔" میں نے بات کرنے کی خاطر اور ضد میں آ کر کہا۔

"غلط کہتے ہو میرے دوست!" چنڈی نے ہنس کر کہا۔ "عورت کے اندھیروں کو محسوس کرنے کے لیے تمھیں اُسے اپنے گرد لپیٹنا پڑتا ہے اور رتی تمھارے لیے بھگوان کی مورتی کی طرح ہے اونچی اور پوتر اور پہنچ سے باہر اور کنواری۔"

میں خاموش رہا تو اس نے پھر کہا۔

"کوئی انسان کسی خیال سے بہت دنوں وابستہ نہیں رہ سکتا اور اس لیے میں کہتا ہوں لمس، قرب اور چھونے کے بنا محبت کا وجود ہی ممکن نہیں۔ ایسی محبت جس میں یہ سب کچھ ہو، ایک عظیم عیش کی طرح ہے جو آج تک مجھے نصیب نہیں ہو سکا۔"

ہم دونوں خاموش، بڑی سڑک کی مرکری لائٹس کے سایوں میں چلتے رہے۔
اس رات جب میں گھر آیا ہوں تو بابا کی طبیعت سخت خراب تھی۔ میری بڑی بہن ان کے پاس بیٹھی ہاتھ مل رہی تھی۔ رشتہ داروں کی بھیڑ اُن کے گرد تھی۔ سب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں جو کسی بے گانے گھر میں غلطی سے گھس آیا ہو۔

رات پتھر کی طرح نہ ہلنے والی سل کی طرح ہمارے سینوں پر دھری تھی اور پھر وہ بھی گزر گئی، اس کے بوجھ تلے دب کر بابا پھر نہ نکل سکے۔ جانے کیوں مجھے لگا جیسے کسی نے بے وقت بنا میری توقع کے ایک بوجھ مجھ پر رکھ دیا ہو۔

دنوں بعد میں چنڈی داس کو ایک طویل نظم سنا رہا تھا جس میں بھگوان سے گلے شکوے تھے اور آدمی کی مجبوریوں کا ذکر تھا۔

چنڈی نے سُن کر بہت سپاٹ آواز میں کہا "نظمیں لکھنا، ہے تو اچھی بات مگر ذرا غیر دلچسپ شغل ہے۔ اگر تم اپنے بھگوان سے گلے شکوے کرنے کی بجائے اس سے صلح کر لو تو کیا ہی اچھا ہو۔ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو۔"

میں نے کہا "بھگوان کو تم کوئی تھانیدار سمجھتے ہو جو مجرموں کو پکڑتا اور ان کی تلاش میں رہتا ہے۔"

چنڈی نے کہا "اگر تم اس سے گلے شکوے کرتے ہو تو اس کا مطلب ہے اس کی ہستی میں تمھارا یقین ڈگمگا رہا ہے۔ محبت میں شکوے کرنا میرا مذہب نہیں۔ تم کسی کو بھی اپنی پوری ہستی سے نہیں چاہ سکتے۔ تم اپنے آپ میں مبتلا ہو، اپنے سائے سے باتیں کرتے ہو۔"

میں چنڈی سے سخت بگڑ کر چلا آیا۔ بہت دنوں میں نے کافی ہاؤس کا رُخ نہیں کیا۔ اپنے امتحان کی تیاری میں دل لگا کر لگ گیا۔ اپنے گرد کتابوں کے ڈھیر لگا لیے۔ بابا مجھے ایک فرض شناس سول افسر بنانا چاہتے تھے۔ اُن کے بعد میں نے بے کار وقت ضائع کرنے کی بجائے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے محنت کرنا شروع

کی۔ بھلا چنڈی اور اس کی قماش کے دوسرے لوگ کبھی اُن خوابوں میں میرا ساتھ دے سکتے ہیں؟

چند مہینوں کے بعد آپ ہی آپ ایک ٹھنڈی سانس شام کی ہوا کی طرح میرے سینے میں چکر لگانے لگی۔ ایک عجیب اُداسی نے میرے جی کو گھیر لیا اور میں نے خوابوں کو بھول کر چنڈی کا کھوج لگانا شروع کیا۔

"تنگ و تاریک گلی کے آخری سرے پر ایک بیٹھک میں بیٹھا ہُوا وہ بٹن ٹانک رہا تھا، اور گنگنا رہا تھا۔ دروازے کو دھکیلا ہے تو اچھل کر کھڑا ہو گیا جھک کر مجھے سلام کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک پھٹی ہوئی نیکر پہنے تھا۔

میں نے کہا تم کو پانے کے لیے آج ساری دوپہر پھرا ہوں اس جگہ کے قریب سے کئی بار گزرا ہوں۔

کہنے لگا "چلو اب مُنہ دُوسری طرف کرو تو میں کپڑے پہن لُوں"

۔ تاریک کوٹھری کو تالا لگا کر ہم دونوں باہر نکلے ہیں تو وہ کہنے لگا "مرلی تم اتنے دنوں غائب رہے ہو میں ایک معاملے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "محبت میں کسی کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔"

کہنے لگا "یہ روگ میری زندگی کا نہیں۔ مجھے تو ایک سودا کرنا ہے"

میں نے کہا میں اچھا سوداگر نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کوئی شے نہیں خریدی گھر کے لیے ساری خریداری پاربتی کرتی ہے اور میں اپنے پڑھنے میں اتنا لگا رہا ہوں کہ بابا کے بعد بھی اس نے مجھے کبھی تکلیف نہیں دی۔

چنڈی ہنس کر کہنے لگا میرا معاملہ بالکل دُوسری طرح کا ہے۔ میں تم سے پُوچھتا ہوں اگر میرے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کی ضرورت مجھے ہے نہیں۔ مگر دُوسرا اسے خریدنا چاہتا ہے تو مجھے یہ حق تو پہنچتا ہے کہ میں اسے بیچ دوں۔

میں نے کہا "تم صاف کہو کیا بیچنا چاہتے ہو؟" میرے دل میں بڑی بے یقینی

تھی میں نے اس کے ٹھکانے پر سوائے کتابوں، غربت اور اندھیرے کے کوئی ایسی شے نہیں دیکھی تھی اُسے چُپ جان کر میں نے پھر کہا۔

"تمہارے پاس کونسی ایسی چیز ہے؟ تم یہ آج پہیلیوں کی سی باتیں کیوں کر رہے ہو"

کہنے لگا "مرلی دھر میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جس کو آج سے پہلے میں نے نہیں بیچا اور وہ میرے پاس بیکار ہے اور کسی دُوسرے کو اس کی ضرورت ہے اور اس کے بدلے میں مجھے اپنے رہنے کے لیے اچھی جگہ پہننے کو ڈھنگ کا کپڑا مل سکتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اسے بیچ دُوں"

ایک مرکری لائٹ کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے کہا۔ "چنڈی داس میں نہیں جانتا تمہارے پاس کوئی ایسی قیمتی شے ہو گی جس کو بیچ کر تم ایسی آسودہ زندگی کی راحت خرید سکو۔ اگر ہوتی تو آج سے بہت پہلے تم اُسے بیچ چکے ہوتے مجھ سے صلاح مشورہ کیے بنا"

چنڈی داس نے بُرا مان کر کہا "یہ تم نے کیوں کہا ہے۔ مُرلی کہ میرے پاس کوئی شے نہیں ہے" "پھر تم نے آج تک اس سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھایا" میں نے ذرا تیزی سے کہا۔

اور اگر چیز تمہاری اپنی ہے تو تم یہ مشورہ کیوں کرتے پھرتے ہو"

ہم دونوں بھیڑ کے ٹکڑے میں گم ہونے لگے تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے فٹ پاتھ سے علیحدہ کر لیا۔ ہم گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گئے۔ میرا دل گھبرا رہا تھا میں جاننے کیا کیا باتیں آج سے کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ چیزوں کے بیچنے اور خریدنے کی بات کر رہا تھا۔ چنڈی داس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "تم اتنے دنوں بھگوان سے اپنا ناتہ جوڑا یا توڑا اس کی مجھے خبر نہیں مگر میں اپنی بات تمہیں سُناتا ہوں میرے پاس ایک دولت تھی جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ میں نے تمہاری غیر حاضری میں اپنے آپ کو دریافت کیا ہے"

میں چُپ رہا تو وہ کہنے لگا "انسان غربت میں پڑا کلبلاتے کیڑے کی طرح ہے، جو گندگی میں سڑتا ہے اس کا جسم سڑتا ہے۔ اس کی رُوح گندی ہوتی ہے تم تاریک

کلی بی اس بیٹھک میں جہاں بُو کے بھبکے ہر وقت تمہارا سواگت کرتے ہوں کیا اچھی بات سوچ سکتے ہو اس لیے میں نے سودا کرنے کو قبول کیا ہے

"کیسا سودا کچھ کہہ بھی تو چکو۔" میں نے پھر تیزی سے کہا۔

"میں اپنا جسم بیچ رہا ہوں" اسنے سکون سے کہا وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

مجھے لگا جیسے کسی سانپ نے مجھے ڈس لیا ہو "تم مذاق کر رہے ہو تم جسم کو کیسے بیچ سکتے ہو جسم بک نہیں سکتا تم اپنے ہاتھ پیر کسی کو نہیں دے سکتے۔ تم عورت نہیں ہو کہ اس کو بیچو۔ یہ تو بیسوا پن ہے اور پھر تم" میں نے سر سے لیکر پاؤں تک اسے غور سے دیکھا

میرے پیارے مرلی اس نے بڑے رسان سے کہا۔ مجھ میں کیا بات ہے جو مجھے یہ سودا راس نہیں آئے گا۔ اگر لوگ اپنی رُوح بیچ سکتے ہیں تو میں جسم کیوں نہیں بیچ سکتا

"مگر رُوح تو دکھائی نہیں دیتی۔ آتما کو کسی نے دیکھا ہے کیا؟ میں نے بے یقینی سے کہا

"آتما اور بھگوان جو دکھائی نہیں دیتے اُن کا سودا ہو سکتا ہے تو جسم کا کیوں نہیں، ہو سکتا تم ظاہر کے قائل نہیں ہونا؟ تم لمس سے بھاگتے ہو تم دیکھی جانے والی چیزوں کے دشمن ہو تم جسم کا بیچنا مہاپاپ سمجھتے ہو، بیسوا پن کہتے ہو اور آتما کے متعلق کچھ نہیں کہتے شکر ہے میں آتما تو نہیں بیچ رہا ہوں جسم کا سودا کر رہا ہوں۔ لوگ بھگوان کو نیلام پر چڑھاتے ہیں میں تو اپنا آپ چڑھا رہا ہوں"

"خریدار کون ہے؟" میں نے اس کی بحث سے تنگ آ کر کہا۔

"ہے ایک بڑھیا" اس نے بڑی بے نیازی سے کہا

"بڑھیا" "مگر بڑھیا تمہارے جسم کا کیا کرے گی۔ میں نے بڑی بے یقینی سے کہا۔

جسم کا کیا کیا جاتا ہے میرے دوست؟ گوشت پوست میں گرمی ہو دھڑکن ہو تو اس کا کوئی کیا کرے گا؟ بڑھیا اکیلی ہے اس کا کوئی نہیں ہے۔ دولت مند ہے ابھی پچاس سال کی ہی تو ہے زندگی سے حظ اٹھانا چاہتی ہے زندہ رہنا چاہتی ہے

"تم چنڈی داس تم مجھے یقین نہیں آتا کیا تم اس سے شادی کر رہے ہو؟"

"ارے بھئی کون شادی کر کے گورکھ دھندے میں پھنسے بھائی۔ میں تو وہاں ایک مہمان کی حیثیت سے جا کر رہوں گا بڑھیا میرے جسم کا خیال رکھے گی کھلائے پلائے گی، کھانا کپڑا دے گی۔

"بھگوان،" چنڈی داس تم پاگل تو نہیں ہو گئے کیا!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
میں کہتا ہوں تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے مُرلی۔ لوگوں کو میں نے ملک اور قوموں کو بیچتے دیکھا ہے اور کوئی انہیں بُرا نہیں کہتا لوگ ہوائی اڈوں پر ان کا سواگت کرتے ہیں انہیں ہار اور پھول پہناتے ہیں اور میں اس سودے میں کسی کا نقصان نہیں کر رہا ہوں۔ ایک اپنا جسم ہی تو بیچ رہا ہوں اور تمہیں اتنا بُرا لگ رہا ہے۔ تم زندگی کی حقیقتوں سے کتنے آشنا ہو تم تو ابھی بالکل بچے ہو مرلی۔" چنڈی چنڈی داس میرے برابر چل رہا تھا۔

مگر انسان کے اصول اس کے نظریات اس کی اخلاقی جرأت" میں نے ذرا نرمی سے کہا

"اصول نظریات اور اخلاق یہ سب بے وقوف آدمیوں کی باتیں ہیں اور تم ان سب پر یقین کرتے رہے تو یاد رکھنا سول سروس کے امتحان میں پاس ہو کر بھی کہیں کے نہ رہو گے میں کسی اور کو نہ بتاتا اس لیے کہ یہ میرا اندرونی مسئلہ ہے مگر تم خوابوں کی دنیا میں بسنے والے آدمی ہو تم کو یہ سب بتانا ضروری تھا میں تمہیں جھنجوڑ کر نہ جگاتا تو کون جگاتا۔ تم میرے دوست ہو مجھ میں وشواس رکھتے ہو اور میں تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں مُرلی کہ یہاں ہر شے بکتی ہے۔ نظریے، اخلاق، محبتیں ہمدردیاں، خدا، روحیں، یہ تو ایک بہت بڑا بازار ہے۔ جس میں ہم اور تم گھومتے ہیں۔ ہم دونوں بکاؤ مال ہیں تم سول سروس کے لیے بک گئے میں جسم کی گرمی اور اچھی رہائش کے بدلے بکا ہوں۔ ہر شخص بکتا ہے پیارے ہر شے بکتی ہے وہ چپ ہو گیا

تم چنڈی داس تم جانے پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ بھگوان کرے جب میں دوبارہ تم کو دیکھوں تو تم اپنے حواسوں میں ہو۔"

اس نے بہت گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا پھر کافی ہاؤس کے سامنے سے میں اپنے خالی گھر کی طرف مڑ گیا اور وہ دروازہ کھول کر کافی ہاؤس میں داخل ہو گیا میں نے مڑ کر دیکھا وہ ایک پٹ کو ہاتھ سے پکڑے اندر داخل ہونے والے آدمیوں کے سروں کے اوپر سے ابھی تک ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا کسی کو مدد کے لیے پکار رہا ہو۔

آج کے زمانے میں ہر بڑا شہر کانفرنسوں اور کمیٹیوں کا شہر ہے تحریکیں پیدا ہوتی اور مرتی ہیں حلقے بنتے اور بگڑتے ہیں تقریبیں ہوتی ہیں اور رنگین یادیں چھوڑ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ نوجوانوں کو زندگی کا ثبوت مہیا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی نہیں ہوتا۔ سڑکوں پر رنگ برنگ جھنڈیاں لہراتی ہیں تو مہمان آتے ہیں بینڈ بجتے ہیں جیسے براتیں اُتری ہوں اور ریوں ہما ہمی اور رونق پیدا ہوتی رہتی ہے میں شہر کی ان رونقوں میں اتنا کھویا کہ مجھے بھول گیا کہ چنڈی داس بھی ہے پھر امتحان تھا گھر کے کام تھے پاربتی تھی اس کے بچے تھے اور اپنے پرائے صدہا غم تھے۔ امتحان دیکر فارغ ہوا ہوں تو ایک دن اخبار دیکھتے دیکھتے یوں ہی ایڈیٹر کے نام پر نظر جا پڑی۔ چنڈی داس۔ چنڈی داس۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے فون اُٹھا کر چنڈی داس سے بات کرنی چاہی دُوسرے سرے پر اتنی گرمجوشی سے مجھے ہیلو کہا گیا کہ رسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"اپنا چنڈی داس ایڈیٹر ہو گیا بھئی واہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس سے اس بڑے سانحے کی بات کروں۔ میں شام تک سڑکوں پر گھومتا رہا یہ کایا پلٹ جانے کیسے ہو گئی۔ ارے بھئی سوچو مُرلی دھر کل تک جس آدمی کا ڈھنگ کا ٹھکانہ نہیں تھا اس کو آج ایڈیٹر کی جگہ مل گئی۔ حد ہو گئی بھئی"

اسی دن صبح کے وقت کناٹ پلیس میں پھرتے ہُوئے مجھے چندر کانت مل گیا وُہ کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا اور اشوکا میں ٹھہرا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وُہ شام کو فارغ ہوتا ہے۔ اور جتنے دن یہاں پر ہے اپنی نجی ملاقاتوں کے لیے وقت نکالتا

ہے۔ اگر وقت ہو تو میں کسی دن آؤں میں اتنا گھبرایا ہُوا تھا کہ پہلے کافی ہاؤس گیا وہاں سب لوگوں نے بڑے پیار سے میرا سواگت کیا تقریباً ہر شخص کو معلوم تھا کہ چنڈی داس میرا دوست ہے سبھی لوگوں کو اس کے ایڈیٹر ہو جانے کی خبر تھی۔ اور میں اپنی حیرت کا اظہار ان سے نہیں کر سکتا تھا۔ اٹھا تو چندر کانت کی یاد آئی اور میں نے اس کی دعوت سے فائدہ اُٹھانا چاہا ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی اشوکا کی طرف بھاگنے لگی مگر اندر سے میرے دل کو پنکھے لگے تھے چندر کانت کالج میں میرے ساتھ رہا تھا اور ہماری یونین کا وہ بھی سرگرم رکن تھا۔ اسے کیا خبر ہو سکتی تھی کہ چنڈی داس کون ہے وُہ شخص جو کل تک گمنام تھا۔ جس نے محض اپنے جسم کا سودا کیا تھا اور نہایت بے شرمی سے اس پر فخر کرتا رہا تھا آج وُہ ایک بڑے اخبار کا ذمہ دار ایڈیٹر تھا جب اشوکا کے پھاٹک میں ٹیکسی گھسی ہے تو مجھے مارجری دکھائی وہ کتابوں کے ایک ڈھیر سے ہولے ہولے جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی کتابوں والا لڑکا پاس کھڑا نہایت اطمینان سے اس کے نیچے گلے کے لباس پر نظر کر رہا تھا جیسے کسی بت کا جائزہ لے رہا ہو۔

میں تازہ دم تھا اور پُر امید بھی امتحان میں پاس ہو جانے کے میرے امکانات کافی روشن تھے صرف ابھی میرا زبانی امتحان باقی تھا۔

پاس جا کر میں نے ہیلو کہا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں تجسس اور پہچان میں کش مکش سی ہوئی دُوسرے لمحے اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے کر کہا "تم تو میرے ٹرانسلیٹر ہو نا! اس کی ہنسی میں بڑا اپنا پن تھا۔

"کتابوں والے لڑکے نے مایوسی اور غصّے سے نگاہ میری طرف کی اور پھر کتابوں کو آگے بڑھا کر بولا" میم صاحب کونسی کتاب دے دُوں"

"پھر کسی دن آنا" مارجری نے روسان سے اُسے کہا اور پھر ہاتھ پکڑے پکڑے کہنے لگی "اگر تمہیں کوئی کام نہ ہو تو آؤ چائے پئیں۔ میرا نام مارجری ہے میں یہاں اپنی حکومت کی طرف سے تمہارے ملکی شاعروں کے کلام کے ترجمے انگریزی میں کرنے آئی ہوں تم

شاعر ہو گیا مجھے اپنا نام تو بتاؤ ؟"

اس کے سوالوں کی بوچھاڑ میں میں اپنے آپ کو پھر اسکول کے بچے کی طرح سمجھ رہا تھا۔ وُہ یوں بے تکان بول رہی تھی جیسے بہت سمے سے اس نے کسی سے بات نہ کی ہو اور رُکے ہوئے پانی نے ایک دم بند توڑ دیا ہو۔ اس کی آواز میں خلوص تھا اور باتوں میں نیاپن۔ یہ عورت تو عجیب تھی جس کی باتوں میں بہاؤ اور انداز میں رکھ رکھاؤ تھا اس کے باوجود وُہ ایک عام عورت کی طرح تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی نرمی تھی جیسے منّت ہو بہت دنوں سے وُہ اس ہوٹل میں تھی۔ بڑے شاعر جن سے اس نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی یا تو بہت مصروف تھے یا پھر اس کے پاس خود آنا کسرِ شان سمجھتے تھے وُہ خود کسی کے پاس کیا جاتی اور کام معرضِ التوا میں پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ آخر تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ تم بنا یہاں کی زبان جانے یہاں کے شاعروں کا کلام ترجمہ کر سکتی ہو۔

کہنے لگی۔ رُوح کو رُوح پہچان لیتی ہے۔ اچھے میوزک کی طرح شاعری کا ترنم بھی معانی کا محتاج نہیں ہوتا اس کی اپیل بھی روح کو ہوتی ہے۔

میں نے کہا" مگر لفظ۔ آخر لفظوں کے بنا تو کام نہیں چل سکتا۔ تم رُوح کو ترجمہ نہیں کر سکتیں "

ہنس کر کہنے لگی۔ تم میرے ساتھ مل کر کوشش نہیں کرو گے ؟

یہ سوال یوں اچانک اور بے ساختگی سے کیا گیا تھا کہ مجھے ہاں کہتے ہی بن پڑی۔

جب ہم ڈائننگ ہال میں گھسے ہیں تو چندر کانت اور رتی اندر آئے۔ چندر کانت نے کہا" بھئی مُرلی تم بھول تو نہیں گئے نا آؤ گے کسی شام کو رتی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا تم دونوں کا تعارف میں کیا کرواؤں گا ؟

رتی نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا۔ اس کے کانوں میں ہیرے کے آویزے تھے اور اُنگلی میں پہنی انگوٹھی کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں مجھے لگا میری نبضیں

ڈوب جائیں گی اور اس لیے میں نے مارجری کا ہاتھ تھام لیا۔ اس شام اس کا سہارا مجھے بہت بڑا لگا۔ رات کو جب میں لوٹا ہوں تو پاربتی نے دروازہ کھول کر ہولے سے کہا مُرلی تم کیا اس سے جلد گھر نہیں لوٹ سکتے؟"

میں تم لوگوں کا نوکر نہیں ہوں کہ تمہارے کہے سے گھر لوٹتا رہوں۔ میرے لیے کیا رکھا ہے یہاں میں نے چیخ کر کہا۔

پاربتی کی سہمی ہوئی صورت اور آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو مجھے اب تک یاد ہیں۔ میں اس باپ کا بیٹا تھا جس نے کبھی زور سے کسی کو آواز نہیں دی۔ کسی کو تلخی سے پکارا تک نہیں تھا اور میں جانے میں کیا سے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ بورتن کی تلخی میرے اندر ابل رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کیے بنا میں بستر میں گھس گیا اور ساری رات رتی کے سپنے دیکھتا رہا۔ سپنوں میں جانے مانگ کے سیندور اور ماتھے کی بندیا ہیرے کی انگوٹھیاں اور محبت کے مرثیے کون پڑھتا رہا تھا۔ پھر میں نے چنڈی داس کو دیکھا جو پھٹی ہوئی نیکر پہنے ایک عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ گندگی اور تاریک کمروں اور ویرانوں کے پریشان خواب۔ جلوسوں اور رنگوں کی ہولی۔ خیالوں اور نظریوں کے دیئے جل رہے تھے۔ لوگ نیلام پر بک رہے تھے اور ساری دنیا ایک ویران منڈی کی طرح تھی جس سے بیچنے والے بھی چل دیئے ہوں۔

بابا کہتے تھے "آدمی تو سدا سے قید ہے موہ کا قیدی مایا کا قیدی اپنے بنائے بندھنوں کا قیدی بھلا آدمی کے نصیب میں آزادی کہاں سے آتے گی"

اُن دنوں میں پرانی کانگریس تحریکیں پڑھ رہا تھا اور کبھی کبھار ان سے کچھ پُوچھ لیتا تھا وُہ جواب دینے سے پہلے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ پھیرتے جن پر ورم آیا ہُوا تھا اور پہلو بدل کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے انہوں نے کبھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی اور نہ ہی فوراً کبھی میری بات کا جواب دیا تھا۔ ان سے میں نے کبھی کچھ نہیں سنا پر دُور پار کے رشتہ دار کہتے تھے کہ انہوں نے جوانی کا سارا زمانہ کمیٹیوں اور سول نافرمانیوں اور جانے کاہے کاہے کے پیچھے گھوم کر گزارا ہے میری ماں سورگ

باقی ساری عمر تیری میری محتاج رہی اور میری بہنیں جو عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں ایک ایک شے کو ترستی رہیں انہیں وُہ محبت کبھی نصیب نہیں ہوئی جو ان کی طرح دُوسری بچیوں کو ملی تھی۔ روتے روتے ماں کی آنکھیں چُندھی ہو گئیں اور جب میں پیدا ہُوا ہوں تو اس میں ہمت ہی کہاں تھی۔ کئی سال کی رد گی یہ وار نہ سہہ سکی اور مر گئی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ بابا سے باتیں کروں مگر ان سے کچھ لمبی گفتگو کبھی نہ ہو سکی۔ بستر پر لیٹے لیٹے وُہ جانے کیا سوچا کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اتنی مایُوسی ہوتی تھی۔ کہ میں خُود ان سے مایوس ہو گیا اور گھر سے باہر سہارے ڈھونڈنے میں لگ گیا۔

حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن جب زوروں پر تھے اور میں کئی راتیں گھر نہیں آیا تو ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر کہا تھا۔ آخر تم لوگ کیا شے کھوجتے ہو کیوں دیوانے ہُوتے ہو؟ میں نے بڑی گرمجوشی سے کہا" پر بابا ہمیں آزادیٔ تقریر کی ضرورت ہے ہم جو چاہتے ہیں جو سوچتے ہیں وُہ غلط تو نہیں ہے

بابا کو پہلی بار میں نے مسکراتے دیکھا مگر اُس مسکراہٹ میں بڑی تلخی تھی انہوں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر میرے سر کو چھوا اور کہنے لگے۔

"اگر تمہیں سب کہنے کی آزادی ہو پھر بھی کیا کہو گے؟"

"یہی کہ جو آج ہو رہا ہے وُہ نہ ہو ہر آدمی کو اس کا حق ملے بھُوکے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا اور بیکاری بیماری کا علاج" میں نے بڑے زور سے اور جوش سے اپنی بات ختم کی۔

"بابا نے کہا" اور کیا چاہیے؟"

میں نے کہا" یہی بُہت ہے اگر مل جائے تو۔"

بابا نے ہولے سے کہا۔" بیٹے آدمی کی ضرورتیں بے شمار ہیں اس کے اندر ایک آتما بھی ہے جب تن کی ضرورتیں پوری ہوں گی تو من مانگے گا۔ کیا سب کے لیے جتنے کرو گے۔

میں نے کھڑے ہوتے کہا" ہاں اگر ممکن ہو تو۔

بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا پھر تھوک اُگالدان میں پھینک کر بولے ہوئے اُکھڑی سانسوں کے درمیان بولے" مانگنے سے کچھ نہیں ملتا طاقت پیدا کرو کہ لے سکو۔

میں نے کہا" مگر بابا لے کس سے لیں"

ہنس کر بولے" کیسے بھولے ہو جس سے مانگتے ہو اس سے چھین لو"

مجھے لگا پہلی بار میری آنکھیں کھلی ہیں۔ میں نے بابا کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

مارجری نے مجھے کہا تھا تمہارے نئے اُدب میں آزادی واضح تصور نہیں ایک حسرت سی ہے جس پر کہنے والے کو پوری قدرت معلوم پڑتی ہے اور ایک آزاد ہوئی قوم کے ذہن کی زبان اگر یہی ہے تو تمہاری آزادی کیسی ہے ؟

مجھے معلوم تھا اس کی نیت مجھے چُپ کرانے اور مجھ سے لڑائی مول لینے کی نہیں تھی وہ ایمانداری سے وہی کہہ رہی تھی جو اس نے سوچا تھا اس نے بھی کیا یہ تو وُہ امپریشن تھا جو اس نے ان تمام نظموں اور غزلوں سے لیا تھا جو لوگوں نے اپنے کلام کا بہترین نمونہ سمجھ کر ترجمہ کرنے کے لیے پیش کی تھیں۔

میں نے کہا۔ آزادی کیسی کا سوال تو الگ ہے ہم طبعاً حُزن پسند قوم ہیں اُور اگر کسی جگہ رنجیدہ کرنے والا واقعہ نہ بھی ہو تو ہم زبردستی اس ماحول کو افسردہ کرنے کے لیے اپنی طبیعت سے اس میں رنج و غم بھر دیتے ہیں۔ ہم پُر امید لوگ ہیں اور ہماری زندگی کا اہم حصہ ہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو اچھے سے اچھے کی خواہش ہمیں رنجیدہ رکھتی ہے۔ ہم جسم تک ختم نہیں ہو جاتے ہماری تلاش اس سے آگے ہے آتما اور نروان اور اس کے بعد ایک اور جنم ایک اور دُنیا۔

وہ آنکھیں پُوری کھولے اپنے دونوں ہاتھ ٹائپ رائیٹر پر دھرے میری اس طویل گفتگو کو سُن رہی تھی جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کہنے لگی" مُرلی تم

خود بھی لکھتے ہو۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے بُرا نہیں لکھتے مگر تمہاری باتوں سے ابھی دُودھ کی بو آتی ہے۔ تم اس بچے کی طرح ہو جس نے بڑوں کی صحبت میں باتیں سن لی ہوں اور انہیں اپنی طرف سے بیان کرتا پھرے۔

"بالکل غلط یہ میری توہین ہے۔" میں نے بُرا مان کر کہا۔

بُرا ماننے کی بات نہیں مُرلی۔" اس نے ٹائپ رائیٹر کے پاس سے اُٹھتے ہوئے کہا پھر وہ میرے قریب آگئی اور صوفے پر میرے قریب بیٹھ گئی اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور مجھے یوں لگا جیسے میں ابھی بچہ ہی ہوں اور جو باتیں میں نے آج تک کہی ہیں وہ میں نے سنی تھیں اور میری نبضوں پر کوئی حادثہ نہیں گزرا۔

"بُرا ماننے کی بات نہیں مُرلی" اس نے پھر کہا۔ آدمی جب تک بھرپور زندگی نہ گذارے محبت نہ کرے اس میں ٹوٹے نہیں جسم کی عبادت نہ کرے وہ روح کی بات نہیں کر سکتا۔

مگر تم تو ہمارے ہاں آزادی کے تصور کی باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ساری باتیں اسی بات سے نکلتی ہیں تم لوگ سورگ اور نرک کے چکر سے آزاد نہیں، ہو تم بھگوان کے ڈر اور اس کے حکم کا انتظار کرتے ہو۔ تم اپنے جسم کو سارے تجربوں سے الگ کرتے ہو نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے سارے تجربے ادھورے اور تمہارے سارے خیالوں میں رنج ہے۔ سمجھے بابو میں نے تو تمہاری نئی شاعری پڑھ کر یہی کچھ سمجھا ہے۔"

تم آدمی کو سارے بندھنوں سے آزاد کرنے کے باوجود اس کے لیے کیا کر سکے ہو؟ میں نے اس کو اسی کی زمین پر شکست دینے کی سوچی۔

وہ اُٹھ کر کھلی کھڑکی میں جا بیٹھی "مگر ہم اُس فرسٹریشن سے تو نکل آئے ہیں جس سے نکلنے کے لیے تمہیں صدیاں چاہئیں۔"

باہر آسمان بادلوں کی وجہ سے سیاہ ہو رہا تھا اور گلاب کی جھاڑی میں کوئی چڑیا جانے کونسی زبان میں کیسا نغمہ الاپ رہی تھی؟

تو بقول مارجری میں فرسٹریشن کا شکار تھا میری قوم میری نظمیں ہمارے خیالات قید میں کیے ہوئے وہ بول تھے جن میں گونجتے گرجتے طوفانوں کی کمی تھی

سنو مارجری میں نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش کی وہ کھڑکی میں یوں بیٹھی تھی جیسے یہاں پر ہو ہی نہیں ۔ہم نے بہت دنوں بعد آزادی حاصل کی ہے اب اس حزن کو مٹانے میں کچھ دن لگیں گے اور پھر ہمیں ہر شے کہاں ملی ہے ہمیں وہ سب کچھ خود بنانا ہے۔" میں بدستور اپنی وکالت پر تلا ہوا تھا۔

"آؤ" اس نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے قریب کر لیا تمہارے ہاں موسم اتنا دیوانہ کر دینے والا ہوتا ہے کہ تم لوگوں کے سارے حُزن کی ذمہ داری اس کے سر پر رکھی جا سکتی ہے ۔کھڑکی کے سامنے جھکی ہوتی سیاہ گھٹائیں جھومتے ہوئے درخت چڑیوں کے نغمے یہ ارد گرد پھیلی خوشبو پھولوں کے رنگ سبزہ یہ سارا کچھ تم لوگ برداشت کرتے ہو تمہاری ہمت ہے میری آنکھوں میں اتنا بہت حسن دیکھ کر خود بخود آنسو آ گئے ہیں ایسے میں اگر میں بھی کچھ لکھوں تو وہ بوجھ کی طرح سینے پر بیٹھا لگے۔"

ہم دونوں چُپ چاپ بادلوں سے سیاہ آکاش کو دیکھتے رہے ۔پھر یوں ہوا کہ اس کی سانس تیز ہو گئی اور وہ دیوانی لگنے لگی۔

میں نے کہا" اب گھر جاؤں گا اگر پانی پڑنے لگا تو پھر یہ صبح سے پہلے نہیں رُکے گا

اس نے بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھ کر کہا" کیوں مُرلی ایسے میں کیوں جا رہے ہو تمہیں مجھ سے ڈر آتا ہے کیا ؟

"نہیں" میں نے یونہی جھک کر بوٹ کے تسمے کھول کر پھر سے باندھتے ہوئے کہا" تم مجھے کھا تو نہیں جاؤ گی۔ مگر کام کرنے کا اب موڈ نہ تمہارا ہے اور نہ میرا میں ذرا گھومنے جا رہا ہوں تم کہو تو فون کر کے کسی کو بلوا دوں چنڈی داس سے ملو گی ؟

چنڈی داس سے اسی اپنے ایڈیٹر دوست سے وہ ہنسی اور چھلانگ لگا کر فون کی طرف بھاگ گئی ۔ مجھے لگا میں بکھر رہا ہوں اور اگر یہاں سے چلا نہ گیا تو

میرا وجود ان گنت ذروں میں بٹ جائے گا میں ہواؤں میں تحلیل ہو جاؤں گا بادل جانے مجھے اُڑا کر کہاں لے جائیں اور میں ابھی اڑنا نہیں چاہتا تھا میں بکھرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے ارادے اور مرضی سے ہر کام کرنا چاہتا تھا اور مارجری جگوان جانے مجھے کہاں سے کہاں لے جاتے۔

دروازہ کھول کر باہر نکلا ہوں تو اس نے کہا۔ گرلی یہ برساتی لیتے جاؤ شاید تمہیں اس کی ضرورت پڑے۔

"چنڈی آئے گا کیا؟" میں نے برساتی اپنے بازو پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کتنے عجیب لوگ ہو تم سب ابھی وہ مجھ سے تمہارے لیے پوچھ رہا تھا میں نے یونہی کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے تو کہنے لگا "ابھی آتا ہوں" اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تازہ نظم لا رہا ہے جو وہ مجھے انگریزی میں ترجمہ بھی خود ہی کر دے گا۔" وہ میرے جانے سے خوش تھی۔

تیز ہوا میں اسکوٹر چلاتے ہوئے مجھے اپنا آپ زمین پر نہیں لگ رہا تھا میں بادلوں کے پروں پر اڑتا ہوا جانے کیسے کیسی باتیں سوچ رہا تھا۔ میری قمیض ہوا میں پھولی ہوئی تھی۔ اور میرے پھیپھڑوں میں خوشبوئیں بھری تھیں۔ میرا سر گیتوں اور ان کہے بولوں کے جادو سے بھرا ایک پٹارہ تھا یہاں تک کہ تیز آندھی نے تناور درختوں کو میری راہ پر گرا دیا۔ میں ایک تنے سے ٹکرایا اچھلا اور پھر گر گیا۔ ہسپتال میں مجھے چنڈی اور مارجری دونوں ملنے آتے چندر کانت اور رتی آتے۔ میری اپنی۔ بہن پاربتی اور رشتے کی کئی اور عورتیں آئیں اور مجھے لگا میں اکیلا نہیں ہوں میرے لیے اتنے بہت لوگ ہیں جو پریشان ہیں بہت دنوں بعد میں نے اپنے آپ کو دنیا کا دلارا سمجھا۔ بھلا اس شام اگر میں گر کر پھر نہ بھی اٹھتا تو کسی کا کیا تھا مگر یہ سارے چہرے میرے لیے کتنے فکر مند تھے۔

پاربتی نے سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک گرم بوند میرے ماتھے پر ٹپ سے گری میں نے کہا روتی کیوں ہو دیدی۔

ہنسنے لگی بھگوان کو میری اتنی بے بسی پر ترس آگیا ہے مُرلی تم نہ ہوتے "میرا کیا بنتا۔ تمہارے بنا میرا کوئی نہیں۔"

اصل میں پاربتی کو میری نہیں اپنی فکر تھی۔

چنڈی کا چہرہ بہت اداس تھا جیسے وُہ کسی سوچ کے بوجھ تلے دبا ہو۔ ایک کرب تھا جو بے قراری سے اس کی آنکھوں میں کروٹیں لے رہا تھا۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ جھکا اور کہنے لگا جلدی سے تندرست ہو جاؤ مرلی ہم دونوں مل کر اس غیر ملکی عورت کے خلاف محاذ بنائیں گے۔

میں نے مسکرا کر دیکھا شاید اُس شام میری جگہ چنڈی کے ذرے بادلوں کے ساتھ اڑے تھے وُہ بکھرا تھا وُہ جو اپنا جسم بیچ کر آگے بڑھ رہا تھا اور جس نے اپنی پُرانی ٹیکر کا سودا اتنے سستے داموں کیا تھا۔

مارجری ہسپتال کی نرسوں اور ڈاکٹروں سے میرے متعلق پوچھتی رہی اور پھر جاتے ہوئے پھولوں کو میرے ماتھے سے چھُوا کر کہنے لگی "جب تندرست ہو کر آؤ گے تو میں ایک دعوت کروں گی اصل میں تمہارے اس ایکسیڈنٹ کا ذمہ دار میں اپنے آپ کو ٹھہراتی ہوں اگر اس شام میں تم کو باہر نکلنے نہ دیتی تو شاید آج تم اس بستر پر نہ پڑے ہوتے۔ اس گھڑی اگر تم بھی میری طرح دیوانے نہ ہو جاتے۔" وُہ مڑی اس نے چنڈی کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا جو میری بیماری کا چارٹ دیکھنے میں لگا تھا۔

رات بستر پر اکیلے پڑے پڑے جب میں نے سوچا ہے تو مجھے لگا چنڈی میں ایک کشش ہے جو اس کی شخصیت کو اتنا محبوب اور اس کی گفتگو کی دلفریبی کا سبب ہے مارجری کے چہرے پر جو طمانیت تھی وُہ بھی شاید چنڈی کی دی ہوئی تھی۔ رتی اور چندر کانت کو میں نے اپنے دماغ سے دھکیل باہر کیا۔ میں ایسے میں جب ذہنی طور پر بیمار تھا رتی کی پاکیزگی کو اپنی سوچ سے داغدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر رتی کی پوجا میں نے کیوں کی ہے؟ کیوں کی تھی۔ رتی میں آخر کیا تھا جو

مارجری میں نہیں تھا۔ آخر ایک چہرہ ہمیں باقی چہروں سے زیادہ مضطرب کیوں کر دیتا ہے؟ اور وہ کیا تھا۔ محبت کیا ہے۔؟

نرس آدھی رات کے راؤنڈ پر آئی تو میں ابھی جاگ رہا تھا اور اس لیے اس نے مجھے خواب آور گولی کھلائی۔ اور میں ایسے ہی بے شمار خوابوں میں گھرا گہرے پانیوں میں ڈوب گیا۔

لیٹے لیٹے یوں لگتا ہے میری قلبِ ماہیت ہو رہی تھی۔ اُنہی دنوں میں نے بیتی زندگی کے عذابوں اور خوشیوں کو دہرایا۔ میں نے اپنے آپ پر جو ظلم کیے تھے انہیں یاد کیا۔ اصل میں ایک لمبا برت تھا جو میں نے آج تک رکھا تھا۔ یہ ذرہ ذرا سی تقریریں اور بے کیف نعرے یہ کالج کی کمیٹیاں اور یونین اور ایسی ساری چیزیں جن میں آج تک میں نے من لگایا تھا۔ وقت لگایا تھا۔ میں نے سوچا تھا اگر میں کر سکا تو مقابلے کا امتحان پاس کروں گا پھر کسی اچھی جگہ سرکاری عہدے پر لگوں گا اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔ دنیا صرف طاقت کے بل پر بدلی جا سکتی تھی اور طاقت اختیارات سے ہاتھ آتی ہے۔ اختیارات تعلیم کے ذریعے مل سکتے ہیں سر خوشی سے میں اپنے میں جینے کی نئی اُمنگ پاتا تھا۔ آج تک میں نے اپنا گردوپیش بدلنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ اب کروں گا اس نئی آرزو نے میرے زخموں پر مرہم کا کام کیا اور حیرت انگیز طور پر تیزی سے تندرستی کی طرف پلٹنے لگا۔

مارجری اپنے کاموں میں بہت مگن تھی اور جب فرصت پاتی تو میرے پاس آتی اس نے کتنے ہی نئے شاعر دریافت کیے تھے اور ان کو اپنے طور سمجھا تھا اس کی فائل میں روز ایک یا دو نئی نظموں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ملنے والوں کی فہرست میں بھی نئے نام اُبھرتے تھے وہ سب اس کی شاموں کی پارٹیوں میں شریک ہوتے اور دھم مچاتے۔

مجھے کہنے لگی "مری تمہارے ہاں کے لوگ بہت پرخلوص اور کھلے دل کے ہیں

اصل میں ہر جگہ آدمی تو اچھا ہے مگر قوموں کے اپنے تعصب اور اپنے نظریے ہیں اکیلا آدمی اپنا نظریہ بدل سکتا ہے مگر قومیں قائم رہتی ہیں"۔

میں نے ہنس کر کہا "تو تم ہمارے قومی نظریئے کو شکست دینے آئی ہو"۔

بہت سنجیدگی سے کہنے لگی "میرے دوست تمہارے قومی نظریے کو اگر کوئی شکست دے سکتا ہے تو وہ تم خود ہو یا پھر تمہارے وہ لوگ ہیں جو تم سے پوچھے بنا تمہاری قسمت کے فیصلے کرتے ہیں جو ملکوں سے دوستی اور دشمنی کرتے ہیں۔ اصل میں قومی نظریے پالیسی سے بنتے ہیں تم کسی آدمی کو برا نہیں کہہ سکتے مگر جب اس قوم سے تمہاری دشمنی ہو تو"۔

میں نے کہا "تم اطمینان رکھو ہم تمہاری جیب میں رہیں گے تم سے گندم لیتے ہیں جس سے آنکھیں کھلتی ہیں عقل آتی ہے آدمی سوچنے محبت کرنے اور نفرت کرنے کے قابل بنتا ہے"۔

مارجری نے میری طرف جھک کر اور دونوں کہنیاں میرے منہ کے قریب بستر پر ٹکا کر کہا "تمہیں مجھ سے شکایت کیوں ہے؟ اتنے تلخ کیوں ہو"؟

"مارجری جب تک ہم دو انسانوں کی طرح ملیں گے ہم ایک دوسرے سے نفرت اور محبت بھی کریں گے مگر دو قوموں کے افراد کی صورت میں ہم مختلف ہیں تمہارے اور میرے درمیان دینے والے اور لینے والے کا رشتہ ہے جنس کی طرح اس رشتے کو بھلایا تو نہیں جا سکتا"۔

"ٹھیک کہتے ہو مرلی" اس کی سانس خوشبو کی طرح میرے چہرے پر پیار بھری انگلیوں کی نرمی بن کر پھیلنے لگی "مگر ہمارے درمیان گندم کی جنس نہیں خالص اور صرف "جنس" ہے"۔

میں ہنس پڑا "ہاں یہ جنس تو تنازعے کا سب سے بڑا سبب ہے"

"مجھے ایک بات بتاؤ مرلی تم نے اس کو میرے اور اپنے درمیان تنازعے کا باعث کیوں بنا رکھا ہے"؟

"بادلوں والی شام جب تم بھاگ گئے تھے تو مجھے معلوم تھا تم کس شے سے ڈر کر بھاگ رہے ہو تمہیں اس تاریکی سے ڈر کیوں لگتا ہے تمہیں جاننے کا شوق کیوں نہیں اس تجربے کی گہرائی سے بھاگتے کیوں ہو۔"

وہ خلافِ معمول آج بہت سنجیدہ تھی۔

"مجھے تم سے نہیں اپنے سے ڈر آتا ہے مارجری۔"

"یہ بھی وہی نشان ہے تم خارجی تجربات اور دُکھ کے قائل تو ہو مگر اس ذہنی عبادت سے کیوں نفرت کرتے ہو؟"

میں چُپ رہا۔

"تمہیں مجھے بتانا ہوگا کہ آخر کس وجہ سے تم گریزاں ہو؟" وہ اس موضوع پر آج پوری طرح گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

"میں نہ گریزاں ہوں اور نہ کانپتا ہوں ابھی مجھے اپنی تھاہ نہیں ملی میں اپنے آپ سے باخبر ہو کر اس سے دوچار ہونا چاہتا ہوں جب وقت آئے گا" میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

"وقت وقت کیا بیکار کی باتیں ہیں۔ یہ بھی سیاسی مسئلہ ہے کیا؟ تم جوان آدمی ہو اور اپنے کو اس سے محروم کیوں کر رہے ہو۔" وہ جھنجلا گئی۔

"اگر میں اس تجربے سے کبھی آنکھیں ملاؤں گا تو تمہاری مدد سے نہیں" میں نے اپنی طرف سے بڑی تلخ بات کی۔

مگر وہ ہنس دی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی "تم نے اس ضرورت کو محسوس تو کیا میں تمہاری استاد نہیں بننا چاہتی کیوں میرے پاس تو تمہارے ایسے بچوں کا سکول بھرا ہوا ہے۔"

"چلو یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ تمہارے پاس میرے لیے وقت نہیں ہے میں اپنا سبق کسی اور مکتب میں سیکھوں گا کسی اور اُستاد سے" میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اور بازو سر کے نیچے رکھ لیا۔

"تمہارا نام مرلی ہے تم بھی اس مُرلی بجانے والے کی طرح خوبصورت ہو جس کی تصویریں تمہارے ہاں جگہ جگہ لگی ہیں جو تمہارا بھگوان ہے اور میرے لیے......" وُہ بات ختم کیے بنا پیچھے مڑی۔

رادھے شیام ڈاکٹر ہاتھوں میں پھُول لیے کھڑے تھے۔

میں نے مصافحے کے لیے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا تو کہنے لگے "کل میں مارجری سے ملا تو اُس نے بتایا کہ تم بیمار ہو۔"

میں نے کہا "شکریہ آپ بیٹھ جائیے۔"

میں رادھے بابو کو بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ سمندر پار سے آنے کے بعد (جہاں وُہ تقریباً ہر سال جاتے ہیں) ایک آدھ کہانی ضرور لکھتے ہیں جس میں یورپ کی راتوں کا تجربہ ہوتا ہے شہر میں آنے والی ہر بوڑھی اور جوان غیر ملکی عورت سے راہ و رسم بڑھانا اُن کا مشغلہ ہے گو آدمی کافی سنجیدہ اور خوشحال ہیں مگر پھر بھی دوسروں سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ جانتے اور انہیں آزماتے رہتے ہیں۔ بقول ان کے وُہ آرٹ اور فن شناسی کے نمبر ایک ہیں سیاست اور سیاحت دونوں میں اُن کے اپنے نظریات ہیں تقریبات میں شامل ہوتے ہیں تو ان دونوں کی وضاحت کرنے کو فرض جانتے ہیں اس لیے تقریر ضرور کرتے ہیں۔

کالج ختم کرنے سے پہلے ایک دو بار میں انہیں ایسے ہی جلسوں میں ملا تھا مگر آج اُن کا آنا بالکل اچانک تھا۔

مارجری نے مڑ کر مجھے کہا "لگتا ہے مُرلی سارا شہر تمہارے فکر میں مبتلا ہے۔"

"مجھے تو ان لوگوں کی محبت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔" مگر میرا جملہ سننے سے بہت پہلے رادھے شیام مارجری سے جانے کون سی نظم کا ذکر کر رہے تھے۔ شاید وُہ بھی اسی اسکول کے طالب علم تھے۔ اس نے پُورے شہر کے لوگوں کو کیسی چابک دستی سے اپنے گرد اکٹھا کر لیا تھا۔

پھر شیام بابو نے مجھ سے اجازت چاہی اور مارجری کو لے کر وُہ کسی ادبی

مجلس میں شرکت کی غرض سے چلے گئے۔

بادلوں والی اُس شام میرا بھاگنا کیا تھا؟

میں کس شے سے بھاگ رہا تھا اپنے آپ سے یا مارجری سے یا اس تجربے سے جو آگ کی محراب بن کر میرے سامنے تھا اور جس کے اس پار مجھے کبھی نہ کبھی جانا تھا

روی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا وہ چنڈی داس کا جاننے والا اور کافی ہاؤس میں اس سے بھی پہلے آنے والا ایک نقاد تھا سب جانتے تھے کہ سگریٹ کی ڈبیا ایک جانے کی دعوت دے کر کوئی بھی اس سے اپنے حق میں بڑا طویل اور خوبصورت مضمون لکھوا سکتا تھا۔ جانے آج اُسے کون سی شے کافی ہاؤس سے باہر کھینچ لائی تھی۔

چھوٹتے ہی کہنے لگا "جانتے ہو میں آج تمہیں کیا سنانے آیا ہوں"

"نہیں" میں نے کہا۔

"تو سنو چنڈی داس کی بڑھیا نے آج اُسے مارا اور گھر سے نکال دیا" اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"مگر تم کو یہ سب کس نے بتایا؟" مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بتا تا کون یار تم بھی بال کی کھال اُتارتے ہو۔ ارے آج تم چنڈی کی حالت دیکھتے تو کوئی بھی یہ کہہ سکتا تھا" اس نے سگریٹ کے لیے میز پر اور پھر میرے تکیے کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "مگر چنڈی ابھی صبح تو مجھ سے مل کر گیا ہے تب تک وہ بالکل ٹھیک تھا"

"آج صبح وہ پھر اپنی پرانی بیٹھک کے مالک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ یہی کوئی گیارہ بجے کے بعد میں اس کے پاس تھا" اس نے بالآخر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"تو پھر کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

یقیناً اسی سے اَن بن ہو گئی ہو گی۔ ورنہ اور کیا ہوتا میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگا یار جانے کب پرانے ٹھکانے کی طرف لوٹنا پڑے بس اتنی سی بات تھی

وہ سگریٹ کے دھوئیں سے ہوا میں چھلے بنا رہا تھا۔
میں نے کہا "تم بھی کسی بڑھیا کو کیوں نہیں تاکتے۔ کافی ہاؤس میں کب تک
زندگی گذارو گے۔
لگ رہا تھا چنڈی داس نے اس گرمی کی شام اور مرکری لائٹس کی روشنی
میں جو راز مجھے بتایا وہ ایک عام بات تھی اور میں بہت تلخ محسوس کر رہا تھا جیسے اس
نے مجھے دھوکا دیا ہوا اور ایک دم یوں لگنے لگا جیسے میں نے بہت لمبی مسافت
طے کی ہوا اور آخر میں اکیلا کسی صحرا میں بھٹکنے کو چھوڑ دیا گیا ہوں۔ سب چہرے
عجیب سے نقاب پہنے ہوتے تھے جانے سطح کے نیچے اس باریک جھلی تلے ہر کوئی
کیا تھا؟
تندرست ہو کر جس دن میں گھر گیا ہوں پاربتی نے پوجا کروائی اور برہمنوں
کو بھوجن کھلایا۔ بابا کے مرنے کے بعد سے یہ اس ویران گھر میں شاید پہلی خوشی کا
موقع تھا۔ بچے نئے رنگ برنگ کپڑے پہنے گھوم رہے تھے۔ رشتہ کی عورتیں اور مرد
جمع تھے اور بڑی رونق تھی۔ پاربتی آنکھوں میں آنسو لیے مگن اندر باہر آجا رہی
تھی اُسے ماں اور بابا یاد آ رہے ہوں گے۔ گو میں ذہنی طور پر سارے ناتے توڑ
چکا تھا اور اس لیے پاربتی سے بھی واجبی رشتہ سمجھتا تھا مگر اس کی خوشی سے مجھے
خوشی ہو رہی تھی۔ بے چاری زمانوں سے خوشی کے ایک بول کے لیے ترس گئی تھی
اس نے دیکھا ہی کیا تھا۔ بچپن میں ہر شے کے لیے ترس کر جب جوان ہوئی ہے تو
بیاہ میں بچے اور دُکھ ملے اور وہ بابا کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے واپس
جو آئی ہے تو گھر جانا نصیب نہ ہُوا۔ اور آج کیسی خوشی تھی۔ میں نے اُسے کبھی کچھ نہیں
دیا میرے پاس تھا ہی کیا!
پھر پاربتی نے کہا "بھیا لوگ تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔"
میں نے کہا "آ جائیں میں کونسا چھپا بیٹھا ہوں۔"
کہنے لگی "اب تم بچے تو ہو نہیں سمجھتے کیوں نہیں کہ میں تمہاری سگائی کی بات

کر رہی ہُوں۔" وُہ ہنسنے لگی۔

"نہیں پاربتی یہ نہیں ہو سکتا مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے شادی بیاہ میرے پروگرام میں شامل نہیں۔ میں کسی لڑکی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ میں اپنی مرضی سے اپنی پسند سے یہ کام کروں گا۔ تمہارے یا کسی اور کے کہے سے نہیں۔" غصے سے میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"پھر میں تمہاری کوئی نہیں ہُوں؟" پاربتی نے ہاتھ ملتے ہُوئے کہا۔

"اس معاملے میں نہیں۔ میں اپنی زندگی تمہارے ہاتھ نہیں دے سکتا جاؤ اب چلی جاؤ۔" وُہ روتی ہوئی باہر آنگن میں چلی گئی جہاں سگائی کے لیے جانے کون لوگ آئے بیٹھے تھے۔ میں جوش سے اُٹھا اور حیرت سے دیکھتی ہوئی عورتوں کی بھیڑ میں سے سر جُھکا کر نکل گیا اور جانے کب تک چلتا گیا کہ جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی بیٹھک کے سامنے کھڑا تھا جس میں پہلے پہل میں نے چنڈی داس کو دیکھا تھا۔ اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر مجھے یُوں کرسی پر بٹھایا جیسے میں کوئی دیوتا ہُوں اور اس نے زمانوں کے بعد اپنے بھگوان کے درشن کیے ہوں۔

"اچھا کیا مرلی تم آگئے ہو کہو کیسے ہو۔ کیا تمہارا رزلٹ نکل آیا ہے تم پاس نہیں ہُوئے کیا؟ تمہارا چہرہ زرد کیوں ہے؟ میں اپنے کاموں میں لگا تھا تمہارے پاس اس دن کے بعد ہسپتال میں نہ آسکا۔ بولو تم کو کیا ہے تمہارا چہرہ خود کشی کرنے والوں کی طرح بے نور کیوں ہے۔ تم زندہ تو ہو مُرلی؟" پھر اس نے مجھے زور زور سے ہلایا۔ پینے کو پانی دیا۔ کپڑے بدل کر وُہ مجھے تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لایا اور ہم دونوں یوں فٹ پاتھوں اور سڑکوں کو پار کرنے لگے جیسے کسی ارتھی کو کندھا دے رہے ہوں اور زمانوں سے انہی راہوں پر چل رہے ہوں۔

"آدمی زیادہ غلام نہیں رہ سکتا مرلی" چنڈی نے اپنی پُرانی نیکر پہن کر کپڑوں کو احتیاط سے کھونٹی پر لٹکاتے ہُوئے کہا۔ میں نے زمانے کے سب سرد گرم دیکھے ہیں مگر میں نے اپنی آزادی کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ میں نے جسم سے لیکر رُوح کو بیچنے

تک کے سب کاروبار کیے ہیں مگر آدمی زادہ فطرتاً آزاد ہے میرے بھائی۔

ہم دونوں نے چار آنے کے چنے کھاتے تھے میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا اور چنڈی کے پاس تو بھلے سمے میں بھی کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ آدھی رات کو جانے کہاں سے آج کی طرح پونم کا چاند کھلے دروازے میں سے جھانک رہا تھا اور کنوئیں کی سی تاریکی میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم میلوں چلے تھے اور ہم نے سوائے چند باتوں کے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ باتیں کرنا چاہتا تھا اور تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔

میں نے کہا چنڈی میرا خیال ہے اب میں گھر جاؤں گا دیدی ناحق پریشان ہوگی

"تو اچھا میرے بھائی جیسی تمہاری مرضی رُک جاتے تو تم سے باتیں کرتے، جاتے ہو تو پھر کبھی سہی۔

صبح کا تارا ٹمٹمانے لگا تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میری بوجھل آنکھوں میں چُبھ رہے تھے جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ پاربتی بنا بولے ایک طرف ہوگئی۔ میرا جی چاہتا تھا میں اس کے گلے سے لگ جاؤں اور بہت روؤں مگر پھر میں نے اپنے ہاتھوں کو مضبوطی سے روکا اور مٹھیاں بھینچ کر آگے بڑھ گیا آنگن میں جھوٹے تیلوں کا ڈھیر ایک طرف پڑا تھا۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں اور بلیاں منڈیروں سے پھلانگتی چیختی ہوئی یوں بھاگ رہی تھیں جیسے انہوں نے کسی بدروح کو دیکھ لیا ہو۔

اگلے دن جب میری آنکھ کھلی ہے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور میرے نام رجسٹری سے آیا ایک لفافہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ امتحان میں پاس ہونے کی اطلاع تھی۔ ایک لمحے کو مجھے ذرا سی خوشی ہوئی جیسے کوئی رنگ آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر میں نے خط میز کی دراز میں رکھ دیا اور چائے پی کر خاموشی سے باہر نکل گیا ایک امتحان میں پاس ہونے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے اور پھر مقابلے کا امتحان کسی کی منزل تو نہیں ہوسکتا!

کسی غیر ملکی ادیب کی آمد میں کافی ہاؤس میں شاید کوئی تقریب تھی لوگ
نئے آزاد ہوتے ملکوں کا ذکر زور شور سے کر رہے تھے افریقہ اور ایشیا کے
نئے ملکوں کا ذکر جو زمین کا نقشہ بدل رہے تھے۔ میں کسی سے بات کرنے کے موڈ
میں نہیں تھا اور اس لیے خاموشی سے جا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیرے ایک میز
کو سجا رہے تھے اور آپس میں جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پانی کا ایک
گلاس منگوایا اور گھونٹ گھونٹ پیتا ہوا اپنے سامنے والی کھڑکی سے بازار کی طرف
دیکھنے لگا سارے چہرے مجھے خوش اور مطمئن لگتے تھے موٹروں میں لدی ہوئی
عورتیں اور سیر کرتے بچے، فٹ پاتھوں پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالتے
اور گھومتے ہوتے دوست نئے فیشن کے کپڑے پہنے اٹھلا کر چلتی لڑکیاں
کتابیں بغل میں دبائے اپنے خیالوں اور سول سروس کے خواب لیے نوجوان طالب علم
محبت میں مبتلا زرد رُو آدمی جانے آج مجھے سوائے اپنے سبھی لوگ خوش کیوں دکھائی
دیتے تھے۔ شاید امتحان کے رزلٹ کا اثر تھا مگر نہیں میں نے پانی کا گھونٹ پی کر بے
ترتیب لفظوں کو جوڑتے ہوئے سوچا امتحان سے مجھے کیا لینا ہے زیادہ سے زیادہ
یہی ہو سکتا ہے نا کہ ایک اختیار میرے ہاتھ میں آجائے گا۔ پر اس سے آگے اور اس
کے آگے آزادی کہاں تھی اور آدمی زادے کے لیے آزادی سانس سے بڑھ کر
ضروری تھی جب دن ڈھل گیا اور بھوک سے میری آنتیں گڑ گڑانے لگیں تو میں
نے بیرے کو بلایا اور کھانے کے لیے کچھ منگوایا۔ وہ ٹرے لے کر آیا تو ساتھ میں
چنڈی اور روی بھی تھے روی نے کہا "اگر تم مصروف نہیں ہو تو میں آجاؤں"
"میں نے کہا "بظاہر تو کچھ نہیں۔ مگر لفظوں کو ترتیب دے رہا ہوں"
"بہت خوب، بہت خوب" روی نے مڑتے ہوئے کہا "ہونہار اور ذہین
آدمی ہو ہم تو یہاں پر سوائے جھک کے اور کچھ نہیں جوڑ سکتے"
چنڈی نے کہا۔ میں تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤں شام تک انتظار
نہیں کر سکتا حالانکہ لمبی تقریروں کے بعد یقیناً اچھی چائے پینے کو ملے گی۔

کھاتے کھاتے میں نے پوچھا "پر آ کون رہا ہے۔"

"یا ر وسطی یا جنوبی یا شمالی افریقہ کا کوئی سرکاری آدمی ہے اور اُس کو ادیب لوگوں سے ملوانے لایا جائے گا۔ رادھے شیام نے اسی کافی ہاؤس کو پسند کیا ہے یہاں پر بیٹھنے والا ہر آدمی مدعو ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر چنڈی نے کہا میں یہاں بیٹھ کر آج کا اخبار پڑھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم نے اخبار چھوڑ دیا ہے کیا؟"

اس نے تازہ اخبار کھول کر میز پر اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا "ہاں" اور اور پھر پڑھنے لگ گیا۔

ہر تازہ پاس شدہ نوجوان کی طرح میرے خیالات بھٹک کر آخر سول سروس کے امتحان کی کامیابی پر رُک گئے۔ زبانی امتحان کا اعلان جانے کب ہو اگر اس میں بھی کامیاب ہو گیا تو پھر باہر چلا جاؤں گا۔ کسی جگہ نیویارک یا جاپان روس یا کسی اور جگہ سرکاری آدمی ہو کر میری ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔ میں اپنے ادیب بھائیوں کے لیے کیا کچھ کروں گا مگر انسانوں کے لیے کیوں نہیں۔ پھر چپکے سے میرے دل میں کسی نے کہا "اپنے لیے آج تک کیا کر سکے ہو جو اوروں کے لیے کچھ کرنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو پھر جاپان اور امریکہ کی دیکھی ہوئی پوسٹ کارڈ سائز تصویریں میری نگاہوں میں گھومنے لگیں اور اپنے سامنے بیٹھا چنڈی مجھے چھوٹا سا ٹڈا لگنے لگا جو ایک شاخ سے دُوسری شاخ پر پھدک کر بیٹھنے کو آزادی جانتا ہے۔ بھوک اور پیاس اور گندگی کے بدلے جانے کیا کچھ بیچ کر یہ خوش ہو میرا جی چاہا میں اُسے امتحان میں اپنے پاس ہونے کی خبر بتاؤں۔ جانے یکایک کیوں میں اپنے آپ کو کُرسی سے اُٹھتا محسوس کر رہا تھا۔ میرا قد میری نگاہوں میں بڑھ گیا تھا۔ اور دل چاہتا تھا میں اُونچی آواز میں گاؤں اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر باہر آنے جانے والے راہگیر سے کہوں کہ میں کسی سفارت خانے کا ایک ذمہ دار

افسر ہُوں۔ آج کی کامیابی کی خبر تیز اور تلخ شراب کی طرح میرے دماغ کی طرف چڑھنے لگی۔ ترتیب دیے ہُوئے لفظ بے ترتیب ہونے لگے۔ بھلا میں نظمیں کہنے جیسے بے کار شغل میں کیوں لگا رہوں میں نے ارادہ کیا کہ میں گھر جاؤں گا۔ اُٹھا ہوں تو چنڈی نے کہا "ارے مُرلی کہاں جا رہے ہو بھائی بیٹھو ابھی کوئی دم میں لوگ آیا چاہتے ہیں"

مگر میں اس سے کچھ کہے بنا چلتا ہُوا دروازے تک آ گیا۔ کھول کر باہر نکلنے کا ارادہ ہی رہا تھا کہ مارجری کے ایک بازو پر ڈاکٹر رادھے شیام اور دُوسری طرف وُہ غیر سرکاری آدمی اندر آ گئے۔ مارجری نے بہت گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر میرا تعارف اس سے کروایا اور اسی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے اس میز کی طرف لے آئی جس پر چائے کے برتنوں کے درمیان پھولوں کے گلدستے رکھے تھے اور جہاں کافی ہاؤس میں آنے والے ہر آدمی کے لیے جگہ تھی۔

چنڈی میرے برابر بیٹھا تھا اور بار بار کہنی مار کر کہہ رہا تھا آخر "غیر عورت کو اس محفل میں لانے کی کیا تک تھی افریقہ اور ایشیا کا تقدس کیوں قربان کیا جا رہا ہے کیا ہم لوگوں کی دوستی ایسی غیر اہم شے ہے کہ اُسے مارجری کے وجُود سے ناپاک کیا جاتا"

مارجری ڈاکٹر رادھے شیام سے باتیں کر رہی تھی اور اپنی کسی نئی نظم کا تذکرہ سُنا رہی تھی۔ میں چنڈی اور اس کے درمیان بیٹھا تھا اور میرا جی وہاں سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ آخر میں چنڈی کو کیا جواب دیتا کہ افریقہ ایشیا کا تقدس اور اسکی ناپاکی بہت غیر اہم شے ہے اور یہ کہ جب اپنے ہی کسی شے کو ناپاک کریں پاؤں تلے روندیں تو دُوسرے اس کو کیا جانیں گے۔ ہم نے آج تک خود کو ان چیزوں کا اہل کہاں ثابت کیا تھا۔ سفید فام انسانوں کو ہم آج بھی عظیم سمجھتے تھے ہماری اپنی کونسی شے تھی؟

پھر جب افریقی آدمی نے رواں انگریزی میں دِل قلم سے اپیل کی اور

اپنے صدر کا نعرہ "حرم بے" پُورے جوش سے لگایا تو سب کے چہرے چمک اُٹھے۔ سب نے اس کا ساتھ دیا اور کافی ہاؤس "حرم بے" کی آوازوں سے گونج اُٹھا۔ اس نے کہا جب قومیں اپنے وجود سے خود آگاہی حاصل کرتی ہیں تو زلزلہ آتا ہے۔ زندگی کا جما جمایا نظام اپنی بنیادوں سمیت ہل جاتا ہے مگر اس کھنڈر پر نئی عمارت کی تعمیر کے لیے "حرم بے"... کافی ہے۔ اس کا مطلب ہے بڑھے چلو۔ "آگے اور آگے ہماری کوئی منزل نہیں ہے۔ ہم دیر میں جاگے ہیں۔ اور اس لیے ہمیں بھاگنا ہے۔ عروج زوال کو اپنے ہاتھوں میں لینے والی قوموں سے اپنی تقدیر چھینتی ہے۔" پھر وہ ذرا آگے جھکا اور اپنے سامنے بیٹھی مارجری سے کہنے لگا۔ "مادام کیا آپ ہمارے لیے "حرم بے" نہیں کہیں گی"۔

مارجری نے بڑی کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا "مجھے اس کا صحیح تلفظ معلوم نہیں اور غلط کہوں گی تو آپ کو خوشی کی بجائے رنج ہوگا"۔

چونکہ ڈاکٹر رادھے شیام اپنی تقریر اس سے پہلے کر چکے تھے اس لیے افریقی افسر کی تقریر کے ساتھ کہنے سُننے کا پروگرام ختم ہوگیا اور سب چائے کی میز پر مصروف ہوگئے۔

مارجری نے چائے کا پیالہ پکڑ کر کہا "آؤ، اس کونے میں سیڑھیوں کے قریب بیٹھ کر ہم باتیں کریں۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے"۔

میں چنڈی سے الگ ہو کر اپنا پیالہ لیے اس نسبتاً تاریک کونے میں چلا گیا کافی ہاؤس کی فضا جو پہلے خوابناک اور دھوئیں سے بوجھل ہوتی تھی آج کچھ آسودہ "حرم بے" کے نعرے سے جاگی جاگی اور کم بوجھل لگی۔

جہاں میں اور مارجری بیٹھے تھے وہاں سے شام کا تارا مدھم جلنے والے مشرقی طرز کے لیمپ کے اُوپر کھلے دریچے میں سے دکھائی دے رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وُہ ہماری دوسرتھ کے لیے ہو۔ اُوپر کی منزل پر شہر کے سارے اہل قلم ابھی تک "حرم بے" کے نعرے کی گونج اپنی رُوح میں سن رہے تھے شور کرتے اور جانے کونسی

باتیں کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد مارجری نے کہا "مجھے تو یہ افریقی دیوانہ جان پڑتا ہے۔ بھلا کافی ہاؤس بھی ایسی جگہ ہے جہاں نعرے لگائے جائیں۔"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ پیالے پر اور جھک کر میں نے اپنی چائے ختم کی۔ وہ پھر بولی "تمہارا کیا خیال ہے۔ مُرلی کیا خالی باتوں سے قوموں اور ملکوں کے دل جیتے جا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "تم جانتی ہو مشرق میں ہر شے ممکن ہو سکتی ہے ہم منظم قوم نہیں ہیں۔ ہمارے اندر سو طرح کے انتشار ہیں مگر یہ شیرازے کی پریشانی بھی تو ایک طرح کی ترتیب ہے جو ہم لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ دیکھو آکاش پر تارے کتنی بے ترتیبی سے پھیلے ہیں۔"

اکیلے تارے کے ساتھ اور تارے بھی نکلتے آ رہے تھے شاید پچھلی راتیں تھیں اور چاند دیر سے نکلنے والا تھا۔

"آنسو گیس سے جدید ترین ہتھیاروں تک زمانوں کی دُوری ہے مُرلی۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا اگر یہ خیال ہے کہ میں آنسو گیس ہوں تو یہ دوسری بات ہے ورنہ قومیں سالوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کر سکتی ہیں۔" میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا۔

تم کج بحثی کرتے ہو۔ میں تو تم سے یہ پوچھنے والی تھی کہ تم کو وعوت کے لیے کون سا دن پسند ہے میں تمہاری تندرستی کی خوشی میں کچھ لوگوں کو کھانے پر بلانے والی تھی۔ میرے اپنے غیر ملکی دوست بھی ہوں گے۔ ایک ہنگامہ رہے گا۔"

مجھے "حرم بے" کی گونج اپنی رُوح میں سُنائی دے رہی تھی میں نے مارجری کی طرف دیکھ کر کہا "تمہاری مصروفیت میں یہ اگر ممکن ہو تو جو دن تمہیں پسند ہو رکھ لو مگر اس کو خاص میری تندرستی کا دن بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانوں

میں سے ایک ہوں تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

"جیسی تمہاری خوشی" اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ "تمہیں کیا معلوم ہے تم مجھے کتنے عزیز ہو۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "حرم بیبے آؤ ہم بھی دوستوں میں ملیں" پھر میں اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ کر چائے کی میز کی طرف چلا گیا۔ وہ تھکے ہوئے بوجھل قدموں سے اپنے شام کے لمبے لباس کو ہاتھوں میں سنبھالتی اوپر آئی اور ڈاکٹر رادھے شیام کے پاس کھڑی ہو گئی۔ فریقی ابھی تک چندی سے کسی بحث میں اُلجھا ہوا تھا اور رات کی روشنیاں سڑکوں پر زیادہ روشن اور زندہ لگی تھیں۔

مارجری نے ہوٹل سے اٹھ کر ایک نہایت فیشن ایبل کالونی میں گھر لیا تھا اور جب تو لن میں ہسپتال میں موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا تھا وہ اس گھرانے کو سجانے میں مصروف تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے گھروں سے اور امریکی سفارت خانے کی وساطت سے اس نے کافی سامان اکٹھا کر لیا تھا اور اپنے حالوں وہ ایک سرد موسم گذارنے کے لیے اطمینان سے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے نوادرات کی دکانوں سے مشرقی مصوری کے نمونے خریدے اور انہیں ڈرائنگ روم میں مناسب جگہوں پہ رکھا تھا مگر میں نے یہ سب تو اس دن دیکھا جس رات دعوت تھی گھر میں گھسا ہوں تو اُس نے کہا "مرلی" "پہلے میرے ساتھ اس گھر میں گھومو اور بتاؤ میں نے اُسے کتنا تبدیل کر لیا ہے۔

وہ میرے بازو سے پکڑ کر سب سے پہلے مجھے بیڈ روم میں لے گئی۔ "یہ میرا سب سے پرائیویٹ کمرہ ہے مگر تم سے کیا چھپانا تم بتاؤ کیا تمہیں یہ تصویر پسند نہیں"؟

دیواروں پر نیم برہنہ تصویریں تھیں جن میں کسی کے نیچے عمر خیام کی رباعیوں کے ٹکڑے لکھے تھے چند برہنہ عورتوں کی تصویریں تھیں اور کچھ مغلیہ آرٹ کی نقل میں بنے ہوئے نہایت بھونڈے اور بھدے خاکے سے تھے۔

دیکھا تم نے میں نے مشرق سے کیا کچھ لیا ہے" اس نے میرے ساتھ لگ کر کھڑے ہوتے ہُوئے کہا۔

"ان میں سے کچھ بھی مشرق کی رُوح کو نہیں پہونچتا جانے کس کی تصویریں ہیں جن کے نیچے رباعیوں کے ٹکڑے لکھے گئے ہیں اور یہ تو تمہارے ہاں کا آرٹ ہے۔ برہنہ اور نیم برہنہ اور یہ جنہیں تم مغل آرٹ کی نقل کہتی ہو نہایت واہیات اور بھدے نقل کرنے کی کوشش کے مظاہرے ہیں" میں بہت بدمزگی سے باہر جانے کے لیئے مڑا۔

" مگر چنڈی داس نے تو کہا تھا کہ یہ سب مشرق کے بہت بڑھیا آرٹ ہیں" اس نے ہکلا کر جواب دیا۔

" چنڈی داس سے پوچھنا پھر" میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

دعوت بہت بے کیفی میں شروع ہُوئی۔ میں بیزار سا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا اجنتا کے غاروں کی تصویروں والی کتاب دیکھتا رہا مارجری نے ایک دو بار میرے پاس آکر کہا بھی کہ یہ تم کیا کر رہے ہو لوگوں سے بات کرو۔ دُوسرے کمرے میں جاکر ریکارڈ بجا کچھ تو کرو مگر میرا دل جانے آپ ہی آپ ڈوب کیوں رہا تھا پھر بھی میں اُٹھا اور دُوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں چلا گیا باہر گھٹن کی جگہ ایک خوشگوار خنکی تھی۔ بہار کو بیتے کافی دن ہو گئے تھے مگر ابھی تک پھولوں میں باس تھی اور بھیگی رات میں ستارے سکون برساتے تھے۔ کوٹھیوں میں بتیاں جل رہی تھیں اور ساری بستی میں ماتم دیوالی ہو رہی تھی۔ کہیں دُور سے سہگل کے گیت کے بول سنائی دیتے اور ستارے اور قریب ہو کر زیادہ تیزی سے چمکنے لگے۔ ایسے میں جانے کیوں مجھے ماں یاد آئی اور پھر بابا اور ان کی زندگی کی وُہ کہانی جو میں نے دُوسروں کی زبانی سُنی تھی۔ بابا نے آخر کون سے تصور پر اپنی ساری جوانی قربان کی اپنا آرام اپنا عیش تج دیا ان دنوں جب میری طرح وُہ محبت اور دوست داری میں وقت گذار سکتے تھے انہوں نے جیل کی تاریک کوٹھریوں میں تنہائی

اور تاریکی کو قبول کیا - آخر کیوں ؟

بابا کی زندگی میں بھی کوئی رتی آئی ہوگی - ان کا دل بھی میری طرح یادوں اُور اُمیدوں کی بھٹی میں جلا ہوگا -

پر ہم تو آزادی حاصل کر چکے ہیں جس شے کے لیے ان کی نسل جد وجہد کرتی رہی وُہ ہمیں مل گئی ہے وہ جس باغ کی آبیاری اپنے خون سے کرتے رہے اسکے پھل ہم نے کھائے پھر یہ اُداسی اور یہ مایوسی اور عدم طمانیت جو ہماری نسل کا امتیازی نشان تھا اس کی کوئی توجیہہ کوئی تشریح کہیں نہیں مل سکی میں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا - میری نظر سامنے والے تارے پر تھی یہ روشن تارا میرا مستقبل ہے اس میں کتنی چمک ہے میں نے سوچا میں آج رات دعوت سے جلد واپس چلا جاؤں گا - امتحان کی تیاری کرنے کے بعد کچھ دیر حالاتِ حاضرہ سے متعلق سوچوں گا - پر جانے کیا ہُوا میرے سامنے ہی وُہ تارا ٹوٹا اور لمبی روشنی کی لکیر آسمان کی تاریکی میں تیز دھار تلوار کی طرح بے نیام کھنچ گئی اور تبھی مارجری نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا -

دیوانے ہو گئے ہو کیا - میں تمہیں ہر جگہ دیکھ آئی ہوں اندر چل کر بیٹھو آدمیوں کے مجمع سے تمہیں وحشت کیوں ہوتی ہے -

میرا تارا ٹوٹ کر تاریکی میں ڈوب چکا ہے میں دل ہی دل میں دہرایا اور مارجری کیساتھ اندر آگیا -

اندر لوگ گروہوں بٹے کر باتیں کر رہے تھے اور گلاسوں میں مختلف شرابوں کے رنگ قوس و قزح کے رنگوں کی طرح دمک رہے تھے - میں نے اپنے لیے ایک لارج جن انڈیلی اور گلاس کو پکڑے دو امریکی نوجوانوں کے پاس جا کھڑا ہُوا ان میں سے ایک شاید ماہر اقتصادیات تھا اور دُوسرا بہرے کرنیوالی پارٹی کا رکن تھا وہ ہمارے ملک کی آئندہ ترقی کے ممکنات پر باتیں کر رہے تھے - میری طرف دیکھ کر کہنے لگے " آؤ مسٹر مرلی ہمیں بتاؤ کیا اس ملک میں آئندہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کی طاقت ہے ؟ "

میں نے باری باری دونوں کے چہروں کی طرف غور سے دیکھا وہ سنجیدہ تھے

اور مجھے ذہین بھی لگتے تھے۔

"میں آپ لوگوں کا مطلب نہیں سمجھا آپ کس ملک کی بات کر رہے ہیں"؟ میں

میں نے نرمی سے پوچھا۔

"یقیناً ہم اسی کی بات کر رہے ہیں جس کی سرزمین پر ہم کھڑے ہیں" ماہر اقتصادیات نے کہا

"آپ لوگوں کو ہماری اتنی فکر کیوں ہے جناب"؟ میں نے ہنس کر ایک بڑا سا

گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا یہی خیال ہے تو ایسا ہی ہوگا؟ ہنڑے والے صاحب نے بالکل بُرا مان کر کہا

"مگر ہم لوگ اس ملک کے دوست ہیں آپ کی سکیموں میں پیسہ لگاتے ہیں

اور یقیناً بات کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں" دوسرے نے بات کی۔

"ہم اپنے پاؤں پر صدیوں سے کھڑے ہیں آپ لوگ ستون اور سہارے

خواہ مخواہ تعمیر کرتے ہیں آج کی شام ان بیکار باتوں میں کیوں گنوا رہے ہیں

چلیے مجھے اپنے ہاں کی باتیں بتائیے ہو سکتا ہے مجھے کبھی آپ کے ہاں جانا پڑے"

میں نے بڑی لاتعلقی سے کہا۔

"ہم لوگ قسم قسم کے وظائف دیتے ہیں مسٹر مُرلی اگر تم چاہو تو تمہارے لیے

بندوبست ہو سکتا ہے۔ تم ذہین نوجوان ہو" سروے والے نوجوان نے بڑی بے نیازی

سے آفر کی۔

چینڈی داس نے دوسرے کونے سے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر لمبے لمبے ڈگ

بھرتا میری طرف آ گیا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں"؟ اس نے ایک سے دوسرے کے چہرے کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں، قرض داروں اور قرض خواہوں کی گفتگو تھی" میں نے بڑی خوشدلی

سے کہا۔

"یہ سراسر غلط ہے مسٹر مُرلی" دونوں امریکیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

" ہمارے پڑھے لکھے نوجوان ایسی ہی غلط بیانیوں سے اپنے دل کو تسلی دیتے رہتے ہیں۔ اصل میں ہم لوگوں کی آواز کو تو قرض کے بوجھ نے سینوں میں دبا رکھا ہے۔ تفریحاً کبھی کوئی سوچ بچار والا نوجوان دل کی تلخی کو اس طرح راہ دیتا ہے۔" چنڈی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

دونوں غیر ملکی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

" آپ لوگوں نے ہمیں کارخانے بنانے کے لیے قرض دیا ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں بنانے کو مدد دی ہے۔ دودھ سے لے کر کھانے پینے، اوڑھنے پہننے کی ہر شے آپ کے ہاں سے آئی ہے اور پھر بھی ہمارے نوجوان اتنے احسان فراموش ہیں۔" چنڈی نے پھر میرے ہاتھ میں پکڑے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

" یہ غیر ملکی شراب ہمیں کہاں نصیب ہو سکتی اگر آپ لوگ ہم پر عنایت نہ کرتے۔" وہ بدستور سنجیدگی سے ان سے مخاطب تھا۔

میں خاموش تھا، فضا بوجھل لگ رہی تھی جن کی گرمی میری رگوں میں آگ بنی بنی ہوئی تھی اور آدمیوں سے بھرے اس کمرے میں مجھے قیدی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

" آپ کسی اخبار کے ایڈیٹر ہیں شاید۔" ایک امریکی نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

پہلے تو مجھے لگا کہ جیسے چنڈی ہوش و حواس میں ہے، پھر لگا وہ مدہوش ہو رہا ہے اور ابھی اگر گرے گا۔ پھر اس نے پاس پڑے ہوئے میز سے گلاس اٹھایا، اسے ہوا میں لہرایا اور زور سے سامنے والی کھڑکی کے پردے مارا اور چیخنے لگا " کیا اخبار کے بنا میرا وجود نہیں ہے۔ میں اخبار کے ایڈیٹر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں کیا؟ جو بھی ملتا ہے مجھ سے اس سالے اخبار کی بات کرتا ہے جیسے اخبار ہی سب کچھ تھا۔ ارے میں اخبار سے پہلے بھی زندہ تھا اور اب بھی زندہ ہوں۔ آدمی زادہ غلام نہیں رہ سکتا۔" چنڈی اپنے بازو زور زور سے ہلا رہا تھا۔

"ان لوگوں کو بات کرنے تک کا سلیقہ نہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتے۔ ذرا سی شراب ان کے دماغ کو بگاڑ دیتی ہے اور آزادی کی حفاظت کرنے کے خواب دیکھتے ہیں؟" کونے میں کھڑی تقریباً کانپتی ہوئی ایک بدیسی خاتون نے کہا۔

مارجری دوسرے کمرے سے نکلی، ریکارڈ بند ہوگئے اور کچھ لوگ دروازے میں آ کر کھڑے ہوگئے۔

"چنڈی تمھیں کیا ہوگیا ہے؟" وہ بھاگ کر آئی اور چنڈی کے بازو میں جھول گئی۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا۔ آج بھی مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ میں نے کیوں کیا تھا مگر جب چنڈی نے مارجری کے منہ پر تھپڑ مارا اور اسے اپنے سینے سے الگ کیا ہے تو پھر مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ میں نے کیا کیا تھا مگر میرا سارا منہ شیشے کے ٹکڑوں سے زخمی تھا۔ میری آنکھوں میں خون تھا اور روشنیاں سُرخ دھبوں کی طرح کمرے میں چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ چنڈی کا گریبان دھجیاں ہوگیا تھا اور وہ مجھے زور زور سے ٹھوکریں مارتا ہوا کہہ رہا تھا:

"تم اس غیر ملکی کُتیا کے لیے مجھ سے، اپنے دوست سے، اپنے یار سے بھڑ گئے۔ تمھیں شرم نہ آئی۔"

سارے ملکی اور غیر ملکی لوگ کھانا کھائے بنا ہی رخصت ہو گئے اور لمبی راہ داری میں سجی موم بتیاں جل جل کر خود ہی بجھ گئیں۔ سارے گھر پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ ڈاکٹر میرے زخموں پر دوا لگا کر جاچکا تھا۔ اور مارجری کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں سوتے جاگتے یوں جیسے ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ وقفوں کے بعد مجھے دکھائی دیتی۔ مجھ پر جھکی ہوئی کبھی ایک دوا پلاتی اور کبھی دوسری دوا کیونکہ میرے منہ کا مزہ ان وقفوں میں بدلتا تھا۔

پچھلی راتوں کا چاند صدیوں کے پرانے آسمان پر جب نکلا ہے اور میری آنکھوں میں کرنیں جھانکی ہیں تو میں نے اپنے پہلو میں سنگِ مرمر کے ایک مجسمے کو لیٹے ہوئے محسوس کیا اور مجھے لگا جیسے دیوار پر لگی کوئی برہنہ تصویر ہے جو جانے

یکدم مجھے اپنے پاس لگ رہی ہے مگر کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی اور مجسمے نے آنکھیں کھول کر ہنس کر مجھ سے پوچھا "مرلی! اب جی کیسا ہے؟"

اور پھر میری زندگی کا نیا رنگ محل آپ سے آپ بن گیا۔ یہ جادو محل جو صرف نظر کا دھوکا تھا جس کی بنیادیں ہوا پر تھیں اور جس کی دیواروں میں روزن ہی روزن تھے۔

آج بھی میں سوال نہیں کر سکتا کہ میں یہاں کیوں ہوں جیل کی تاریک کوٹھری میرا مقدر کیوں بن گئی ہے اور میں نے یہ راہ اپنے لیے کیوں چن لی ہے۔ وہ زہر رنگ شامیں بھی میں نے خود پسند نہ کی تھیں۔ وہ شامیں جب میں سوال نہیں کر سکتا تھا۔ مارجری کے ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک اور شراب کے جام کی تلخی راتوں کے سوتے جاگتے لمحوں کی مدہوشی اور مشرق کی روح کے ساتھ یہ دلچسپ مذاق مجھے آج بھی اس کی حقیقت ایک سپنے سے زیادہ نہیں لگتی۔ ایک ایسا سپنا جو چنڈی کی بیہودگی نے مجھ پر ٹھونسا تھا۔

مارجری میرے قدموں میں بیٹھی ایک پتی ورتا عورت تھی۔ میں اور وہ ایک بیاہتا جوڑے کی طرح ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ سردی شمالی ہند کے میدانوں میں اپنے برفیلے کوڑے لہراتی آگئی تھی اور اس کا یہاں کا قیام قریب آنے والی موت کی طرح مجھے روز بروز زیادہ بھیانک انجام کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

جانے اس کے بعد میرا کیا بنے گا؟ مُرلی دھر مہاشے کا کیا بنے گا؟ جسم کی عبادت جب بالآخر ختم ہو گی تو اس کے ساتھ کیا ختم ہو گا؟

مجھ پر یہ تجربہ ٹھونسا گیا تھا کیا میں نے اسے قبول کیا تھا؟ سلگتی شاموں کے بعد ایسی راتوں کو جب میں پاربتی کو اپنے وجود سے آگاہ کرنے کی خاطر گھر لوٹتا تو وہ میرے ستے ہوئے چہرے اور زرد گالوں کو دیکھتی۔ میں خود بھی لوگوں کی نظروں سے بچتا یہ سارے آئینہ خانے تھے جن میں مجھے اپنی صورت

مختلف زاویوں سے نظر آتی۔ مگر مجھے ہوش کہاں تھا؟ مَیں تو سول سروس کے زبانی امتحان کی تیاری میں لگا تھا۔ ان دنوں کانی ہاؤس کا کوئی دوست راہ میں مل جاتا تو میں اس کی آنکھوں میں چھپے طنز کو برداشت نہ کر سکتا۔ لوگ جھوٹ کہتے تھے کہ آزادی آدمی کا ازلی حق ہے۔ آدمی تو اپنے لیے خود بندھن اور دیواریں اور پریشانیاں خریدتا ہے، وہ خود آسانیوں سے بھاگتا ہے

جس دن میں سول سروس کے زبانی امتحان کے لیے بورڈ کے سامنے حاضر ہوا ہوں میرا دل کہتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مارجری نے مجھے کہا تھا: "اچھا ہو اگر تم اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور اپنے خیالوں میں ٹھکانے سے زندگی کرنے لگو اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو دیکھو گھبرانا نہیں۔ مَیں نے تمھارے لیے بہت سی راہیں سوچی ہیں۔ جاتے ہوئے تم میرے ساتھ چلو گے، وہاں تمھارے جیسے ہونہار نوجوان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

مَیں نے اتنی نفرت اور غصّے سے اس کی طرف دیکھا ہے کہ وہ پریشان ہو کر کہنے لگی: "کیوں مُرلی! مَیں نے کون سی ایسی بات کہی ہے؟"

مَیں نے کہا "تم ایسی بدشگونی کی باتیں منہ سے کیوں نکالتی ہو!"

"یہ شگون کیا ہوتے ہیں؟" وہ بڑی نرمی سے مجھ سے پوچھنے لگی۔

"شگون کیا ہوتے ہیں ——" مَیں نے زور سے دہرایا۔ "تم اپنے حالوں مشرق کے شاعروں کے دل کی دھڑکنوں کو اپنی زبان میں منتقل کرتی ہو۔ اتنے دنوں سے یہاں پر ہو اور ابھی تک تمھیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شگون کیا ہیں۔ تم لوگ ہزاروں میلوں سے چل کر یہاں کیوں آتے ہو جب یہاں کی زندگی سے تم کو واجبی سی دلچسپی اور واقفیت نہیں ہو سکتی۔"

"میرے خدا! مُرلی، تم اتنے خفا کیوں ہو۔ تمھیں معلوم ہے آخر یہ غیر ملکی عورت ہوں اور پھر تم! تم کو میں اتنا رجعت پسند نہیں سمجھتی تھی۔ بوڑھی عورتوں کی طرح تم بھوتوں اور ٹونوں اور جانے کن کن باتوں میں یقین رکھتے ہو۔ میں تمھیں

ابھی تک نہیں جان سکی۔" وہ ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔

مَیں نے بازو سے پکڑ کر اُسے زور سے کھینچا اور کہا " اگر تم اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔ دیوانی اور مغرور قوم کے بے وقوف لوگوں کو کیا پتہ کہ زندگی کی پاکیزگی اور اس کا تقدس کیا ہے ؟"

" چھوڑو میرا ہاتھ۔" اُس نے جھٹکے سے اپنا بازو مجھ سے چھڑا لیا " مَیں نے اپنے بچّوں کے باپ سے بھی یہ سختی نہ سہی۔ تم کون ہوتے ہو جاہل آدمی ؟"

" کون ہوتا ہوں مَیں ؟" مَیں نے ایک بھرپور ہاتھ یوں مارا کہ میری انگلیوں کے نشان اس کے گال پر نقوش کی طرح اُبھر آئے۔" اب تمھیں معلوم ہُوا کہ مَیں کون ہوں۔ مَیں ایک ہندوستانی آدمی ہُوں اور جسم کے ساتھ رُوح کا بھی خریدار ہوں، سمجھیں ! " اور ہانپتے ہوئے مَیں پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

وہ ٹائپ رائٹر پر سر رکھے دیر تک روتی رہی پھر ہولے ہولے اسکی سسکیاں بند ہوئیں، وہ اٹھ کر میرے قریب آئی اور کہنے لگی " مُرلی مجھے معاف کردو زیادتی میری تھی۔"

مَیں بیزار سا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور پھر باہر نکل گیا۔ میرے پیچھے وہ مجھے پکارتی رہی۔

بورڈ کے افسروں میں سے سب سے بوڑھے اور تجربہ کار آدمی نے مجھے

غور سے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ اُس دن مَیں نے نہایت بڑھیا ولایتی کپڑے کا سُوٹ پہنا تھا۔ میری ٹائی کی گرہ فیشن کے مطابق بندھی تھی۔ کوٹ کی آستینوں میں سے قمیض کے کف جو دکھائی دیتے تھے ان پر غیر ملکی کف لنکس تھے۔ مجھے اپنی لیاقت پر اعتماد تھا اور مَیں بہت یقین کے ساتھ کھڑا تھا۔ مَیں نے بالوں میں بسل کریم لگا کر انھیں یوں جمایا تھا کہ نہ تو مَیں ضرورت سے زیادہ فیشن پرست لگوں اور نہ ہی اپنے آپ سے بے نیاز۔ مَیں سیدھا کھڑا تھا اور میری گردن اکڑی ہوئی معلوم نہیں دیتی تھی۔ میری انگلیوں کے ناخن بہت

ڈھنگ سے مناسب کٹے ہوئے تھے اور میرے جوتے پالش سے چمک رہے تھے۔ میں نے سوٹ سے متضاد رنگ کے موزے پہن رکھے تھے۔ آج سوچتا ہوں تو لگتا ہے میں نے اپنے آپ کو تھیٹر میں جانے سے پہلے میک اپ کرنے والے مسخرے کی طرح مزین کیا تھا اور اپنے حالوں سول سروس کا ایک ہونے والا نہایت معزز افسر بن کر بورڈ کے سامنے حاضر ہوا تھا۔

"بیٹھ جائیے مسٹر مُرلی دھر۔" جائزہ لینے والے افسر نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم فارن سروس میں جانا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیوں؟" دوسرے افسر نے عینک ناک پر جھکا کر اس کے اُوپر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور میں نے اس کے جواب میں کتنی مضحکہ خیز باتیں کہی تھیں۔ یہ کہ آدمی باہر جا کر اپنا مشاہدہ اپنے ملک کے کام لا سکتا ہے۔ قوم کی خدمت کر سکتا ہے اور میرے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ تھا۔ میں قوم کے کام آنا چاہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

"تمھارے خیال میں قوم کو تمھاری خدمت کی ضرورت ہے مسٹر مُرلی دھر۔" انھوں نے پھر پوچھا۔

ان میں سے سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور میرا جواب سننے کے ساتھ ساتھ ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ پولیس رپورٹ تھی۔ کالج یونین کے سیکرٹری کے لحاظ سے میری زندگی اور میرے کارناموں کی فہرست تھی حکومت کے خلاف پاس کیے گئے ریزولیوشن اور میری طرف سے شروع کیے گئے ایجی ٹیشن سب اس میں حرف بہ حرف لکھے تھے۔ مجھے لگا یہ میرا اعمال نامہ ہو۔

"کیا اس میں کوئی غلطی ہے؟" اس بزرگ آدمی نے پھر میری طرف دیکھ

کر کہا۔

"نہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

"تمہارے والد مسٹر بھگوتی پرشاد بھی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزار گئے" دوسرے آدمی نے بڑے افسوس سے مجھے اطلاع دی۔

"جی ہاں" میں نے پھر کہا تھا۔

یہ پولیس رپورٹ بہت کانفی ڈینشل چیز ہوتی ہے مگر ہم نے آپ کو اس لیے دکھا دی ہے کہ اس ریکارڈ کی موجودگی میں آپ کو سول سروس میں نہیں لیا جا سکتا۔ ہم لوگوں کو ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کو اپنا ایمان جانیں ———— اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے حکومت کا ساتھ دیں۔ جو دل سے نہیں ذہن سے سوچیں جن کو خون میں وفاداری کا ورثہ ملا ہو۔ اس لیے مسٹر مرلی دھر آپ سول سروس کے لیے نہایت غیر موزوں آدمی ہیں آپ سمجھے! اگر آپ پسند کریں تو ہم آپ کو کسی اور کمتر درجہ کی غیر اہم سروس میں لینے کی سفارش کر سکتے ہیں اور وہ بھی اس وعدے پر کہ آپ آئندہ سے کسی غیر قانونی کام میں شرکت نہیں کریں گے اور دل و جان سے حکومت کے وفادار رہیں گے۔"

میں جانے کیوں خاموش ہو گیا۔ میں مارجری کے گال پر ابھرے اپنی انگلیوں کے نقوش دیکھ رہا تھا۔

"مسٹر مرلی دھر آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔" بزرگ آدمی نے پھر کہا دوسرے لوگ اپنے قلم اپنے سامنے رکھے شیشے کے چمکتے میز کی دوسری طرف ہمہ تن گوش میرے جواب کے منتظر تھے۔

"ایسی صورت میں جب میری وفاداری ہی قابلِ گرفت ہے اور میں قابلِ اعتبار نہیں۔ میں کسی سروس میں بھی جانا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے قطعیت سے

کہہ دیا تھا۔ اس گھڑی میرے سامنے کچھ بھی نہ تھا اور نہ میرے پیچھے کچھ تھا۔ کوئی زور زور سے مجھ سے کہہ رہا تھا: "تمھارے والد کا نام بھگوتی پرشاد ہے۔ میز پر پڑے پھولوں کے بڑے سے گلدستے پر کھلی کھڑکی سے ایک تتلی اندر آ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ سارے آدمی مجھے پتھر کے ایسے مجسمے لگ رہے تھے، جنھیں وہاں نمائش کی خاطر سجایا گیا ہو۔ پھر میں کرسی سے اٹھا اور بنا ان کی طرف دیکھے باہر نکل آیا اور دھوپ میں چمکتی سڑک پر بے خیالی میں جانے کس طرف چلتا گیا۔

"تمھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔" درختوں کے پتوں میں چھپے پرندے میرے گرد پکار رہے تھے۔

"تمھیں کوئی سہارا کبھی نہیں ملے گا۔" موٹروں کے ہارن میرے آگے پیچھے کہتے ہوئے گزر رہے تھے۔

"تمھیں کبھی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔" سڑک پر گونجنے والے قدموں کی چاپ کہتی تھی۔

میرا ماضی اپنی ساری حماقتوں اور ساری بے وقوفیوں کے ساتھ اس پولیس رپورٹ کے قید خانے میں بند تھا وہ کسی وقت بھی اسے لا کر میرے سامنے کھڑا کر سکتے تھے۔ مجھے خون میں کیا ملا تھا؟ خون اور ورثہ اور ماضی ان لفظوں میں کوئی روشنی نہ تھی۔ میری پر امید شاعری میرے خوابوں کے تانے بانے میں پرانے رنگ سے شکست کھا گئی۔

جب دوپہر ڈھلی ہے اور سورج جمنا کے پانیوں میں ڈوبا ہے تو میں نے اپنے آپ پر نظر کی۔ میرے بوٹ مٹی کے رنگ کے دو ٹاٹ کے ٹکڑے تھے جنھیں میں نے پاؤں پر لپیٹ رکھا تھا میرے منہ میں گرد کا مزہ تھا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور تھکن سے ہانپ گرنے والا تھا۔ سول سروس کا ایک ذمہ دار افسر جانے کب سے لمبی سڑک پر گھسٹتا ہوا لہولہان ہو کر دم توڑ چکا تھا۔

"بھگوتی پرشاد کا بیٹا ہونا کتنا بڑا جرم ہے۔"

اس رات مارجری نے نہایت آہستگی سے کہا "ڈارلنگ لوسی اور پپا آ رہے ہیں، کیا تم میرے ساتھ بمبئی چلو گے ؟"

"اچھا۔" میں نے معمول کی طرح جواب دیا "جو تم کہو گی وہی ہو گا۔"

اور جب جنس کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھا جا چکا تو انھوں نے سوال کیا "تم نے اب تک کیا سیکھا ہے۔" پھر پوربی ہوا ان کے جسموں کے ٹکڑے اٹھا کر لے گئی اور بادل خالی زمین پر برسا کیے۔

"مما کتنی عجیب بات لکھی ہے۔" شرلے نے ٹائم کا پرچہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر اس کونے کی طرف دیکھا جہاں میں اور مارجری اور پپا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔

"کیا لکھا ہے۔" مارجری نے بے دھیانی سے کہا۔

لوسی نے وہ جملے پڑھ کر سنائے اور کہنے لگی "یہ کسی نئی بائبل میں سے لیے گئے ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "آج کل نئے پیغمبر پیدا ہو رہے ہیں اور ان کی اپنی نئی کتابیں ہیں۔"

شرلے نے پرچہ دیں پٹخا اور غصے سے میری طرف دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"پپا سمجھ میں نہیں آتا میری غیر حاضری میں اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔" مارجری نے بڑی فکر مندی سے پوچھا۔

"تم اس کے لیے فکر مند نہ ہو مارجری۔ بڑھنے کی ایک سٹیج ایسی آتی ہے جب بچے اپنے وجود کے علاوہ ماں باپ کے وجود سے بھی متنفر ہو جاتے ہیں۔"

پپا نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

"مگر پپا، شرلے سولہ سال کی ہو گئی ہے۔ اس عمر میں لڑکیاں کئی محبتیں کر چکتی ہیں اور یہ ابھی تک اپنے وجود کو ہی سوال بناتے جاتے گی" مارجری نے کھیل چھوڑ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ پپا نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرا، پھر اُن پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے پانی کا گلاس لا کر انھیں دیا اور باہر کھڑکی سے نظر آنے والے سمندر کو دیکھنے لگا۔ میں بھی تو اس سٹیج سے ابھی آگے نہیں بڑھا جب وجود سے نفرت ختم ہو جائے گی۔

اس شام مارجری نے کہا "مرلی! میں اپنی ایک پرانی دوست کے ہاں شام کے کھانے پر جا رہی ہوں تم اپنے ہوٹل جانے سے پہلے ذرا شرلے کو گھما نہ لاؤ گے؟"

میں نے اپنی بند آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ٹیپ ریکارڈر پر فورتھ سمفنی سنتے ہوئے میں جانے بادلوں اور آکاش کے کون سے حصے پر تھا۔

"مگر تمھیں معلوم ہے وہ میرے ساتھ جانا تو ایک طرف، بولنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"تو کیا ہوا کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اس سے پوچھ تو دیکھنا۔" مارجری نے ڈریسنگ روم میں جاتے ہوئے کہا۔

میں کھلے دروازے میں سے اس کے متناسب اعضا کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی بلکاؤ گھوڑی ہو۔ چمکتا ہوا بے شکن جسم، جلد کے اندر گرم لہو کی روانی اور بے داغ کھال، چہرے پر نرمی اور کھلاوٹ جیسے کوئی خوبصورت آواز مجسم ہو جائے اور پھر ہندوستان کی روایتی عورت کی سی بے چارگی اور چپکے سے برداشت کر لینے کی قوت۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی "بہت شریر ہو۔ کیسے گھور کر دیکھ رہے ہو، اٹھو تم بھی ذرا درست ہو جاؤ۔ میں تو اب ایک دو لمحوں میں چلی آؤں گی تم اور شرلے گھوم آؤ۔ تم جوان آدمی ہو، تقریباً میرے

بچوں کے ہم عمر۔" وہ خوشبو چھڑکتے ہوئے میری طرف آئی اور مجھ پر بھرپور منظر
ڈال کر بولی "میں غلط تو نہیں کہہ رہی۔"

میں نے ٹیپ ریکارڈر چھوڑ دیا اور کھڑکی میں آبیٹھا۔

مارجری نے جاتے ہوئے اپنی انگلیاں چوم کر میری طرف اشارہ کیا اور
تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئی۔

پیپا نے کہا وہ سمندر کی سیلی ہوا برداشت نہیں کر سکتے اس لیے میں اُن کے
کمرے کی بالکنی پر کھلنے والی کھڑکی بند کر دی اور انہیں بتی جلادی۔ بیٹھنے کے کمرے
میں اندھیرا تھا۔ میں خالی الذہن سا کھڑکی کے سامنے سمندر پر سے آنے والی بھیگی
ہوا کی خنکی اپنے چہرے پر محسوس کرتا رہا۔

پھر کمرے کی بتی جلی اور شرلے اندر آئی۔ "اوہ!" اس کے منہ سے بے اختیار
نکلا۔ وہ بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جانے لگی ہے تو میں نے کہا "میرے ساتھ چلو گی۔"

"نہیں!" اس نے کہا اور تیزی سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔

"کوئی اور وقت ہوتا تو مجھے بُرا لگتا مگر شرلے کا جواب مجھے بُرا نہیں لگا۔
میں نے اُٹھ کر بتی بجھادی اور اپنے حالوں مارجری کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد دروازہ بڑے زور سے کھلا۔ بتی پھر جلی اور وہ اندر
آئی۔

میں نے کہا "تم تیار ہو گئی ہو؟" اس نے ایک بہت خوبصورت سکرٹ
پہن رکھا تھا اور بلاؤز کسی پھولدار کپڑے کا تھا۔

"مگر میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہی ہوں۔"

"آخر تم مجھ سے اتنی متنفر کیوں ہو؟" ـــــ وہ مجھے روٹھے ہوئے بچے کی
طرح لگ رہی تھی۔

"مجھ پر آج اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"تمھیں مجھے باہر لے جانے کی فرصت کہاں سے مل گئی؟"

میں نے کہا "چلو آؤ چلیں۔ سمندر کے کنارے گھومیں گے۔ تم تازہ ہوا میں سانس لو گی میں تمھیں یہاں کی کہانیاں سناؤں گا۔"

"چلو ——" اس نے اُسی غصے سے کہا "مگر میں تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

ہم دونوں چپ چاپ سمندر کے کنارے گھومتے رہے بہت دیر بعد جب ستاروں کا عکس پانی میں پڑنے لگا اور لہروں کی گرج بڑھ گئی تو میں نے گیس کی روشنی میں ایک ٹی سٹال سے اسے چائے پلائی۔

اس نے کہا "مما انتظار کر رہی ہوں گی۔"

میں نے کہا "تو ہمارا کیا جاتا ہے۔"

کہنے لگی "تمھیں مما کے غصے سے ڈر نہیں لگتا۔"

"مگر وہ غصہ ور عورت تو نہیں ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں —— غصہ ور نہیں ہے —— مما غصہ ور نہیں ہے؟ تم مما کو کیا جانتے ہو ——"

میں نے کہا "مگر میں نے اسے کسی وقت بھی غصے میں نہیں دیکھا۔ وہ تو بڑی جلد ہار مان لینے والی ہے۔"

"تم نے مما کو یہی جانا ہے مُرلی مسٹر۔" اس نے بڑے پن کا رُعب سا اپنی شکل پر طاری کر کے کہا۔

"اب مجھے تو اتنے مہینوں میں یہی پتہ چلا ہے شریے۔" میں نے اپنی ہار مان لی۔

"سنو —— مما نے ہم سب کی زندگیاں جہنم بنا رکھی ہیں۔ وہ اپنی مرضی سب پر ٹھونسنے اور دوسرے کی انفرادیت کو ہڑپ کر جانے والی بے رحم عورت ہے۔ اس نے میرے باپ سے محض اس لیے طلاق لے لی کہ وہ اس کی بے راہروی کو

تمھاری کوئی کہانی اگر ساتھ ہو تو مجھے پڑھنے کے لیے دو دینا۔" میں نے اس کا دماغ کسی اور طرف لگانے کی کوشش کی۔

وہ اپنا کافی غصہ نکال چکی تھی۔ اس لیے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہنے لگی "آرٹسٹوں کو میری کہانیاں کبھی اچھی نہیں لگ سکتیں۔ تم انھیں پسند نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "تم ہر بات شروع سے فرض کر لینے کی عادی جان پڑتی ہو۔ اگر میں پڑھوں اور ایمانداری سے اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار کروں تب تو کوئی بات ہوتی۔"

کہنے لگی "میں تمھیں اپنی کہانیاں پڑھنے کو دوں گی مگر شرط یہ ہے کہ تم ممّا سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "تم اپنے علاوہ سب کو جہنمی کیوں سمجھتی ہو۔ میں ایک مرد کا قول تمھیں دیتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی تو نیم تاریکی میں اس کے دانت موتیوں کی لڑیوں کی طرح چمک اٹھے۔

پھر ہم دونوں راستے کے ایک سستے مگر نسبتاً خاموش ریستوران میں گئے وہاں نہ آرکسٹرا تھا نہ زیادہ چہل پہل تھی مگر کھانا اچھا اور صاف تھا۔ وہ روشنی کے رُخ بیٹھی تھی اور میری پیٹھ اس کی طرف تھی۔ میں نیم وا آنکھوں سے کرسی کی پشت پر ٹیک لگاتے اسے کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں اور بڑی بڑی جھیلوں کی طرح تھیں۔ ناک میڈونا کی سی تھی مگر ہونٹ ذرا بھرے بھرے اور اس کے لیے بڑے معلوم دیتے تھے۔ وہ ایک بھوکے بچے کے سے انہماک اور شوق سے کھا رہی تھی اور اپنی پتلی انگلیوں سے کبھی کبھار چہرے پر آنے والی لٹ کو پیچھے دھکیل دیتی تھی۔ گھرے سیاہ بالوں کا ایک جنگل تھا۔ پہلی نظر میں ایک عام مغربی لڑکی لگتی تھی مگر اس کی روح کا طنطنہ اور اس کے دل کا اضطراب معاشرے کی ساری گندگیوں

کے خلاف چل رہا تھا۔ وہ ایک باغی لڑکی تھی اور اس لیے عزم اس کی پیشانی سے ظاہر تھا گہری اور کچھ سوچتی ہوئی آنکھیں۔

کہنے لگی "تم خود کیوں نہیں کھا رہے ؟"

میں نے کہا۔ "میں ایک شفیق باپ کی طرح تمہیں کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں ۔"

"ہشت ۔" اس نے لٹ کو پیچھے دھکیلتے اور پلیٹ پر جھک کر نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تم زیادہ سے زیادہ میرے بڑے بھائی ہو سکتے ہو۔ میں تم کو اتنا بڑا درجہ نہیں دے سکتی ۔"

جب کھانا ختم کر کے اور بل چکا کر ہم باہر نکلے ہیں تو مجھے کہنے لگی ۔ "ہم گھر سے بھاگے ہوئے دو بچوں کی طرح ہیں ، واپس جائیں گے تو مما ضرور ڈانٹیں گی تم دیکھ لینا ۔"

میں نے کہا "میں تو بھاگا ہوا ہوں ہی مگر تم ۔"

کہنے لگی "دیکھ لینا کسی دن میں دل میں فیصلہ کر کے گھر سے چل دوں گی۔ میں بہت دنوں مما کے ساتھ نہیں رہ سکتی ۔"

"مگر بھاگ کر جاؤ گی کہاں دنیا تو سب جگہ ایک طرح کی ہے اور نئے دیوتا تو زمین پر نہیں اتر رہے ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اپنی مرضی ہے کہ کوئی دیوتا بنا ڈالے ۔" اس نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

ایک سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کہا "یہ آخری شو دیکھو گی ؟"

پہلے تو اس نے خاموش کھڑے ہو کر چند لمحوں کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کہنے لگی "چلو جہاں اتنی دیر ہوئی ہے اور سہی ۔" اور ہم سینما میں گھس گئے۔

کوئی جاپانی یا ملائی کہانی تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ آنکھیں کھولے غور سے سکرین کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہونے لگیں۔

اس کا سر پہلے سیٹ سے لگا تھا پھر اس نے سر کو میرے کندھے پر لڑھکا دیا اور سو گئی۔ آج بھی اس کندھے پر جہاں اس کا سر تھا۔ میں اس کے جوان سانس کی خوشبو محسوس کر سکتا ہوں۔ اور میں نے دل ہی دل میں پرارتھنا کی تھی کہ اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگے۔ دنیا اس کی معصومیت اور اس کے نظریوں سے جنگ نہ کرے۔ دنیا اسے دھوکا نہ دے۔

واپس پہنچے تو سڑکیں سوئی سوئی تھیں اور بتیاں آرام کرتی جان پڑتی تھیں۔ مارجری کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور نشے سے بوجھل سی تھیں۔ اس کا اضطراب اس کے غصے سے ظاہر تھا۔ کہنے لگی "تم دونوں اتنی دیر کہاں رہے؟"

میں نے کہا "کوئی اتنی خاص دیر تو نہیں ہوئی۔"

یہ چیخ کر بولی "یہ دیر ہی نہیں؟ پتہ ہے تمھیں رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے" شرلے نے نیند سے جاگتے ہوتے کہا "مگر ممّا اس میں چیخنے کی کیا بات ہے۔ تمھاری پارٹیوں سے آرٹسٹ بھی تو دیر سے ہی لوٹتے ہیں۔"

مارجری نے میرا بازو پکڑ کر کہا "تم دونوں شراب پیتے رہے ہو کیا؟"

میں نے کہا "ہوش کی دوا لو مارجری، ہم کہاں پی سکتے ہیں؟ تم نے ہی تو کہا تھا کہ میں اسے گھما لاؤں۔"

"ممّا مجھے تمھاری یہ سکیم بازی پسند نہیں ہے۔ میں اتنی کمینی نہیں ہوں کہ تمھارے عاشقوں کو سمیٹتی پھروں۔ مجھے مرلی کے ساتھ باہر جانا قطعاً پسند نہیں" اس نے سیڑھیوں کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

"آج کی نسبتاً خوش گوار شام کا یہ انجام مجھے بالکل پسند نہیں"۔ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھایا۔

"مرلی! کیا تم میری مجبوریوں کو نہیں جان سکتے؟ میں شرلے کے لیے نہیں تمھارے لیے فکر مند تھی۔ وہ لڑکی نہیں آگ ہے اور جو اس کے منہ میں آئے کہہ جاتی ہے اور پھر جب میں تم کو نہیں دیکھتی تو میری رگوں میں خون پانی بن جاتا ہے مجھے

اپنے وجود سے، اپنے آپ سے، ہر اس شئے سے نفرت ہونے لگتی ہے جو تم کو مجھ سے دُور رکھے۔" اس نے مجھے اپنی طرف گھسیٹا۔

مگر میں "چیریو" کہتے ہوئے تیزی سے نیچے اتر گیا اور پھر ہوٹل کی طرف نہیں لمبی سڑک سے سمندر کی طرف چلنے لگا۔

مجھے چنڈی، رومی، جھگونتم، رمیش اور کافی ہاؤس کا سارا گروہ جانے کیوں یاد آرہا تھا؟

جب بھی میں نے رات جاگ کر گزاری ہے، جب کبھی میری روح مضطرب ہوئی ہے اور تنہائی نے، بے چارگی کے احساس نے مجھے پریشان کیا ہے، مجھے وہ لوگ یاد آئے ہیں۔ جانے آج وہ سب کہاں ہوں گے؟ کون کیا کرتا ہوگا؟ کس نے کس سے صلح کر لی ہوگی۔ زندگی کی بساط پر ہم سارے پٹے ہوئے مہرے تھے جو الگ الگ اپنے وجود کی اہمیت کو دوسروں پر ثابت کرنے کے لیے زور لگاتے اور جیتے تھے۔

دو یا شاید تین دن بعد جب میں دہلی واپس جانے کے لیے جہاز میں اپنی سیٹ بک کروا چکا تھا مارجری کا فون آیا۔ مجھے یاد ہے میں نے بہت ہی بے نیازی اور لاتعلقی سے کہا تھا "کیا بات ہو گئی ہے، کس لیے یاد کیا ہے؟"

دُوسرے سرے پر رونے اور سسکیوں کے درمیان آواز آئی "مرلی! میں نے کئی دفعہ تمھارے ہوٹل رنگ کیا ہے۔ تم جانے کہاں تھے۔ تم میری طبیعت تو جانتے ہو پھر سزا کیوں دے رہے ہو؟"

"میں نے تم سے کسی شئے کا سودا نہیں کیا تھا۔ یہ ایک اَن لکھا معاہدہ تھا۔ تم میری آزادی میں مُخل ہوتی ہو، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

کہنے لگی "مرلی! تم دل کی مجبوریاں کیوں نہیں سمجھتے ہو؟ ان لکھی باتیں کبھی کبھی لکھنے سے بڑھ کر اہم ہوتی ہیں۔"

"ہوں گی، میرے لیے نہیں۔ میں تم سے اپنی آزادی حاصل کرنا چاہتا

ہوں" میں نے آخری فیصلہ کرنے والے کی طرح کہا۔

"سنو" مارجری کی آواز آئی "میں تمھیں باندھ کر نہیں رکھنا چاہتی اور اس لیے آج شام تک اگر تمھیں وقت ہو تو آؤ۔ کیونکہ شام کے بعد میں اور پپا امریکی قونصل کی پارٹی میں جا رہے ہیں۔ شام سے پہلے اگر تم مل لیتے تو میں تمھیں بہت سی ایسی باتیں کہوں گی جو فون پر نہیں کہی جا سکتیں"

شام کے بعد جب شرلے اکیلی تھی اور میں سارا دن سڑکوں پر گھومنے سے تھک چکا تھا، میں وہاں گیا تھا۔ شرلے نے کہا "آج بھی مما نے کہا ہوگا کہ شام میرے ساتھ گزارو"

میں جواب دیے بنا اندر چلا گیا۔ نشست کے کمرے میں کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ کھڑکیاں کھول کر میں نے بتی جلائی اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ شرلے دروازے میں دہلیز کے اُس پار کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر میری طرف آئی۔ اخبار چھین کر ایک طرف رکھا اور کہنے لگی "میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں نے جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے کہا "تم دونوں ماں بیٹیاں صبر آزما حد تک ضدی ہو"

کہنے لگی "اگر میں ضدی ہوں تو کیا میں تم سے مما کے حکم کے تحت بات نہیں کر سکتی۔ تم یہاں سے چلے جاؤ"

میں نے کہا "میں کسی کے حکم کا بندھا نہیں ہوں۔ میں تم کو الوداع کہنے آیا ہوں۔ تم دوسرے کے خیالات کو جھنجھوڑتی ہو اور سلانے والے کی جگہ جگانے والے مجھے پسند ہیں"

کہنے لگی "اتنے بودے تھے کہ پہلے پہلے کو نہ سمجھ سکے۔ مما سے تمھاری کافی پرانی آشنائی ہے اور اب انھیں کیوں چھوڑ رہے ہو؟ میں جھوٹی چیزیں کھانے کی عادی نہیں"

"بکومت"۔ مَیں نے مُڑ کر زور سے اسے ڈانٹا "مَیں تمھاری جھولی میں نہیں گر رہا۔ غیر ملکی عورتوں میں سے یوں بھی مجھے کچّے گوشت کی بُو آتی ہے۔"

"اوہ"۔ اس نے طنز سے ہنس کر کہا "تم لوگوں کی یہ ہمت۔ اور کتنی صدیوں سے اس کچّے گوشت پر پل رہے ہو۔ تم پر تو سدا غیر ملکیوں نے حکومت کی ہے۔ تم لوگوں نے کبھی اس کے اور کبھی اس کے پاؤں تلے کی خاک چاٹی ہے تم لوگ ہماری برتری سے اتنے خائف ہو جاتے ہو، ہماری چمڑی سے ہمارے طریقوں سے۔"

مَیں نے کہا "دوستی کا ہاتھ تمھاری ماں نے میری طرف بڑھایا تھا۔"

"بھولے کیوں بنتے ہو۔ جس طرح تمھیں کچّے گوشت سے نفرت ہونے کے باوجود ممّا پسند ہے، اسی طرح ممّا کو بھی تمھارے سیاہ رنگ اور گندے دانتوں کے باوجود گرم جسم کی باس پسند ہے۔" وہ ہنسی۔ "تمھارا کیا خیال ہے کہ ممّا تمھارے ذہن، تمھاری باتوں اور تمھارے کلچر سے مرعُوب ہوتی ہوگی؟ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں جس طرح اس کتاب میں لکھے حروف کو۔ تم بے آسرا سے نوجوان تھے تمھارا اپنا کوئی بندھن نہ تھا۔ تمھیں اپنے ملک والوں سے نفرت تھی۔ تم اپنے لوگوں میں سو طرح کے کیڑے نکالتے تھے اور تم بے تُکی، بے معنی نظمیں لکھتے تھے۔"

مجھے لگا کہ شرلے سچ کہہ رہی تھی۔ مجھے اپنی کسی شے سے بھی تو محبت نہ تھی۔ میری ذہنی جنت سول سروس کا وہ امتحان تھا جس کے ذریعے میں ملک سے باہر جا سکتا۔ کالج میں رہتے ہوتے مَیں نے جو کچھ کیا، وہ بھی ایک وقتی جذبہ اور ایک ذہنی لہر تھی۔ جانے مَیں نے آج تک کیا کیا تھا؟ مگر ان ساری شکستوں کے اعتراف کا یہ وقت نہ تھا۔

شرلے نے پھر کہا "اور تم پر ہی کیا بس ہے تمھارے ملک کا ایک ایک آدمی اداس اور غیر مطمئن ہے۔ مَیں نے آج تک جن لوگوں سے بات کی ہے کسی کو بھی پُر یقین نہیں پایا۔ سوائے تمھارے اوپر کے افسروں کے اور بڑے عہدوں پر لگے لوگوں کے کوئی شخص بھی خوش نہیں ہے۔ بازاروں میں، گلیوں میں، ہوٹلوں میں،

گلیوں میں ہر کسی کو میں نے روتے پایا ہے۔

میں نے کہا "تمہارے ہاں کسی کو شکایت نہیں؟ تم تو اپنی ماں سے بھی بیزار ہو۔ تم اس معاشرے کو ہی کرم خوردہ اور گھناؤنا کہتی ہو، تم کون سا خوش ہو؟"

"مگر میں اس کا ڈھونگ نہیں رچاتی۔ میں ہر روز تازہ دیوتا تو نہیں گھڑتی۔ میں اپنے اندر اور باہر ایک ہوں۔" اس نے بڑے غرور سے کہا۔

"ہم لوگ بھی تم سے نجات حاصل کر لیں گے۔ ہولے ہولے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔" گو مجھے دل سے اس بات کا یقین نہ تھا۔

"تم لوگ ذہنی طور پر غلام ہو۔ آزاد ہونا ہوتا تو آزادی کے بعد سے اب تک ہو گئے ہوتے۔ اتنے سال تیرے میرے دروازے سے بھیک مانگتے تمہیں گزر گئے ہیں۔" وہ لڑنے پر تیار تھی۔

"قومیں اپنے نظریوں کے سہارے زندہ رہتی ہیں گو ان کی پالیسیاں وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔" میں اپنے آپ کو بھگوتی پرشاد رائے کا بیٹا سمجھ رہا تھا "اُدھار مانگنا، ہاتھ پھیلانا، بھیک مانگنا کسی ملک کی پالیسی نہیں ہو سکتی۔" وہ کرسی پر جھکی بیٹھی جانے اپنے پاؤں میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

"مگر شرلے، تم لڑ کیوں رہی ہو؟" میں نے اس سے سیدھا سوال کیا۔

"خدا کی قسم یہ لڑنا ہے کیا؟ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم روز روز کی اس بے عزتی سے بچ کر اپنے اندر سے باہر آؤ۔" اس نے بڑی نرمی سے میری طرف دیکھا۔

"مگر تمہیں مجھ سے یکایک یہ ہمدردی کیوں ہو گئی ہے؟ تمہاری ماں نے آج تک کبھی مجھ سے سیاست پر گفتگو نہیں کی۔ بھلا زخمی کو یہ بتانا کہ تمہارے یہ زخم ہے اور یہ ہے اس سے کیا بنے گا؟" میں نے بہت جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے یہ باتیں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ممّا یہ باتیں کبھی نہ کہتی۔ اسے تو اُس کی گورنمنٹ کی طرف سے ہدایات ہیں اور مجھے تو ہر طرح کی آزادی ہے۔" شرلے نے اٹھ کر بتی بجھادی۔

"تمہیں اندھیرا کیوں پسند ہے؟" مَیں نے باہر سڑک پر کی روشنیوں کی طرف دیکھا۔

"ہم سبھی اندھیرے میں ہیں مُرلی ڈیئر۔ اور روشنی کی وجہ سے ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ہم کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔" شرلے کی آواز مجھے بہت دُور سے آتی سنائی دی۔

مَیں نے کہا "اندھیرا اور روشنی بس پالیسی ہی ہے ورنہ تم لوگوں کو ویت نام میں اپنی حالت کا پتہ نہ چلے!"

اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "چلو تم ویت نام کو اور مَیں تمہارے ہاں کی بھوک دونوں کو یہاں چھوڑتے ہیں۔ آؤ آج پھر اُس طرح سمندر کے کنارے گھومیں اور آخری شو دیکھیں۔ مجھے وہ رات بڑی اچھی لگی تھی اور اگر مما بیچ میں بول کر میرا موڈ خراب نہ کر دیتی تو میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ میرا جی چاہا کرتا ہے مُرلی کہ میں ساحلوں پر یونہی گھومتی رہوں اور راتوں کو جہاں جی چاہے سو جاؤں۔ میں ساری قیدوں اور سارے بندھنوں سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔"

اُس رات جب ہم لوٹے ہیں تو مارجری بالکنی میں کھڑی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور رات کے لباس میں اس کا بدن شدتِ جذبات سے کانپتا لگتا تھا۔

شرلے نے کہا "مما! مُرلی بہت ہی اچھا دوست ہے اور مجھے اس کے ساتھ گھوم کر بہت مزہ آیا ہے۔" پھر وہ سیڑھیوں پر ہی جھکی اور میری پیشانی چوم کر اندر بھاگ گئی۔

مارجری اور مَیں دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور چُپ تھے۔ مَیں نے کہا "مَیں صبح کے جہاز سے واپس جا رہا ہوں۔"

اس نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

مَیں نے کہا "شام کو ضروری کاموں کی وجہ سے وقت پر نہیں آ سکا اور جب آیا ہوں تو تم لوگ جا چکے تھے۔

کہنے لگی "مُرلی! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔ اب ہم دہلی میں ہی ملیں گے۔"

"اندر نہیں آؤ گے مُرلی؟" اس کی آواز میں منت تھی۔

"کیا کروں گا؟ اب تم آرام کرو۔" میں جانے کے لیے مُڑا۔

"ہم رائیشورم سے ہوتے ہوئے کوئی پندرہ دن میں دہلی پہنچیں گے۔ میں تمھیں لکھ دوں گی۔ اگر تمھیں پسند ہو تو میں تمھارے لیے اپنے ساتھ چلنے کا بندوبست کروں؟" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مگر میں تو صبح جا رہا ہوں پہلے جہاز سے۔" اس کا ہاتھ میرے کندھے پر کانپ رہا تھا۔

"نہیں میں امریکہ کی بات کر رہی ہوں۔" وہ میرے اور قریب ہو گئی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا مارجی۔ میرا مقدر یہیں کا ہے۔ ہم اسی مٹی کے ہیں اور باہر جا کر گھوم پھر کر کچھ سیکھ نہیں سکتے کیا فائدہ۔" میں ایک سیڑھی اور نیچے اُتر آیا" اور پھر یہ وقت ان باتوں کے کہنے کا نہیں۔"

"جیسی تمھاری مرضی۔" اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کرنے والے کی طرح اس نے جواب دیا۔

پھر میں نیچے اُتر آیا اور جب میں نے جاتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا ہے تو وہ بدستور بالکنی میں جھکی کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر شرے کے کمرے کی کھڑکی کھلی اور اس نے سفید رومال ہلایا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ جانے اس کے جی میں کیا تھا۔ اس کی باتیں مجھے یاد آ رہی تھیں اور اس رات میں اپنے آپ کو نہایت بے آسرا اور دنیا کا تنہا ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ ایک آنسو ٹپ سے میرے ہاتھ پر گرا اور سڑک کی روشنیوں میں ہیرے کی طرح دمکتا رہا۔ اور یہ آنسو کس کی بے چارگی پر ٹپکے تھے؟

مارجری کے رائیٹ شورم سے اُٹھنے سے پہلے ہیں کسی نہ کسی جگہ اپنے آپ کو مصروف کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے نجی رسالوں سے لے کر پرائیویٹ فرموں تک میں انٹرویو دیئے۔ یہ دن انتہائی گرم اور بے حد دل دہلانے والے تھے۔ مجھے اپنی اہمیت اور زندگی میں اپنی پوزیشن کا صحیح تجربہ اَب ہوا تھا۔ جب تلاش کے لیے نکلو تو پتہ چلتا ہے کہ تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو۔ میں نے اپنے ملک کا اندرونِ خانہ حال تو اب دیکھا تھا۔ ہر جگہ نوکر شاہی تھی۔ دفتروں کے اصل مالک تو چپراسی تھے۔ افسر اپنے آپ کو بھگوان نہیں تو اَن داتا ضرور سمجھتے تھے۔ غلامی میں ہمیں کسی خاص جگہ کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر مجھے بابا کے لفظ یاد آتے تھے "بیٹا نوکری سے بڑھ کر لعنت کوئی نہیں۔" اور اب مجھے پتہ چلتا تھا کہ میں اس لعنت میں گرفتار ہونے کے لیے کیسے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ دفتروں کے سامنے بیٹھے باریابی کے انتظار میں گھنٹوں بیت جاتے۔ بعض دفعہ دنوں ملاقات کی کوئی صورت نہ نکلتی۔ سرکاری دفتروں میں اس سے بھی بُری حالت تھی کیونکہ وہاں پر افسر اپنے محکمے کے نچلے افسروں کے ذریعہ رشوت وصول کرتے تھے۔ چھوٹی سے لے کر بڑی جگہ تک کے بندھے ہوئے ریٹ تھے اور جہاں چپراسی کی آسامی کے لیے پانچسو روپیہ مقرر ہو وہاں اچھی جگہ کے لیے کیا حال ہوگا؟ بدانتظامی اور تساہل عام تھا اور عہدے صرف روپیہ بنانے کے ٹکسال تھے۔ صحیح معنوں میں طوائف الملوکی تھی عوام کی آواز تک نہ تھی۔ اخبار، پیسہ لے کر سدا سے پارٹیوں کی حمایت کرتے آئے ہیں مگر اب تو عجب عالم تھا آج ایک بات پڑھ رہے ہو تو کل اس کے بالکل خلاف دوسری بات پڑھ سکتے ہو۔ اغوا، قتل اور جرائم عام تھے۔ قتل کر کے لوگ چھوٹ جاتے تھے۔ بڑے ذمہ دار عدالتوں کے جج بھی ضمیر فروش تھے تو رشوت لے کر فیصلے دیتے تھے۔ میں دل ہی دل میں اپنے اس فیصلے پر نادم تھا کاش میں نے سول سروس کی کسی کمتر درجہ کی ملازمت قبول کر لی ہوتی تو کم از کم اس سارے جہنمی طریقہ میں کہیں تو تبدیلی کر سکتا۔ اپنے رویئے سے دوسروں کے لیے مثال بنتا مگر اب

سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنے سے کیا بن سکتا تھا۔

ان دِنوں کے مشاہدے نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہی نہیں ہٹائے مجھے لگا میری کھال اُدھڑ گئی ہے۔ میں جہاں پر جاتا لوگوں کو سرگوشیوں میں شکایت کرتے سنتا۔ ہر محکوم اپنے حاکم کی شکایت کرتا تھا۔ لوگ لاوارث لگتے تھے اور بے بس تھے۔

بابا نے کہا تھا" بیٹے دنیا کے ساتھ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر تم آنکھیں کھول کر چلو تو ٹھوکر کھاتے ہو۔"

اس دن پاربتی بھی اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لیے میرے پاس بیٹھی تھی۔ اور بابا بچے کا ہاتھ پکڑے اس کی انگلیوں سے کھیل رہے تھے۔ بچہ دوسرے ہاتھ سے اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاربتی

پاربتی نے کہا تھا۔" بابا یہ دیکھیں کتنا شریر ہے ہاتھ چھڑا رہا ہے۔"

بابا نے کہا" بیٹی! دُنیا کا ہر آدمی اس کش مکش میں ساری عمر گنوا دیتا ہے کہ وہ کیسے آزاد ہو۔"

میں نے کہا تھا" پر بابا، آنکھیں بند کر کے چلنے سے بھی تو ٹھوکر لگتی ہے۔"

بابا نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا" نہیں اس میں بہت آسانیاں ہیں۔"

انھوں نے ٹھیک کہا تھا۔ دفتروں کے چکر لگاتے اور لوگوں میں مل کر پھرتے میں نے محسوس کیا کہ کھلی آنکھیں سب سے زیادہ مصیبت ہیں آدمی اندھا اور بہرہ ہو تو بہتر ہے۔

انھی دنوں میں ایک دوپہر تھکن اور ذہنی شکست خوردگی سے نڈھال ہو کر پریشان سا کافی ہاؤس میں گھسا تھا تو میں نے سوچا کہ ایسے میں شاید وہ ہجوم غفیر نہ ہو۔ جانے کیوں میں نے سوچ لیا تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی کام کی تلاش میں اور مصروف ہے مگر دائیں بائیں سے قہقہے بلند ہوتے اور چنڈی داس کی آواز سب سے اوپر سنائی دی" آگئے کام دیتا۔"

"ارے نہیں، غلط کیوں کہتے ہو یہ تو بے چارے خود کام دیوتا کا شکار ہیں"
ردی نے زور سے کہا۔

پھر وہ سب کھڑے ہوگئے۔ کرسیوں، میزوں کو ہٹاتے، مایرج پاسٹ کرتے میرے سامنے سے گزرے۔ پنڈی نے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا "مستقل اُسی ایک جیب میں رہو گے کہ کہیں اور بھی جھانکو گے؟"

میں نے کہا "یار مذاق چھوڑو، بھول چوک آدمی سے ہو ہی جاتی ہے اور پھر دھکی۔"

جگو تم نے کہا "میں ایک مضمون "عشق اور مابعد" پر لکھ رہا ہوں۔ تمہارا ذکر کچھ ایسا بُرا نہیں رہے گا۔ میں اتنے دنوں یونہی اچھی مثال ڈھونڈنے کے لیے سرگرداں رہا"

جب وہ سب اپنی اپنی باتیں کہہ چکے تو میں نے کہا "میں تمھیں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے نظمیں لکھنے سے توبہ کرلی ہے اور آج کل کہیں نوکری کی تلاش میں ہوں۔"

"مگر تم تو سول سروس کا امتحان پاس کرکے بڑا افسر بن رہے تھے۔" ہمیشہ کے کم گو اور اپنے میں ڈوبے رہنے والے رلیش نے کہا۔

میں نے کہا "وہ مجھے ملک اور قوم کے لیے مفید اور قابلِ اعتبار آدمی نہیں سمجھتے۔"

"اور ہم نے سوچا تھا تم بڑے افسر بن جاؤ گے تو اپنی بھی عزت بڑھے گی کم از کم تمھارا چپراسی اور افسروں کے چپراسیوں کی طرح دروازے کے باہر ہمیں گھنٹوں منتظر نہیں رکھے گا۔" بہت افسوسناک لہجے میں سر ہلا ہلا کر مورتی نے کہا۔

"پر خیر، اب تم واپس آگئے ہو تو کافی ہاؤس تمھارا سواگت کرتا ہے" پنڈی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اور میں سوچتا تھا کہ تم بڑے افسر ہوگئے تو مجھے کسی نہ کسی محکمہ میں پھنسا دوگے تمھیں پتہ ہے میں بی۔ اے پاس ہوں۔" بلراج نے کہا۔

"ہائے، ہم سب کے خواب جو تمھارے ساتھ وابستہ تھے۔ ہم سب کی

تمنا میں جن کا تم نے خون کیا ہے۔ ہم تمہیں کبھی معاف نہ کریں گے۔" کسی کونے سے کوئی اور پکارا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ اگر یہ بڑا افسر ہو جاتا تو اس دوپہریا میں تھکا ہوا اور پریشان ہمارے درمیان نہ آ بیٹھتا۔ تمہیں معلوم ہے دوستو ادیب جب افسر بن جاتا ہے تو افسر ہی رہتا ہے، ادیب نہیں بن سکتا۔" روی نے ایک اہم فیصلہ کر دیا۔

میں نے کہا" مگر تم لوگ میری بات نہیں سنو گے؟ میں نے جو باتیں دیکھی ہیں وہ میں تمہیں سنانے آیا ہوں۔ تم آواز اٹھاؤ، نظمیں اور مضمون لکھو۔ تم لوگ قوم کا دماغ ہو۔"

"ہی ہی ہی۔ ہی۔" چنڈی کی گونج دار ہنسی بہت دیر تک نیچی چھت کے اس ریستوران میں سنائی دیتی رہی۔

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے چنڈی!" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" ہمارے گرد اتنا دکھ ہے، اتنی بے انصافی ہے، اتنا ظلم ہے کہ اگر قلم پکڑتے ہوئے ہم نے ان زیادتیوں کے چہرے سے نقاب نہ اٹھایا تو آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔"

"تمہاری خوش فہمی قابل تعریف ہے۔" مورتی نے کہا" تم نے اتنے دنوں میں باتیں کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔"

میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب سنجیدہ تھے اور اس لیے میری بات کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

"میرے لاڈلے تم آج تک کون سی کھوہ میں رہتے رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟" چنڈی نے کہا" تمہارا خیال ہے کہ میں نے اخبار اپنی خوشی سے چھوڑ دیا تھا؟"

میں نے کہا" میرا تو یہی خیال تھا اور تم نے کچھ بتایا بھی تو نہیں۔"

"میرے پیارے مجھے جلاوطن کر دیے جانے کی دھمکی ملی تھی۔ میں نے حکومت

کی چند پالیسیوں کے خلاف لکھا تھا اور تم جانو یہ موت سے پہلے یہ کافی ہاؤس نہیں چھوڑ سکتا۔ میری جڑیں اس فرش کے بہت نیچے اور بہت گہری ہیں "چنڈی نے میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتے ہوئے کہا۔

"ہم سارے ردی کے گدا ہیں ہم کیا لکھیں گے ؟" رمیش نے ہولے سے کہا۔

"آج اگر ہم سانس بھی لیں تو ہم کو جیل میں دفن کر دیا جائے اور ہم میں سے کسی کے پاس اتنا اثاثہ نہیں کہ ضمانت پر دوسرے کو چھڑوا سکے۔ میرے بھائی ہم سب قلاش اور بے روزگار شکست خوردہ اور بزخود غلط آدمی ہیں۔ اگر ہم بول سکتے تو بولتے مگر ہم گونگے ہیں" جگو تم نے ایک ہی سانس میں سب کہا۔

"دوسرے ملکوں کے لکھنے والے اتنے بے بس نہیں ہیں" میں نے بے چارگی سے بات کی۔

"تم ابھی تک مارجری کے چکر سے نہیں نکلے۔ میرے یار، آنکھیں بند کیے اور من میں اس سے لو لگائے گھومتے ہو تمہیں کیا پتہ کیا کچھ ہوتا ہے" روی نے ہولے سے کہا۔

"تو ہم کچھ نہیں کر سکتے" میں نے بے آس ہونے والے کی طرح سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔

"اگر کہو تو ہم ریزولیشن پاس کر دیتے ہیں" مورتی بولا۔

"نہیں ہم کچھ نہیں کریں گے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے ریزولیشن کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اگر کوئی کچھ کرے گا تو وہ انسداد بے رحمی حیوانات کا محکمہ کرے گا۔ ہم تو خوابوں میں رہنے والے مردہ وجود ہیں" چنڈی نے بڑے دکھ سے اپنی بات ختم کی۔

"میری بیوی بیمار ہے اور آج کل میکے میں ہے" مورتی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے یار بھائی ! دنیا میں آنکھ بند کر کے چلو، کان بند کر کے چلو، زبان

بند کر کے چلو تو کچھ دیر جی سکتے ہو۔" چنڈی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر اندھوں، گونگوں اور بہروں کا ریزولیشن کوئی حقیقت رکھ سکتا ہے تو ہم کرنے کو تیار ہیں۔ تم اتنے نراش کیوں لگتے ہو۔" ردی نے اپنی کرسی پرے کھسکالی۔

"اچھا پیارے بیرے! ہم سب کے لیے چائے لاؤ۔" چنڈی نے زور سے کہا "ہم سب اپنی موت کا ریزولیشن پاس کرتے ہیں اور تم سے بھی اس پر دستخط کروائیں گے۔"

بیرہ جو بہت دیر سے ہم سب کو سنجیدہ بیٹھے دیکھ رہا تھا زور زور سے ہنسنے لگا اور ہم سب بھی اس کے قہقہوں میں شریک ہو گئے۔

چنڈی نے کہا "چلو کسی سایہ دار جگہ چل کر بیٹھیں۔ میں نے بہت دنوں سے تم سے بات نہیں کی۔"

گرمی کے دن تھے اور تپتی ہوئی شامیں بھی سکون نہیں دے سکتی تھیں۔ سب لوگ سڑکوں پر نکل آتے اور فضا میں حبس کی سی کیفیت ہوتی آتنی گھٹن تھی اور پھر میرا دل یونہی اس قید خانے سے کہیں بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ چنڈی نے کہا "یہ سول سروس میں تمہاری ناکامی کی وجہ ہے کہ تم اپنے ہی ملک کو قید خانہ سمجھنے لگے ہو۔ اگر کہیں تم پاس ہو گئے ہوتے اور زندگی کے دل میں رس بس جاتے تو یہ سارے احساس جو اب تمہیں پیس رہے ہیں کچھ نہ کہتے۔ میری مانو تو چند دنوں کہیں چلے جاؤ۔ واپس آؤ گے تو یہ کیفیت تمہارا ساتھ چھوڑ دے گی۔"

میں نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "نہیں چنڈی یہ عارضی رنج نہیں یہ میری روح کی اداسی ہے۔"

چنڈی نے کہا "ہم ساری کی ساری قوم اُداسی اور رنج کا شکار ہیں۔ اصل میں اعلیٰ سطح کے علاوہ ہم جی کہاں رہے ہیں۔ ہم جی ہی نہیں سکتے۔ ایک طبقے کی زندگی اسی میں ہے کہ ہم زندہ نہ رہیں۔ کسی ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز نہ اٹھائیں مگر تبادلے انفرادی طور پر ہم اس کیفیت اور حالت کو بدلنے اور سدھارنے کے لیے کچھ نہیں

کرتے۔ ہم بھگوان کے اُس دوسرے ہاتھ کے منتظر ہیں جو اُن دیکھے ایک دن ہر ناانصافی، ظلم اور زیادتی کو چُن چُن کر زندگی کی گدڑی میں سے نکال دے گا اور ہمیں جھاڑ کر اسے پھر اوڑھا دے گا۔"

میں نے آنکھوں کے سامنے گدڑی کو لہراتے دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی۔

چنڈی نے کہا "ہنستے کیوں ہو؟ کیا یہی بات نہیں؟ مجھے بتاؤ تم نے اپنے طور پر سوائے رونے کے اور کیا کیا ہے۔ میں نے سوائے کیڑے نکالنے کے اور کیا کیا ہے؟"

تھوڑی دیر سوچ کر میں نے کہا "میرے خیال میں میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"اور میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔ مجھے چاہیے تھا وطن سے نکال دیا جاتا مگر اپنی بات پر اڑا رہتا۔" چنڈی نے ہولے سے کہا۔

"پھر ہم کیا کریں، کوئی لائحہ عمل کوئی طریق کار، کوئی راستہ آخر کیا ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا بھائی کچھ نہیں۔ ہماری سوچیں اس حد تک مفلوج اور ہمارے ذہن اتنے کرم خوردہ ہیں کہ ہم کچھ سوچ بھی نہیں سکتے۔" چنڈی نے گھاس کا ایک تنکا توڑ کر دانت تلے دبا لیا۔

"تم باتیں تو بہت کرتے تھے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مرلی دھر بابو، باتوں اور سوچ پر کسی کا پہرہ نہیں نا۔ میں تم سے باتیں کرتا ہوں تو دراصل میں یہ سب باتیں جی میں سوچ رہا ہوتا ہوں۔" چنڈی اٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔

سوکھی گھاس کے آوارہ تنکے اس کے کپڑوں میں چمٹ گئے تھے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پورب سے آندھی اٹھی۔ گرد آلود آسمان پر آندھی کے نقیب چیلیں اور کوّے خاموش اڑتے آتے تھے اور ذرّے سورج کی آخری کرنوں میں لہو رنگ اور چمکتے ہوئے سرخ غبار کی صورت لگ رہے تھے۔ پہلے بگولے نے ہم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آندھی میں کاغذ اور ردی چیزیں چھلکے اور سڑے ہوئے پتوں کا ایک جہان تھا اور تُند ہوا درختوں کے تنوں کو ہلا رہی تھی۔ ننگی اُجڑی ہوئی شاخیں سائیں سائیں کرکے زمین کی طرف جھکتی اور پھر بلند ہو رہی تھیں۔ بگولے ہمیں جکڑ رہے تھے اور ہلنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہیں بیٹھ گئے۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ لوگ ہمارے پاس سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بچے بالوں کو پکار رہے ہیں اور سیر کرنے والے شوقین مزاج لوگ پاس کی عمارتوں میں پناہ لینے جا رہے ہیں۔ یہ ایک طوفان تھا جو ہر شئے کو اپنے ساتھ برباد کرسکتا تھا۔ کاغذ ہمارے قریب سے اُڑ کر آتے۔ کئی چیزیں ہمارے ہاتھوں اور جسموں سے چھُو کر نکل گئیں۔ ہم آنکھوں کو گرد و غبار سے بچانے کی خاطر انھیں رُومالوں سے ڈھانپے تھے۔ ریت دانتوں کے نیچے کچ کچا رہی تھی اور ہم کوئی بات بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اس تیز آندھی میں گرمی کی جلن تھی اور تپش تھی جیسے ساری تپش اُڑ رہی ہو مجھے یاد آیا ماں کہا کرتی تھی آندھی میں بہت ڈراؤنی چیزیں ہوتی ہیں۔ جانے بھوتوں اور پریوں کا وجود ہے کہ نہیں؟

پرانی کہانیوں کے اڑن کھٹولے، بھان، دیو اور ہاتھوں پہ پہاڑوں کو اٹھا کر چلنے والے بندر سب مجھے یاد آتے۔ کیا ہو اگر کوئی دیو اس لمحے ہمیں اٹھا کر کہیں سے کہیں پھینک دے۔

تب بادل کی گرج سنائی دی اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہم سے چھُو گیا۔ گرد کا زور کم ہو گیا اور پہلی بُوند میرے ہاتھ پر پڑی۔ "بارش"۔ میں نے زور سے پکارا اور کھڑا ہو گیا۔

"بارش"۔ چنڈمی نے دیوانوں کی طرح ہاتھ ہلاتے اور زمین پر لوٹ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر بُوندوں کی برسات ہونے لگی اور کاجل کے رنگ میں ڈوبی گھٹائیں کھُل کر برسیں۔

چنڈمی نے کہا "ہر شئے کی زیادتی کا علاج آپ سے آپ ہو جاتا ہے۔"

مَیں نے کہا " سنو تم بھگوان پر یقین رکھتے ہو؟ میرا مطلب ہے اس کے ہونے نہ ہونے میں وشواس ہے تمھیں؟"

چنڈی نے بھاگ کر ایک بڑی سی عمارت کے برآمدے میں گھستے ہوئے کہا:

"بھگوان جب بوندوں کے ہاتھوں سے مجھے چھُوتا ہے، آندھی کے کوڑوں سے مجھے مارتا ہے اور ہوا کے ذریعے مجھ سے ملتا ہے تو مَیں کس طرح بھگوان میں وشواس نہ کروں۔"

مَیں نے کہا " دیکھو ایسی شاعری نہیں سیدھا جواب دو۔"

چنڈی نے کہا " لگتا ہے تم بُہت جلدی میں ہو۔ سنو مُرلی دھر! مجھ سے بہت بڑھیا، بہت اچھے اور بہت ہی عظیم آدمیوں نے اس پر یقین کیا ہے۔"

" تمھارے پاس اس کے ماننے کی بس یہی ایک صُورت ہے، یہی ایک وجہ ہے۔" میں نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

" تم اس برسات کے بعد بھی برکھا کی اس دُھند میں بھی اسے نہیں مانو گے؟" چنڈی نے پوچھا۔

" نہیں، جب تک وہ اس سے زیادہ اپنے ہونے کا ثبوت مجھے نہ دے۔"

" تو اس کا فیصلہ اس پر چھوڑو۔ وہ اگر ہے تو اپنا آپ تم سے منوا لے گا۔" چنڈی نے اندر ایک کمرے میں ہوتے ہوئے تالیوں کے شور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا " آؤ۔"

اندر ریزولیوشن پاس ہو رہے تھے۔ ایک شخص کوئی بات کہتا اور دوسرے تالیاں بجاتے ہاتھ اٹھاتے اور کثرتِ رائے سے اسے پاس کرتے اور تالیاں پھر بجتیں۔

یہ تماشا دیکھتے ہم جانے کتنی دیر کھڑے رہتے کہ باہر شور اور اخبار والے کی تیز آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ کوئی ضمیمہ فروخت ہو رہا تھا۔ بھاگ کر میں باہر گیا میرے پیچھے پیچھے چنڈی بھی نکلا۔ ہم نے پرچہ خریدا اور روشنی کی طرف بڑھے۔

ہمارے دائیں بائیں لوگ کہہ رہے تھے "کشمیر میں جنگ چھڑ گئی ہے، کشمیر میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اندر ریزولیوشن پاس کرنے والوں کے عقب میں جا کر جنیڈی نے زور سے پکار کر کہا" ریزولیوشن پاس کرنے کا وقت ختم ہُوا، کشمیر میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔"

مندروں میں زور زور سے گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

لوگ جگہ جگہ جمع ہو کر اخبار پڑھ رہے تھے۔

خرید و فروخت کے لیے آئی ہوئی عورتیں سروں پر پلو ڈالے کام ختم کیے بنا کھڑی تھیں اور سواریوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

بارش کے آنے سے جو نکھار سا ایک پل کو پیدا ہوا تھا اس کے بعد سارے چہرے سوچتے ہوئے فکر مند اور سیاہ لگ رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی سی کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اپنی گورنمنٹ کو الزام دے رہا تھا کوئی دوسری طرف جا کر کے لوگوں کو ظالم، جاہل اور جنگ پسند کہتا تھا۔ دکاندار کہہ رہے تھے اب سب کاروبار مندا ہو جائے گا۔ گورنمنٹ نئے نئے طریقوں سے روپے کا مطالبہ کرے گی اور ہم قلاش ہو جائیں گے۔ لوگ ریڈیو کے گرد کھڑے خبروں کا انتظار کر رہے تھے۔

پھر یکایک گانے بند ہو گئے اور ریڈیو سے گھمبیر آواز میں کسی نے کہا "جنگ شروع ہو گئی ہے۔"

ہر آدمی کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ اب کیا ہو گا؟

ایک چھوٹے بچے نے اپنی ماں کا پلو پکڑے پکڑے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا "ماں کیا ہُوا ہے؟ سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ماں نے پلو چھڑا کر تیز چلتے ہوئے کہا "منّے یہ بڑوں کی باتیں ہیں تمھیں کیا پتہ چلے کا یوں سمجھ لو جیسے تم اور تمھارا گلی پار رہنے والا دوست چینتی ایک دوسرے کو مارنے لگے ہو۔"

بچے نے کہا "پر ماں تم تو کہا کرتی ہو کسی سے لڑنا پاپ ہے۔"

"منے میں تو کہتی ہوں وہ تو اب بھی ٹھیک ہے پر یہ دوسری بات ہے۔"

ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سڑک پار کی۔

ہم دونوں انھیں دوسری طرف جاتا دیکھتے رہے۔ پھر جنیڈی میری طرف مڑا اور کہنے لگا "میں نے اسی دن کے لیے بال بچوں کے جھنجھٹ سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔"

اور میں سوچ رہا تھا جنگ جانے کیا شے ہوگی؟ میں کس سے پوچھوں کہ جنگ کیا ہے؟ بابا نے سدا آزادی اور قید کی باتیں کی تھیں اور وہ تو نہیں تھے

بھوک، افلاس، تنگی اور اداسی کے سارے وقتی بھتنے جنگ کے بڑے دیو نے نگل لئے۔ ملک میں ہنگامی صورت حال کا اعلان ہوگیا اور کشمیر کا مسئلہ سارے ملک کی عزت نفس کا معاملہ بن گیا۔ بھکشا لینے والوں نے اپنے کشکول الٹ دیئے۔ دھن والوں نے اپنی دولت ہر ایک شے حکومت کے ایک اشارے پر دے دی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عوام کسی ایسے ہمہ گیر جذبے کے منتظر تھے جو انہیں خاک سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دے۔ کل تک جس جینے کا کوئی مطلب نہ تھا اب اس میں نئے معنی نظر آنے لگے ایک نیا جنون تھا جس میں ریت کے ذروں سے لے کر ستارے تک مبتلا تھے۔

مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں بابا کے پرانے دوست کی وساطت سے عارضی نوکری مل گئی تھی اور یوں بھی میں اتنے عرصے کے بعد اپنے آپ کو مصروف پا کر خوش تھا۔ میرا کام بھی ایسا سخت نہیں تھا۔ مختلف شہروں کے درمیان سفر کرنا اور اس فرم کی شاخوں کے حسابات کی پڑتال کرنا تھا۔ تنخواہ کوئی زیادہ نہیں تھی۔ پھر بھی میرے گذارے کے لئے کافی تھی اور میں نے اسے ہی غنیمت

جانار کافی ہاؤس میں جب لوگوں نے سنا تو دعوت کا مطالبہ کرنے لگے۔

چنڈی نے کہا " بھائیو یہ جنگ ہے اور ہم کو ایک ایک پیسے پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ فضول خرچی کی عادت بُری ہے۔"

موروتی نے کہا۔" تمہارے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو فضول کہاں سے خرچو گے۔"

" بلراج سے بھی دعوت ملے گی اس لئے کہ وہ ریڈیو کے پروپیگنڈا سیکشن میں نوکر ہو گیا ہے۔

بھگوتم اپنی ایک تازہ نظم کی نوک پلک دُرست کر رہا تھا۔

" تو کیا ہم جو یہاں پڑے ہیں کچھ نہیں کریں گے۔" رمیش نے دھیرے سے کہا۔

" کریں گے بھائی کیوں نہیں کریں گے۔ اب جب کہ کسی وزیر اور پردھان کی زندگی کا نہیں، ہماری تمہاری اپنی کھال کا سوال ہے ہم آخر چُپ تو نہیں رہ سکتے نا۔" چنڈی بہت جوش میں تھا۔

" میرے پاس سونا ہوتا، چاندی ہوتی، روپیہ ہوتا تو میں بھی کچھ نہ دیتا۔" بھگوتم پھر بولا۔

" تمہارے پاس لفظوں کا سونا ہے۔ خیالوں کی چاندی ہے۔ تم اس سے ہی خدمت کر سکتے ہو۔" چنڈی نے کہا۔

مجھے چنڈی کی جنونی کیفیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے اخبار کو محض اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ حکومت کی پالیسی اور اس کے لگائے ہوئے بندھنوں سے آزاد رہے اور اب حکومت جب جنگ کے باعث پریشان تھی وہ اس کے ہر قدم کو قابلِ تحسین خیال کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک پردھان منتری سے عقلمند اور صورتحال سے نمٹنے کے قابل کوئی شخص نہ تھا۔

مارجری واپس آ گئی تھی۔ وہ شہرے کو جلد از جلد ملک سے باہر بھیج رہی تھی اور ضرورت سے زیادہ مصروف تھی۔ ان دنوں غیر ملکیوں کا رویہ کچھ بدلا ہوا تھا اور ان کی نگاہوں میں بے مروتی سی تھی جیسے وہ آنکھیں چرا رہے ہوں، کسی حقیقت سے انکار

کر رہے ہوں، ہمارے پُرامید ہونے سے انھیں دھکا لگ رہا ہو۔

شرلے نے دیکھا تو کہنے لگی "کیا بات ہے تم بہت خوش نظر آتے ہو۔"

میں نے کہا "جب انسان صرف گھومے پھرے اور وقت برباد کرے تو اس کا احساس اسے مُردہ سے بھی بدتر کر دیتا ہے۔ ہم لوگوں کے نئے جذبے، نئے سیرابی اور نئے خیالوں نے زندگی بخش دی ہے۔ تمھارے اندیشے کتنے غلط ثابت ہوتے ہیں۔"

"یہ ساری وقتی باتیں ہیں۔ ہر آدمی اپنے دیوتا بنا لیتا ہے۔ تمھاری حکومت نے تم لوگوں کی اداسی کا، تمھارے سوالوں کا یہی ایک جواب سوچا ہے۔" وہ ہر تمام پر مستعد اور اپنے جواب سے تیار تھی۔

میں نے کہا "اور تمھارے ہاں ویت نام میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے۔ تمھاری حکومت تو تیرے میرے ہر کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑاتی ہے اور سدا تم لوگوں کی اداسی کا علاج ڈھونڈتی رہتی ہے۔"

"ہماری بات اَور ہے۔" شرلے نے آم کی قاش کو چمچ سے کھاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ کیا گوری چمڑی کی وجہ سے ہم سے عظیم ہو اور جو قانون تم پر لاگو ہوتا ہے وہ ہم پر نہیں ہو سکتا۔" میں اُٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

"بیٹھو، مرلی بہادر بیٹھو۔" وہ بدستور مصروف تھی "کیا تم سمجھتے ہو تم اس قوم کی برابری کرو گے جو دنیا کے ساٹھ فیصد خزانوں کی مالک ہے اور اسے جس طرح چاہے کنٹرول کرے۔"

"شرلے۔" میں نے زور سے کہا۔

"تم گرنے والے ہو گے۔ بیہوش ہو رہے ہو۔ کیا تم اس حقیقت کو نہیں جانتے؟" وہ میری طرف دیکھ کر مُسکرائی۔

میں نے کہا "مگر دولت کے بل بوتے پر تم لوگ ساری دنیا کے امن کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہو۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے کہا "ہوش کی بات کرو۔ تم لوگ سائنس اس لیے لیتے ہو کہ ہم لوگ تمہارے لیے کھانا مہیا کرتے ہیں۔ تم لوگ ہماری ملوں کا کپڑا پہنتے ہو۔ ہماری اُترن تمہارے لیے لباس ہے۔ ہم لوگ دنیا کے بادشاہ ہیں۔ ہم سب اس بات کو سمجھتے ہیں۔"

"مگر یہ تو دوسرے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہُوا۔" مَیں ذرا مزاحمت پر اُتر آیا۔

"مجبوری میرے نزدیک کوئی شے نہیں۔ تم لوگ ہر شے دان میں لینے کے عادی ہو۔" شرلے نے اپنے دونوں ہاتھ کاغذ کے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"غلط ہے بالکل غلط۔" مَیں پھر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے آزادی کے لیے جدوجہد کی ہے اور ہم نے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالا ہے۔"

"اوہ مرلی، تم تو یوں لڑ رہے ہو جیسے مجھے قائل کرنے اور نہ کرنے پر ہی تمہاری زندگی کا دارومدار ہو۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔

آگ میں تپے ہوئے لوہے پر جیسے ایک دم پانی پڑ جائے۔ شرلے کی آواز مجھے ٹھنڈا کر گئی۔ اس کی ہنسی سردی کی رو بن کر میری رگوں میں پھیلی۔

مَیں نے کہا "تم جو سمجھتی ہو وہ تو سمجھتی ہی رہو گی۔ بھلا تمہیں قائل کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟"

"ہاں! آسودگی سے سوچو تو یہی بات ہے تم مجھ سے لڑو تو لڑو، ساری دنیا تو یہی سمجھتی ہے اور ٹھیک سمجھتی ہے۔ ویٹ نام اور کشمیر تمہارے ملک سے باہر ہیں۔ یہاں جنگ لڑی تو ہماری وجہ سے لڑی جائے گی۔ اگر ہم تمہارے لیے اسلحہ نہ دیں تو؟"

مَیں نے چڑ کر کہا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ تمہاری ماں یہاں کیا کر رہی ہے؟ تم لوگ ہم کو ہمارے اپنے سہاروں پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

کہنے لگی "یہ تمہارا فیصلہ ہے اور تم کچھ نہیں ہو۔"

"تم بھی تو کچھ نہیں ہو۔" مَیں نے چوٹ کی۔

"ہم کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہیں مُرلی۔ حاکم قوم کا ہر شخص حاکم ہوتا ہے، لینے والی قوم کا ہر فرد بھکاری ہوتا ہے۔ قطرہ ندی سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔"

مَیں نے کہا "ٹھیک کہتی ہو۔"

کہنے لگی "اب یہ جنگ ہے کیا تم اس صورتِ حال سے انکار کر دو گے۔ اگر تمہارے چمڑے کی اس لیے ضرورت ہو کہ وہ جنگ میں بم بنانے کے کام آئے گا تو تم خوشی سے دے نہ دو گے۔"

"صرف اسی حالت میں اگر میں یہ سمجھوں کہ ہم سچائی کی خاطر لڑ رہے ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"نہیں لڑکے حکومت سچائی اور جھوٹ کے تمہارے بنائے اصولوں پر تو نہیں چلتی۔" شرلے نے اپنے کمرے کے باہر کھڑکی میں سے جُھک کر بیل کا پتہ توڑا۔

مَیں نے کہا "آخر تم جا کب رہی ہو؟"

کہنے لگی "مما کو مَیں نے بہت ستایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے مَیں نے ہر طرح مما کے خلاف سوچا ہے اور اب اس بہانے مجھے اور پپا کو بہت جلد یہاں سے رخصت کیا جا رہا ہے۔"

مَیں نے کہا "بہتر ہو تم اسے بھی ساتھ لیتی جاؤ مَیں تو اس کے لیے سب طرح کا مذاق ختم کر بیٹھا ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مما کو تمہیں باندھے رکھنے کا طریقہ آتا ہے۔" شرلے نے پتہ چباتے ہوئے کہا۔

"مگر میں آج کل فارغ نہیں ہوں۔" مَیں نے بڑی اہمیت سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" شرلے نے مڑ کر میوزک کی ایک کتاب اُٹھائی "تمہاری شکل پر سے وہ ساری اداسی اور آوارگی ختم ہو گئی ہے۔ لگتا ہے تم بھی کام کے آدمی ہوئے مجھے

خوشی ہے کہ اب تم کام کروگے۔"

میں نے پوچھا "تم یہاں سے جا کر کیا کروگی؟"

"سوچوں گی، مما تو شاید ایک دو ماہ اور گھر نہ لوٹے اور لوٹے گی تو سارے ملک میں یہاں کے متعلق لکچروں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ بورڈنگ اسکولوں اور کالجوں سے میرا دل بھر گیا ہے۔ میں شاید کوئی کام کرنے لگوں پھر اپنا علیحدہ گھر بناؤں گی۔ تم بھی میرے فلیٹ میں آؤ گے نا!"

"مگر میں تو کہیں بھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"آدمی روز نئے دیوتا بناتا ہے۔ تم بھی اور میں بھی۔"

میں نے کہا "تمھارے ہاں بچے ایسی ہی پختہ باتیں کرتے ہیں۔"

"فوہ مُرلی! اب کمینگی پر مت اترو۔ تمھیں معلوم ہے میں بچہ نہیں ہوں۔ ایک جوان عورت ہوں۔"

وہ خفا ہو گئی "اگر میں شراب نہیں پیتی اور ہر دلوانے سے نہیں لپٹتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہوشمند نہیں ہوں۔"

میں نے ریڈیو آن کیا تو اس پر قومی ترانے اور دیس بھگتی کے گیت بڑی دلآویز دھنوں اور سازوں کے ساتھ بج رہے تھے۔

شمرے نے کہا "جنگ ابھی تمھارے گھروں سے بہت پرے ہے۔ صرف تمھیں جوش دلانے کے لیے یہ ساری باتیں ہو رہی ہیں۔ اگر تمھاری سلامتی کو خطرہ ہو تو یہ ساز اور دھنیں ہر شے بھول جائے۔"

میں چپ رہا۔ شاید وہ ٹھیک کہتی ہو۔ کشمیر ہم سے بہت دور تھا۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی لحاظ سے بھی۔۔۔

ڈم ڈم کے اڈ ... س دن میں نے اسے رخصت کیا ہے وہ بہت خوش تھی۔

کہنے لگی "تمھارے یہاں آ کر یہ احساس ہوتا ہے جیسے کوئی جہنم میں دھکیل

دیا گیا ہو۔"

مَیں نے کہا "تمھارے لیے جنت کہیں نہیں ہوگی۔ تم کبھی ماں کی وجہ سے کبھی ملک کی پالیسی کی وجہ سے اور کبھی اپنے آپ کی وجہ سے، ہمیشہ جہنم میں رہو گی۔ سوچنے والے کے لیے کہیں بھی سُکھ نہیں، کہیں جنت نہیں۔"

پھر مَیں اور مارجری واپس آگئے اور زندگی کی کتاب کا ایک باب ختم ہو گیا۔ وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے ——

میں کسی کام سے امرت سر جا رہا تھا۔ فرم کے مالک نے مجھے کہا تھا "جتنے دن بھی لگیں، کوئی ہرج نہیں مگر کام نمٹا کر آنا۔ وہاں کے حسابات بند کر دیے جائیں اور اگر ممکن ہو تو دس پندرہ دن میں سارا ریکارڈ بند کر کے صدر دفتر بھیج دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں امرت سر دفتر اپنا کام بند کر دے، مزید لین دین نہ کرے۔"

مارجری کو پتہ چلا تو کہنے لگی "چلو، ایک طرح سے امرت سر تک تیرا میرا ساتھ رہے گا۔ مَیں چند دنوں کے لیے لاہور جا رہی ہوں۔"

"مگر لاہور میں تمھیں ایسا کیا کام ہے؟" میں نے جُز بُز ہو کر پوچھا۔

"مَیں تو ویسے ویسے گھومنے کی عادی ہوں اور پھر اتنے قریب آ کر لاہور کو دیکھے بنا چلے جانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ سُنا ہے وہاں پر شالامار باغ ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

میں نے کہا "کشمیر دنیا کا حسین ترین باغ ہے اور وہ تمھارے دیے ہوئے اسلحہ کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے۔"

کہنے لگی "سیاست مجھ سے نہیں چلے گی مُرلی۔ میں جوان نہیں ہوں۔ میرا خون گرم نہیں ہے۔ میں اس بات پر جھنجھلا کر تم سے لڑوں گی نہیں۔ تم جو چاہو، سوچنے کا حق رکھتے ہو۔"

میں نے کہا "مگر لاہور میں تمھیں کیا دلچسپی ہے ؟"

کہنے لگی "تم زبردستی مجھ سے ہر بات یوں پوچھ رہے ہو جیسے میں تمھیں جواب ضرور دوں گی ۔"

سفر کے دوران ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ میں جہاز کی کھڑکی میں سے باہر دیکھتا رہا۔ ہمارے نیچے دُور دُور تک بادلوں کا فرش بچھا تھا اور جہاں کہیں بادلوں کا گھیرا ٹوٹتا تھا زمین پر بنے گڑیا گھر اور بل کھاتے دریا ندیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے یہ امن اور شانتی سے سوئی ہوئی خواب لیتی زمین اور کہیں دُور بم بن رہے تھے۔ توپیں گولے بھرے تیار تھیں۔ جہاز مسافروں سے نہیں، تباہی کے سامان سے لیس ہوائی اڈے پر موجود تھے اور تباہی ان سب لوگوں کا مقدر بن چکی تھی جو اصل میں تباہ ہونے کے لیے نہیں، خواب لینے اور دنیا کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے پیدا کیے گئے تھے جن کو بھگوان نے اپنے ہاتھوں بنایا تھا۔

ائیر ہوسٹس کی آواز گونجی۔ مسافروں نے اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لیں اور ہوتے ہوتے جہاز نے نیچی پرواز کے لیے رفتار کم کر دی۔ پھر امرت سر کے باغوں اور ایوانوں پر سے اُڑتا ہوا لینڈ کرنے لگا۔ ہم سے چند میلوں پر وہ ملک تھا جہاں مار جری جانے والی تھی۔

وہ اتوار کی رات تھی۔ میں دن بھر کام کرنے کی وجہ سے تھک چکا تھا اور مقامی شاخ کے منیجر نے مجھے ایک نائٹ کلب میں شام گزارنے اور رات کے کھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ یہ کلب کمپنی باغ میں اس سڑک پر تھا جس کو لوگ ٹھنڈی سڑک اور صاحب لوگ لارنس روڈ کہہ کر پکارتے تھے۔ جس ہوٹل میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا وہ اوسط درجے کا صاف ستھرا اور شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ میں پہلی بار اپنی نانی کے ساتھ امرت سر آیا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا۔ وہ مجھے دربار صاحب جاتے ہوئے اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ تب تالاب ایک سمندر تھا اور اس کے بیچوں بیچ محل کھڑا ہے۔ سمندر کو دیکھ کر بھی میری وہ یادجوں کی توں تھی اس لیے جتنا وقت

میرے پاس تھا وہ میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزارنے کا ارادہ کر لیا۔

مارجری کا فون آیا۔ مَیں نے کہا "تم ابھی تک یہاں ہو؟"

کہنے لگی "صبح کسی وجہ سے مجھے گاڑی نہیں مل سکی تھی، اس لیے میرا جانا ملتوی ہو گیا تھا مگر اب وہی صاحب جن کی گاڑی تھی لیکا یک پروگرام بنا کر میرے ساتھ ہی جا رہے ہیں میں نے سوچا تمھیں الوداع کہتی چلوں پھر جانے کب ملاقات ہو؟"

میں نے کہا "میں دربار صاحب دیکھنے جا رہا تھا سوچا تمھیں اگر فرصت ہوتی، تو ساتھ چلتے۔"

کہنے لگی "وہ سونے کی عمارت وہ جو دریا کے درمیان ہے اور جس کے اندر جوتے اتار کر جانا پڑتا ہے۔"

"بالکل وہی۔" میں اس کی وضاحت پر ہنس پڑا۔

"وہ تو میں دیکھ بھی آئی جب تم اپنی فرم کے کاموں میں لگے تھے میں نے وقت گھومنے میں گزارا۔"

"آخر تمھیں لاہور میں ایسا کیا کام ہے؟ بھاگی کیوں جاتی ہو۔ یہاں بھی بہت چیزیں ہیں۔" میں نے بڑی تلخی سے کہا۔

"اچھا مُرلی گڈ بائے۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مَیں اسے گالی دینا چاہتا تھا مگر چونگا رکھ کر چپکے سے تیار ہونے لگا شری کے جانے کے بعد اور مارجری کے ملنے سے آج تک پہلی بار مَیں نے آئینے میں غور سے اپنی شکل دیکھی۔

بھگوتی پرشاد کا بیٹا بے حس اور زندگی کی دھڑکن سے تقریباً خالی
مُرلی دھر سول سروس کا ناکام افسر جھوٹے ریزولیوشنوں اور بے حسی کا شکار
فرم کی پڑتال کرنے والا افسر اپنے کام کے لیے نہایت۔ نااہل ہٹ کر فروا ہیں گم
ایک ناکام شاعر جس کو رتی کی چاہت نے شاعر بنایا اور نوکری کے چکروں

نے اس چاہت کے لگائے ہوئے پودے کو اُجاڑ دیا

ایک اوباش نوجوان جس نے ایک غیر ملکی عورت سے اپنے جسم کا سودا کیا اس لیے کہ وہ عام لوگوں سے ذرا الگ تھی اور گوری چمڑی والے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

پاربتی کا بھائی جس نے آج تک کبھی پاربتی کے لیے ہاتھ تک نہیں ہلایا جس نے پاربتی کی کوئی خدمت نہیں کی جو رشتوں ناطوں کی تقدیس میں یقین نہیں رکھتا جو محض اپنی صلیب کو اپنے کندھے پر اٹھا کر چلنا ہی زندگی پر بہت بڑا احسان سمجھتا ہے

مُرلی دھر جو بھگوان کو نہیں مانتا اس لیے اسے بھگوان سے کچھ لینا دینا نہیں، وہی بے حسی کا شکار

جانے میں کب تک آئینے کے سامنے کھڑا یونہی جرح کرتا رہا اور فیصلے صادر کرتا رہتا۔

میں نے دروازے پر دستک سنی اور پھر مینیجر کی آواز سنائی دی۔ میں نے ٹائی کی ناٹ باندھی اور آخری بار اپنے بے داغ سوٹ اور چمکتے بالوں پر نظر ڈال کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

مینیجر کہنے لگا "میں وقت سے پہلے آ گیا ہوں کہ اب آپ کو ذرا گھما بھی لاؤں گا۔ کلب تو یہاں سے دس پندرہ منٹ کا پیدل راستہ ہے یا اگر آپ پسند کریں تو ہم کلب میں ہی چل کر بیٹھتے ہیں۔ ویسے یہ باغ بھی دیکھنے کے قابل جگہ ہے اور پھر شاموں کو غیر ملکی اور شوقین مزاج لوگ سب یہاں ٹہلنے آتے ہیں۔"

میں نے اپنے آپ کو اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "جو آپ پسند کریں۔"

پھر ہم ہولے ہولے ٹہلتے ہوئے باغ کی روشوں اور تختوں، پانی کے چھوٹے چھوٹے نالوں پر سے پھلانگتے اور سبز گھاس کے سر پر سایہ کیے تنآور درختوں تلے سے گزرنے چلے گئے۔ مینیجر جانے کیا باتیں کر رہا تھا اور میں اس ساری خوبصورتی کے احساس سے مدہوش ہوا جاتا تھا۔ شام کے سرخ سایوں میں چمکتی کونپلیں،

ننھے ننھے تالوں میں اترتے ہوئے سورج، بہتے پانی کی ذرا ذرا سی اچھلتی لہریں، گھاس میں چرچراتے ٹڈے درختوں پر بسیرا کرتے پرندوں کے جھنڈ۔ دنیا کا ماضی حال اور مستقبل کوئی نہیں۔ یہ خوب صورتی دائمی ہے اور باقی ہر شے جھوٹ ہے۔ جنگ اور جھگڑے اور دل کی دنیا میں دھڑکنیں اور چاہتیں سب ڈھونگ ہیں۔ آدمی ساری زندگی ان چھوٹے چھوٹے پلوں پر بیٹھا لہروں کے ساتھ تانا بانا بُننے والے کیڑوں کو دیکھ کر گزار سکتا ہے۔ تب مجھے لگا فائلیں اور ان میں لکھے مُردہ حروف میرے لیے کچھ نہیں ہیں۔

تبھی ایک کنج میں سے کوئی سایہ سا کودا پھر ہیلو کی آواز آئی۔ شام کے حسین رنگوں میں لپٹی ساڑھی کے پلو کو اپنے کندھے پر جماتی ہوئی ایک خاتون نے کہا "کرشن بھائی آپ کیسے ہیں؟"

مینیجر نے کہا "میں اچھا ہوں، پدمنی تم کب آئی ہو؟"

"ایک ہفتہ ہوا ہے شنکر کا تبادلہ کشمیر ہو گیا ہے۔" پدمنی نے جواب دیا۔

"پدمنی ان سے ملو یہ ہیں مسٹر مُرلی دھر۔ ہمارے ہیڈ آفس سے آتے ہیں مسٹر مُرلی دھر! یہ پدمنی ہے، میرے دوست من موہن کی بہن۔"

پدمنی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ماتھے پر بندیا بہت بڑی تھی اور لباس بھی چمکیلا اور بڑھیا تھا۔ جانے کرشن چوپڑہ کے دوست کی بہن کیسی تھی۔ اس میں کوئی بات تھی جو پسند نہیں آئی۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور باتوں میں مخل نہ ہونے کا بہانہ کرنے لگا۔

پھر کرشن نے کہا "پدمنی! ہم کلب جا رہے ہیں، اگر تمھیں کوئی کام نہ ہو تو چلو ہمارے ساتھ، کیوں مسٹر مرلی دھر!"

"ہاں ہاں کیوں نہیں پدمنی دیوی ضرور چلیں ـــــ میں نے پدمنی کی طرف منہ کر کے جھکتے ہوئے کہا۔

اور وہ سڑک جو ذرا پہلے نہایت خوب صورت اور آباد تھی اب یکایک مجھے

سنسان معلوم ہونے لگی۔ جہاں درخت بوڑھے تھے، پرندے شور سے سرکھا رہے تھے، جہاں سبزہ جلا ہوا اور پھول بے رنگ تھے۔ انھوں نے مجھے بھی باتوں میں گھسیٹنے کی کوشش کی مگر میں صرف ہُوں ہاں کر کے ٹالتا رہا اور جب لمبی بیلوں سے ڈھکی راہداری سے گزر کر ہم اندر پہنچے ہیں تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔

کلب میں غیر ملکی بھی تھے جن کے چہرے ستے ہوئے تھے اور جو آرکسٹرا کی ایک ہی دھن پر جانے کب سے ناچ رہے تھے۔ پدمنی اس کلب کے بہت سے لوگوں سے آشنا معلوم ہوتی تھی۔ میں وہسکی کے جام میں ان غیر ملکی عورتوں کو دیکھ کر مارجری کو یاد کر رہا تھا جو جانے کن بازوؤں میں سمٹی لاہور کے کسی کلب میں ہوگی۔ وہ بھی کسی دُھن پر ناچ رہی ہوگی۔ شرلے اور رتی اور ایسی لڑکیاں جنھیں میں نے آج تک بھولے بھی یاد نہیں کیا تھا۔ سب جانے کیوں یاد آ رہی تھیں۔ پدمنی دیوی نے کہا "کرشن، کیوں نہ مُرلی دھر کا جام صحت نوش کریں۔ پھر کلب کے کونوں میں سے اٹھ کر انوکھی خوشبوئیں اور بھولی بسری یادیں میرے گرد پھرنے لگیں۔ پدمنی کا سانس ناپتے میں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہا تھا وہ کہہ رہی تھی "مسٹر مُرلی جانے کیوں آپ کو دیکھ کر مجھے کوئی یاد آتا ہے"!

ہم بے معنی باتیں کر رہے تھے۔ رات آرکسٹرا اور مدھم ہوتی روشنیوں میں ڈوب رہی تھی۔ پھر تیز سائرن کی آواز سنائی دی۔ ساری روشنیاں بجھ گئیں اور پدمنی کے بوجھل سانس کو میں نے اپنے ہونٹوں پر محسوس کیا۔ پھر جیسے ساری دنیا کی نبضیں ڈوب گئیں۔

اندھیرے میں ڈوبے ہوئے شہر میں سنسان باغ کی اجاڑ سڑکوں پر سے میں اور پدمنی ایک دوسرے کا سہارا بنے گزر رہے تھے اور کرشن معذرت کیے جاتا تھا اور پدمنی کے جسم کی گرمی مجھے گھبرائے دیتی تھی۔

ہوٹل میں بیرے بھاگ دوڑ کرتے روشندانوں کو ڈھانپتے اور حتی المقدور مہمانوں کے آرام کے لیے کوشش کر رہے تھے۔

مجھے اور پدمنی کو کرشن نے دروازے پر ہی خدا حافظ کہا۔

سوتے جاگتے میں میں نے عجیب سپنے دیکھے جیسے مجھے گدھ جھنجھوڑ رہے ہیں۔ میری ہڈیاں پانی بن رہی ہیں اور توپوں کی دھائیں دھائیں میں میں دھوئیں کے ساتھ اُڑ رہا ہوں۔

پھر پدمنی کا ترشا ہوا جسم میرے سامنے والے ڈریسنگ ٹیبل میں ہیرے کی طرح چمکا اور اس کے گھنے بالوں کا جال یوں لگا جیسے وہ کوئی مچھلی ہو جو اس میں پھنس گئی ہو۔ دھوپ روشندان میں سے اس کے پاؤں کی ایڑیوں پر پڑ رہی تھی جو اس نے اسٹول کے نیچے سے پیچھے کی طرف کر رکھی تھیں۔ میں نے حیرت سے اپنے گرد و پیش نظر کی۔

اس نے آئینے میں میری کھلی آنکھوں کے عکس کو دیکھا تو کہنے لگی "مُرلی بابو! آپ کو پتہ ہے رات ہم نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔"

مجھے اس کی بات پلے نہیں پڑی۔ اٹھتے ہوئے میں نے اپنے سراپا پر نظر کی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے راتوں رات مجھے قلاش کر دیا ہو۔

"تو یہ تمہارا کاروبار ہے۔" میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ میں پلنگ پر بیٹھا تھا اور میں نے پاؤں نیچے لٹکا رکھے تھے۔

"تمہارا دھندا لوگوں کی فائلیں دیکھنا ہے اور میرا دھندا تمہیں دیکھنا۔ کیا بُرا ہے اس میں!"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ تمہارا دھندا بُرا ہے مگر تم نے اور کرشن چوپڑہ نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔"

"سارے آدمی پہلے پہل غلط ہوتے ہیں پھر ہوتے ہوتے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" پدمنی اپنے بالوں میں کنگھی کر کے انھیں باندھ رہی تھی۔ اس کے سر کے اُوپر اُٹھے بازو جیسے دو لچکیلی شاخیں آپس میں گتھم گتھا ہوتے کو رِجھ رہی ہوں۔

"مگر تم اٹھو تو مُرلی دھر بابو! ہم لوگ ذرا سرحد کی طرف چلیں۔ تم نے سُنا نہیں

مگر نہیں، تم نے کہاں سُنا ہوگا کہ ہم لوگ لاہور تک بڑھ گئے ہیں۔ ہماری فوجیں لاہور کے بازاروں میں دُو بدُو جنگ کر رہی ہیں۔ شالامار کی روشوں پر چاندنی میں چلتے ہوئے یوں لگے گا جیسے میں نورجہاں ہوں اور تم ۔ ۔ ۔ ؟" اس نے آئینے کی طرف پیٹھ کر کے میری طرف دیکھا۔

مَیں نے مُنہ پھیر لیا اور ڈریسنگ گاؤن پہننے لگا "تم نورجہاں ہو تو ہو مگر مَیں جہانگیر نہیں ہوں۔"

"سنو مَیں نے کرشن چوپڑہ کو فون کر دیا تھا کوئی دم میں گاڑی آجائے گی اور ہم چلیں گے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم نے میری اجازت کے بنا یہ سب کیسے کیا ہے مَیں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" مَیں نے غسلخانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"چلو گے کیوں نہیں ؟ کیا تمھیں اپنی فوج کی بہادری کے کارنامے دیکھنے کی ضرورت نہیں کیا ؟ تمھاری رگوں میں ان بہادروں اور دیروں کا خون نہیں جنھوں نے آزادی کی خاطر اپنی جانیں لُٹا دیں۔" وہ میرے پیچھے کہہ رہی تھی۔

بھگوتی پرشاد کے بیٹے کو یہ سب لکچر ایک تھرڈ کلاس کال گرل سے سُننا پڑ رہا تھا مَیں نے تنگ آکر کہا "بہت اچھا مَیں تیار ہُوا جاتا ہوں۔"

جب نہا کر نکلا ہوں تو مَیں تازہ دم تھا اور پدمنی اپنا پرس کھولے ہاتھ کے آئینے میں بھیجتی جھنکیا اسے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی۔ ناشتہ اس نے وہاں منگوا لیا۔

"ٹائی کی گرہ باندھتے ہوتے میں نے کہا "سنو، مَیں لاہور تک جانا نہیں چاہتا تم مجھے اپنے ساتھ کیوں لیے جاتی ہو مجھے کام ہیں۔ فرم کے حسابات چیک کر کے واپس دہلی پہنچنا ہے۔"

وہ اسی طرح سے بیٹھی رہی۔ اس نے میری بات کا جواب تک نہیں دیا۔

پھر کرشن چوپڑہ کے شوفر نے دروازے کے باہر کہا "صاحب، موٹر آگئی ہے۔"

مجھے بہت غصہ آیا۔ یہ شخص جانے کیوں مجھے پدمنی کے حوالے کرکے خود غائب ہوگیا تھا۔

مگر موٹر فراٹے بھرتی ہوئی جی ٹی روڈ سے چھہرٹہ کی طرف رواں تھی۔

راہ میں ہم سے پہلے اور لوگ بھی لاہور دیکھنے کے لیے بے تاب ہوکر نکلے تھے اور اپنے اسکوٹروں اور سائیکلوں پر جارہے تھے مجھے لگتا تھا جیسے ہم سب گنگا نہانے جاتے ہیں۔ گاتے ہوئے لوگ ہنستے ہوئے جوان بچوں کے ساتھ نئے کپڑے پہنے۔

ڈیڑھ دو ماہ سے بھی زائد عرصے سے کشمیر کے محاذ پر جنگ لڑی جارہی تھی مگر کشمیر ہم سے دُور تھا اور ہم ذہنی طور پر بھی اس مسئلے سے کچھ ایسے آشنا نہ تھے پھر سیاست کی چالیں شطرنج سے بھی زیادہ پیچیدہ ہیں اور ہمیں کیا معلوم ہوسکتا ہے کہ کون راستی پر ہے۔ کشمیر کے مسلمان آزادی چاہتے تھے جبکہ ہندوستان کے اندر رہنے والے چار کروڑ مسلمان آزادی کے خواہاں نہ تھے۔ ان چار کروڑ مسلمانوں کو ہر آن زندگی کا خطرہ تھا وہ امن سے رہتے ہوئے بھی محفوظ نہیں تھے۔ آئے دن مختلف صوبوں سے فسادات کی خبر آتی تھی مگر اتنے بڑے ملک میں اگر ایک جگہ ایک جھگڑا ہو بھی تو دوسرے حصّوں کا اس سے متاثر ہونا لازمی نہ تھا خود دہلی کے محلوں میں کئی جگہ ذرا ذرا سی بات پر تلوار چل جاتی تھی پھر بھی کشمیر کا مسئلہ آزادی اور ملک کے حصّے ہونے سے جو شروع ہوا تھا تو اس کا جواب کسی سے بن نہیں پڑا اور اب جب کہ سارا ملک جنگ میں کودا تھا کیا تازہ محاذوں پر جنگ کرنا ہمارے لیے اچھا تھا؟

مَیں بھگوتی پرشاد کا بیٹا ہونے کے باوجود دل سے امن پسند آدمی ہوں اور نعروں کے بعد جو دوسرا مقام آتا ہے مَیں اسے پسند نہیں کرتا۔ مَیں جنگ پسند نہیں کرتا مگر میری پسند اور ناپسند کی کیا بات تھی اور اب میں ایک غیر عورت کی مرضی سے محاذِ جنگ کی طرف جارہا تھا۔

پدمنی نے کہا۔ ”لاہور میرے خوابوں کا شہر ہے۔ مَیں نے اکثر لاہور کے سپنے دیکھے ہیں کبھی کبھار یوں کہ مَیں اس زمین کو چوم رہی ہوں۔

"تمہارا بچپن یہاں گزرا ہے۔" میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مری آ باؤ میں نے ان گلیوں میں پاؤں چلنا اور پھر خواب لینا سیکھا تھا"

پدمنی سپنوں میں کھوسی گئی۔ "ہم کہاں کہاں گھومیں گے بھلا؟" اسنے میری طرف دیکھا

شو فر اکڑی ہوئی مونچھوں والا کرخت مزاج سکھ تھا اور پھر شاید اس سفر سے گھبرا

رہا تھا۔ کہنے لگا "بی بی ابھی تو پتہ نہیں لاہور پہنچیں گے بھی کہ نہیں۔"

پدمنی کہنے لگی۔ "کیسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔"

وہ اسی رفتار سے موٹر چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "دشمن کو کبھی سویا ہوا نہیں جاننا

چاہیے۔ واہ گرو کرے ہماری فوجیں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی فوجی جیپ

چلاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں تو پہلے سے پتہ ہوگا کہ حملہ ہونے والا ہے۔"

کہنے لگا۔ "نہیں صاحب مجھے کہاں پتہ چلتا۔ پر میرا گھر پٹیل گھر سے ذرا آگے

جی ٹی روڈ پر سڑک کے عین کنارے ہے۔ رات جب سائرن بجا ہے اور ساری

روشنیاں بجھ گئی ہیں تو فوجی قافلے بہت تیزی سے چھہرٹہ کی طرف جانے لگے۔

میں نے اپنے کوٹھے سے جھانک کر دیکھا تھا ساری رات گاڑیاں جاتی رہیں۔

پدمنی نے کہا۔ "صبح ریڈیو کی خبروں میں میں نے سنا کہ لاہور پر حملہ کر دیا گیا

ہے اور ہماری فوجیں وہاں کے بازاروں میں جنگ کرتی پھر رہی ہیں۔"

شو فر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا۔ "واہ گرو ہی جانتا ہے کہ یہ بات سچ ہے

یا جھوٹ۔"

پدمنی نے ذرا تلخی سے کہا۔ "جب راتوں رات حملہ کیا گیا ہے تو دن چڑھے

تک ہماری فوجیں ہر جگہ پہنچ گئی ہوں گی۔ پھر ان لوگوں کو تو اس کا ذرا سا گمان بھی

نہیں تھا۔ میں نے پرسوں رات چند غیر ملکیوں کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور ڈانس

کرتے ہوئے ایک نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی اور اچانک

خوشی آنے والی ہے۔"

"یہ غیر ملکی۔" میں نے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا۔ "ہماری زندگیوں میں اندر اور باہر ہیں ہم سے زیادہ ہمارے لیے پریشان ہوتے ہیں ہمارے ہر راز کے امین، آخر ہم باوجود آزاد ہونے کے ابھی تک ان کے چنگل سے نجات کیوں حاصل نہیں کر سکے۔"

مگر میں خاموش رہا۔ پدمنی کہہ رہی تھی۔ "اگر ہم ذرا سا پہلے جاگتے تو اس وقت تک لاہور میں ہوتے۔"

"اگر تمہیں لاہور جانے کی اتنی ہی جلدی تھی تو تم کسی غیر ملکی دوست کے ساتھ جا سکتی تھیں۔" میں نے ہولے سے اسے کہا۔

شوفر نے نہایت نستعلیق پنجابی میں گالی دیتے ہوئے کہا۔ "جناب یہ سالے گوری چمڑی والے ابھی تک نہیں گئے اور یہ ہم لوگوں کو لڑوا کر خوش ہوتے ہیں، ان کا فائدہ اسی میں ہے۔"

پدمنی ہنس کر کہنے لگی۔ "کرنیل سنگھ تمہیں گالی بکتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

کرنیل سنگھ نے ایک اور گالی دے کر کہا۔ "بی بی یہ سارا خون خرابہ انہی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ میں دوسری بڑی جنگ میں لڑا تھا۔ یہ پہلے ہم کو روپوؤں کے بدلے مرواتے رہے اور اب یہ جانے کس شے کے لیے مروائیں گے۔"

پدمنی نے کہا۔ "مگر وہ انگریز تھے اور یہ تو امریکی ہیں۔"

کرنیل سنگھ نے سامنے سے آتی ہوئی فوجی گاڑیوں کا راستہ چھوڑنے کے لیے موٹر کو کچے راہ پر ڈال دیا۔ گرد نے اڑ کر سب کچھ آنکھوں سے چھپا دیا۔ میرا منہ گرد سے بھر گیا اور میرے نتھنوں میں سوکھی مٹی کی ایسی باس گئی جس میں خشک پتوں کی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ زناٹے سے تیز چلا رہا تھا شاید اسے غیر ملکیوں پر بہت غصہ تھا۔ اور اُن ہارنوں کی پرواہ نہیں کر رہا تھا جو اس کے آگے اور پیچھے بج رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "کرنیل سنگھ گاڑی ٹھہرالو فوجی تمہیں روک رہے ہیں۔"

کرنیل سنگھ نے موٹر کو ایک طرف لے جا کر ٹھہراتے ہوئے کہا۔ "جب ہم الگا

شروع کیا ہوا میلہ دیکھنے جا رہے ہیں تو یہ سالے ہمیں کیوں روک رہے ہیں۔"

پھر فضا میں ہوائی جہازوں کی گونج سنائی دی اور اڑتے ہوئے جہازوں کا سایہ ساہم پر پڑنے لگا۔

پدمنی کہنے لگی۔ " دیکھیے کس قدر نیچی اڑان کر رہے ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ وُہ کوئی اور بات کہتی دھائیں دھائیں سے فضا تھرانے لگی۔ پھر ہم نے اپنے سامنے ہوا کو دھوئیں اور گرد اور بُو سے پُر ہوتے دیکھا۔ جیپوں کے کٹے ٹائر اور ٹرکوں کے ٹدگار ٹو اڑتے دیکھے۔ فوجیوں کو ہوا کے بگولے میں بلند ہوتے دیکھا۔ مَیں ایک خاردار جھاڑی کی اوٹ میں دوڑ کر لیٹ گیا۔ کانٹے میرے قیمتی غیر ملکی کپڑے کے سوٹ میں سے شیشے کے نوکیلے ٹکڑوں کی طرح پار ہو کر میرے پیٹ اور رانوں اور ٹانگوں میں چُبھ رہے تھے۔ پھر ایک اور دھائیں ایک اور دھماکہ لاتعداد، ان گنت دھماکے اور گونجیں ابھریں۔ پھر ایک تیز نوکیلا گرم بل کھاتا آگ کا شعلہ میری دائیں پسلی میں گھس گیا جو اپنی زبان سے میری ہڈیوں کو چاٹنے لگا۔ میں نے بمشکل اپنے آپ کو سیدھا کیا۔ سب طرف خاموشی تھی اور نیلا آسمان میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ تیز دھوپ ان کانٹوں کے سائے کو چھیدتی میرے چہرے کو جلا رہی تھی۔ پھر ایک گرم نمودار ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہوا جیسے مارجری کا بوسہ ہو جیسے پدمنی کے بوجھل بھدے ہونٹوں کا لمس ہو، وہ میرے حلق تک اُتر گیا۔ پھر ساری بیتابی اس ایک بوسے نے میرے اندر سے چوس لی۔ میں ایک میٹھی آسودہ کرنے والی نیند کی گود میں تھا اور نیلا آسمان میری آنکھوں کے دریچوں کے اندر آپ ہی قید ہوتا چلا گیا۔ میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں سبزے پر لیٹا جانے کیسے سپنے دیکھا کیا۔

آنکھ کھلی ہے تو مَیں ایک کمرے میں لیٹا تھا اور کمرے کی دیواروں کا نیلا رنگ مجھے لگ رہا تھا میں سمندر کے اندر کسی کشتی میں ہوں اور وہ کشتی ہچکولے کھاتی آگے پیچھے جاتی ہے۔ پھر میں نے کرشن چوپڑا کو آگے آ کر اپنے پر جھکتے ہوئے پایا۔

"مسٹر مرلی دھر آپ اب کیسے ہیں؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کانٹوں کی تیز چبھن میرے جسم کے مختلف حصوں میں اس گھڑی کی طرح پھر جاگی۔

"بھگوان نے آپ کو بچا لیا ورنہ میں سیٹھ کو کیا جواب دیتا۔" چوپڑہ اسی طرح جھکے جھکے بولا۔

"میں کہاں ہوں؟" میں نے کسی آشنا چہرے کو دیکھنے کے لیے پھر گرد و پیش پر نظر کی۔

"آپ جالندھر میں ہیں میرے گھر میں، ہم امرت سر خالی کر آئے ہیں۔"

"کیوں" اور دل میں میں نے سوچا۔ "تو میں امرت سر سے ایک گاڑی میں چلا تھا اور لاہور جا رہا تھا۔"

"امرت سر خالی کر آئے ہیں اس لیے کہ ہم پر شدید حملے ہو رہے ہیں ہم لاہور نہیں لے سکے۔ ہم بڑھ نہیں رہے صرف مدافعت کر رہے ہیں۔" چوپڑہ نے پھر جواب دیا۔

"آپ کو میرا ڈرائیور کرنیل سنگھ نکال کر لایا تھا۔ آپ زخمی تھے۔ میری موٹر کے عین اوپر بم گرا تھا۔ پدمنی کی ساڑھی کے چند ٹکڑے پاس کے درخت پر لٹکے تھے۔

اور اپنی چھنگلیا سے لپ اسٹک ٹھیک کرتی پدمنی مجھے دکھائی دی۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

پدمنی کے ساتھ بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ بہت خود سر، ضدی، مغرور اور خود پسند لڑکی تھی۔ میں نے اس دن اسے منع کیا تھا جب تک مکمل فتح کا اعلان نہ ہو جائے لاہور جانے کا کوئی فائدہ نہیں مگر اس نے کہا تھا کہ مسٹر مرلی دھر بھی لاہور دیکھنا چاہتے ہیں" اور میں نے کرنیل سنگھ کو بھجوا دیا۔

مجھے یاد آیا کہ اس صبح میں نے کرشن چوپڑہ کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔

"ہمارا آفس بھی بم کے گرنے سے تباہ ہو گیا ہے۔" کرشن نے مجھے اطلاع دی۔

تباہ شدہ کمپنی باغ اور گرے ہوئے سیاہ درختوں سے ای ڈی لارنس روڈ میری آنکھوں میں اُبھری۔

"مگر زیادہ تباہی نہیں ہوئی دشمن صرف ملٹری ہیڈکوارٹروں کو نشانہ بنارہا ہے ایک دوبار سے زیادہ ہم پر حملہ نہیں ہوا۔"

درد کی تیز لہر میری پسلیوں سے ٹکرائی اور میں نے دانت بھینچ لیے۔

جنگ کا یہ تجربہ بذاتِ خود اتنا خوف ناک تھا۔ میں محاذ سے کوئی بارہ میل اِدھر زخمی ہُوا تھا، اور عین میدانِ جنگ میں کیا حال ہوتا ہوگا۔ جسموں کے پارچے درختوں پر ٹنگے ہوئے جیسے وہ ناچیز ذرّے ہوں۔

یہ ہمہ گیر تباہی جس میں انسانی دل اور جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ امرتسر خالی، اس کے آس پاس کے گاؤں خالی۔ آہنی بموں کے نشانے موٹروں کے ٹائر اور گاڑیوں کے مڈگارڈ جیسے ساری چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہوں اور کون جانے اس بے ترتیبی سے ترتیب کب اور کس طرح سے ظاہر ہوگی۔

مجھے لگا کہ میں لُو اور آگ برساتی ہوا میں سیدھی سڑک پر ننگے پاؤں بھاگا جا رہا ہوں، رتی کی ٹیکسی میں سوار نہیں ہوا۔

دوسرے دن جب ریڈیو پر کوئی قومی ترانہ جنگی بینڈ کی دھن پر گایا جا رہا تھا، کرشن چوپڑہ نے کہا "مسٹر مرلی دھر کوئی صاحب ہیں چنڈی داس آپ کو پوچھ رہے ہیں"

اس سے پہلے کہ میں اس بات کو سمجھتا کہ میں دہلی سے سینکڑوں میل دور ایک اجنبی گھر میں ہوں۔ چنڈی داس اندر آگیا اس نے مجھ پر جھک کر میرے ماتھے کو چوم لیا گرم آنسو سوکھے دنوں کے بعد بارش کے پہلے قطرے کی طرح میرے گال پر گرا۔

میں نے کہا "اب تو میں اچھا ہوں روتے کیوں ہو؟"

کہنے لگا "مرلی یہ بات نہیں، میں سوچتا ہوں ہماری ماں کو، بھارت ماتا کو ابھی بہت زیادہ بھینٹ کی ضرورت ہے۔"

"تو تم سمجھتے ہو تمھارے میرے خون کی پیاسی ہے یہ زمین" میری پسلی میں

آگ پھیل رہی تھی۔

چنڈمی نے کہا "یار مرلی تم تو میں بھی بہت سی چیزوں کے خلاف تھے مگر اب تو تمھاری اور میری زمانوں کی دُوری ہو گئی۔ میں اور تم دو مختلف راہوں پر چل پڑے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ضرورت پڑنے پر اپنے سارے نظریے اور سارے عقیدے ایکطرف رکھ کر ہمیں صرف اس ایک بات کیطرف دھیان دینا چاہیے۔ اگر تمہارے کوئی اختلاف ہوں جن کو تم موجودہ حکومت کی وجہ سے عین ٹھیک سمجھتے ہو تب بھی یہ وقت سوال کرنے کا نہیں کام کا ہے۔ اگر تم بیمار نہ ہوتے تو میں تم کو اپنے ساتھ لے چلتا۔ میں آج کل جنگ سے متاثرہ لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"کیا ——؟" میں درد سے بے تاب ہو رہا تھا۔

"ہاں، میں نے بیکار تُک بندی چھوڑ دی ہے اور کام کر رہا ہوں۔" چنڈمی نے اٹھ کر دیوار پر لگی ایک تصویر کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کرشن نے یہ تصویر بہت خوبصورت لگا رکھی ہے مگر اب یوں لگتا ہے جیسے یہ سارے پُرانے جنم کے قصّے ہوں"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ درد رہ رہ کر میری ہڈیوں میں لہرا رہا تھا اور درد کے ساتھ وُہ تصویر بھی پھر رہی تھی جیسے وُہ درد کا ایک حصہ ہو جیسے اس کے رنگ وُہ چہرے وُہ نقوش سب میرے خون میں گھل گئے ہوں۔ میری رگوں میں گھوم رہے ہوں۔ "اس کا نام" آمدِ بہار" تھا نیچے عمر خیام کی رباعی لکھی تھی۔

"عمر خیام" چنڈمی نے زور سے کہا "بھلا عمر خیام کو ہمارے ترقی یافتہ زمانے کی الجھنوں اور پیچیدگیوں اور تقاضوں کی کیا خبر تھی۔ ہماری طرح وہ کبھی ان حقیقتوں سے دوچار نہیں ہُوا کہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو ایک کر دو اپنا آپ بھول کر مادرِ وطن کی خدمت کرو۔ اپنی آرام وہ قبر میں لیٹا پھولوں تلے دفن اُسے کیا معلوم کہ میدانِ جنگ میں ایسے ایسے لوگ ختم ہوتے ہیں جن پر خود زمین کو فخر ہو۔"

میں نے کہا "تم جذباتی کیوں ہو رہے ہو تم تو بہت بدل گئے ہو۔"

چنڈی ہنس کر میری طرف آیا کرسی پر نہیں پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "تمہیں معلوم نہیں میں تو سدا کا جذباتی ہوں اور پھر یہ وقت"۔

کرشن چوپڑہ کے ساتھ ڈاکٹر آ گیا تھا۔ چنڈی اُٹھ کر کہنے لگا۔ پھر زور زور سے سائرن بجنے لگا اور ہم سب دم سادھے چُپ چاپ تھے جیسے یہ موت کی آواز ہو اور وہ ہر لحظہ ہمارے قریب آ رہی ہو۔ ہوائی جہاز کی گونج سنائی دی اور فضا دھماکوں سے بھر گئی جیسے کوئی تیز بہتے دریا کا دھانہ یکایک آکاش اور زمین کے درمیان کھل جائے۔

چنڈی نے میرے کان میں کہا "ہم کو اس لیے اپنا آپ مضبوط بنانا ہے تاکہ کوئی جہاز پھر ہمارے پُرامن دنوں اور خاموش راتوں کو اس طوفان سے نہ بھر سکے۔

میں نے دم دم بڑھتی کمزوری کی وجہ سے اُسے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکرا دیا

چنڈی نے کہا "مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ تمہاری خودسری سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ تم جو زندگی کی ساری مشینری کو نئے سرے سے بنانے کا سوچتے ہو تم بھلا یہ کر دگے کہ اُٹھو اور دشمن کے خلاف جنگ میں شریک ہو جاؤ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم صرف زخمی ہو گئے۔

چنڈی چُپ رہو۔ میرا کوئی دشمن نہیں۔ یہ میری بے وقوفی تھی کہ میں تماشا دیکھنے کے لیے پدمنی کے ساتھ لاہور کی طرف چلا تھا۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

آل کلیر کا سائرن بج رہا تھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر میں نے پہلی بار ایک موہوم مسکراہٹ کی جھلک دیکھی جیسے موت کے سائے اُٹھ جانے کے بعد آپ سے آپ پیدا ہو گئی ہو۔

میری پٹی بدلتے ہوئے اس نے کہا۔ "بہت آرام اور سکون کی ضرورت ہے مسٹر مُرلی۔

مگر میں تو اُسے آج اپنے ساتھ واپس دہلی لے جا رہا ہوں۔ چنڈی کی

آواز میں ضد تھی۔

"یہ ناممکن ہے" ڈاکٹر نے مختصراً کہا۔ یہ تو یہاں سے ہلائے بھی نہیں جا سکتے۔
قسمت اچھی تھی جو بچ گئے ورنہ بم کا جو ٹکڑا ان کی پسلی میں گھسا، اگر دوسری طرف لگتا تو دل کا کچھ نہ بچتا۔ جہاں آپ نے اتنے دنوں جدائی برداشت کی ہے وہاں اور تھوڑے دنوں صبر کیجئے۔"

چنڈی نے کہا۔ "مگر یہاں چوپڑہ صاحب کو تکلیف ہوگی۔ اگر ہسپتال میں جگہ مل سکے تو۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ہسپتال کا ذکر ہی نہ کریں۔ ہم نے تمام ایسے مریضوں کو چھٹی دے دی ہے جو ناقابلِ علاج تھے یا جنہیں تھوڑی سی محنت اور تردد سے بچایا جا سکتا تھا اب تو صرف وہی لوگ ہیں جن کا ہلانا قانونی طور پر منع ہے۔ آپ کو نہیں پتہ زخمیوں کے لیے جگہ بنانا کس قدر مشکل ہو رہا ہے۔ ڈاکٹروں کی کمی ہے اور کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ ہسپتال کی تو سوچ ہی بیکار ہے۔

"مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ چنڈی داس صاحب" چوپڑہ نے کہا۔

میں اس کو لے جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بنا میں بہت پریشان ہوں۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر پھر محاذِ جنگ اور زخمی لوگوں اور اجڑے گھروں کی باتیں کرنے لگا جیسے یہ ساری باتیں اُسے ازبر ہوں اور پھر انسانوں کی تباہی کی باتیں ہوں میدانِ جنگ میں توپیں اور ٹینک اور فوجیں بھیڑوں یا لوہے کی قطاریں ہوں بے جان چیزوں کے نام ہوں اور ان کی کچھ حقیقت نہ ہو۔

چنڈی نے کہا۔ "ایسی قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔"

ڈاکٹر نے بیٹھ کر اپنا دواؤں کا بکس بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان کو باتوں کو ترقی نہیں سمجھتا۔ فوجوں کو لڑانے سے بہتر ہے۔ کہ دونوں ملکوں کے سربراہ میدان میں آ جائیں اور طاقت آزمائیں۔ اب دیکھئے مسز مرلی نے کوئی قصور نہیں کیا وہ شاید دل سے اس

جنگ کے حق میں بھی نہ ہوں اور ہُوا یہ کہ بم اُن کی پسلی میں لگا۔

چندی نے اپنا بازو لہرا کر کہا۔ مگر میں پھر بھی اُسے غیر ضروری نہیں کہوں گا ہو سکتا ہے۔ مُرلی اور ایسے لوگ زخمی ہو گئے ہوں جو اس قربانی اور اس کی نوعیت میں یقین نہیں رکھتے یہ ہماری آن ہمارا فخر ہمارا غرور ہے۔ اس سرزمین کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔"

ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔" اپنی اپنی سمجھ ہے جناب مگر جب ایک انسان زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے تو اُسے یہ سہارا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ کہ اس نے آن اور فخر اور غرور کے لیے جان دی۔ بہر حال وہ بڑے کرب سے جان دیتا ہے۔ اور میں نے کسی کو اپنے مرنے پر خوش ہوتے نہیں دیکھا"۔

چندی کا جواب سُنے بنا وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کی رپورٹ حکامِ اعلےٰ کے پاس کرنی چاہیئے۔" چندی نے چڑ کر کہا اور پھر اس نے اپنی جیب میں سے ایک لمبا سا پرچہ نکالا۔ میں نے سوچا یہ کاغذ ہو گا جس پر وُہ رپورٹ لکھے گا یا جانے کسی کا خط ہو جو وُہ مجھے دینا بھول گیا ہو۔ مگر وُہ بڑے طمطراق اور جوش و خروش سے ایک نظم پڑھنے لگا۔

ختم کر کے کہنے لگا۔ مُرلی دھر میں اب قومی شاعر ہو گیا ہوں"

کرشن چوپڑہ نے کہا۔" ایسی جوشیلی نظموں کی تو نوجوں کے لیے ضرورت ہے۔

"مگر میں تو مرلی میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" چندی نے سنجیدگی سے کہا۔

ساری نقاہت کے باوجُود میں زور سے ہنس پڑا اور کرشن چوپڑا کا تو ہنستے ہنستے منہ سُرخ ہو گیا اور پھر وُہ تیزی سے اُٹھ کر جیسے اُسے کوئی کام یاد آیا ہو باہر چلا گیا۔

کرشن کے جانے کے بعد میں نے چندی سے کہا۔

"سچ سچ بتاؤ کیا تم اس پُوری نظم کے اندر موجُود ہو؟"

"کیا مطلب"؟ چندی نے قطعی بُرا مان کر کہا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کیا تم ایمانداری سے اس جنگ کے انتہ ضروری ہونے کے

حق میں ہو۔ کیا یہ جنگ ناگزیر نہیں تھی؟ کیا ہم اور ہماری حکومت افلاس اور مہنگائی بڑھتی ہوئی آبادی بے کاری کے مسائل سے زیادہ اس جنگ کو ضروری سمجھتے ہیں" میں نے ہولے ہولے بات ختم کی۔

"ٹھہرو" چنڈی نے کہا "مجھے سوچنے دو"

"مگر سوچا کیا ہے اگر تم ان مسائل سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو تو تم کہو گے کہ جنگ ہی آخری حربہ تھا اگر نہیں تو کیا تم یہ نہیں مانتے کہ تمہارے لیڈروں اور تمہارے ناخداؤں نے سستی شہرت کے لیے اتنے لوگوں کو خواہ مخواہ جنگ میں اُلجھایا" میں اپنی طویل نظم کا جھوٹ ثابت کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔

"تمہاری باتوں سے بغاوت کی بُو آتی ہے تم ایسے ملک میں کیوں رہتے ہو جہاں تم سول سروس میں نہ آنے کی وجہ سے اتنے تلخ ہو" چنڈی کو شاید مارجری کے ہاں کی شام پھر یاد آرہی تھی اور اس کے گال پر میری انگلیوں کے نشان اُبھر رہے تھے۔

"اگر سوچنا بغاوت ہے تو میں باغی ہوں" میں نے بھی اُسے تیزی سے کہا۔ "ہم آخر میں اس سے کیا حاصل کریں گے۔ سوائے اس کے معذور آدمیوں اور ودھوا عورتوں، یتیم بچوں اور اُجڑی بستیوں میں اور اضافہ ہو جائے" میری سانس تیز بولنے کی وجہ سے پھُول رہی تھی۔

"شانتی۔ شانتی۔" چنڈی نے میرے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ دھرا۔ "اگر تم چُپ ہو جاؤ تو میں کہنے کو تیار ہُوں کہ میں اس نظم کے اندر اپنے سارے وجُود اور رُوح سمیت نہیں ہُوں۔"

"تم سے کچھ منوانے تمہارے قبول لینے کا میں انتظار نہیں کر رہا چنڈی۔ میں تم سے باآوازِ بلند سوچتے ہوئے بات کر رہا ہُوں۔ میرے اندر بھی ایک مُجتنا ہے جو حرکت کو تڑپ کو آگے بڑھنے کو دُوسروں سے اپنا آپ منوانے کو بہتر سمجھتا ہے۔ مگر ابھی تو شانتی کی ضرورت ہے اور میں اس مُجتنے کو یوں زیر کرنا چاہتا ہُوں کہ تم اور میں مل کر اس کی ہر حرکت کو جھوٹ سمجھیں اپنے اندر سے باہر نکلنے پر مجبور نہ کریں۔

پھر دُوسرے کمرے میں کسی نے دھیمے سروں میں کوئی ریکارڈ بجایا اور نرم نازک سکون بخشتی ہُوئی آواز ٹھنڈے پانی کی لہر کی طرح ہمارے سروں کے اُوپر سے پھسلتی چلی گئی۔ جیسے جنگ اور ہوائی جہازوں کی نیچی اُڑان آدمیوں کی دھجیاں گرد آلود سڑکیں لٹی ہُوئی بستیاں کہیں نہ ہوں" جوگ کی رات کی بھور بھئی۔

چنڈی نے میرے کاغذ اُٹھا کر اس کی بہت سی تہیں بنا کر اُسے اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ گویا تم اس طویل پُرجوش نظم کے جھوٹ کے کچھ کچھ قائل ہو گئے ہو" میری پسلی میں زور سے درد پھر اُٹھ رہا تھا اور میں نے پھٹتے ہُوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا وُہ تیزی سے اُٹھ کر میری طرف آیا۔

"میرے دوست مرلی دھر، میرے عزیز جنگ نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟"

چنڈی نے میری وجہ سے اپنے نظریئے نہیں بدلو!" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

کرشن نے اندر داخل ہُوتے ہوتے کہا؛ "آپ لوگوں کو بڑی خُفیہ خبر سُنانے آیا ہوں شہر تقریباً خالی ہو رہا ہے کیونکہ آدم پُور یہاں سے نزدیک ہے اور ہوائی حملے شدت اختیار کر رہے ہیں"

درد واپس جاتی لہر کی طرح دُور سمٹ رہا رہا تھا۔ میں نے تکیے کے سہارے سیدھے بیٹھتے ہُوتے اُن دونوں کی طرف دیکھا وُہ بہت فکر مند اور اداس سے ایک دُوسرے کو تک رہے تھے۔

آج جنگ کو سات دن ہُوتے ہیں" کرشن میری طرف جھکتے ہُوتے بولا گاڑیاں زخمی فوجیوں اور سامان جنگ کو لیے لیے پھرتی ہیں۔ راہ میں حملے کے خطرے ہیں سو الگ میں سوچتا ہُوں آپ میرے گاؤں چلے جائیں تو کیسا ہے۔ ڈاکٹر کا ہر دم کا ساتھ نہیں ہو سکتا مگر اب تو صرف پٹی ہی کرنا ہوتی ہے اور وُہ تو ذرا سا ہوش مند آدمی کر سکتا ہے۔ دہلی تک کے سفر کی نہ آپ میں سکت ہے اور نہ ہی وہاں تک جانے کی میں آپ کو صلاح دُوں گا۔"

چنڈی نے کہا "ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

اُس کی بات ختم ہونے سے پہلے سائرن تیز گونجت آواز میں پھر بجنے لگا۔

میں اور چینڈی جب کرشن کے گاؤں سے واپس آتے ہیں تو جنگ ایک بھولی بسری کہانی بن چکی تھی۔ اور ہار جیت کے بنا ختم ہوئے میچ کی طرح خوشی اور مسرت کا بھرپور تاثر دینے کے ساتھ ساتھ ایک چبھن بن کر سینے میں کھٹکتی بھی تھی۔ ویسے بڑھتی ہوئی آبادی کا ایک موثر علاج بھی تو ہے یہ! جنگ کے بعد بھی بھوک کا سوال ایک ختم نہ ہونے والے شیطان کی طرح سامنے کھڑا تھا اور وہ ساری بے یقینی بے اطمینانی بے ایمانی دوبارہ لوٹ کر آگئی تھی۔ جیسے چھوٹی لہر کے بعد بڑے طوفان کا حملہ۔ جو ہر ایک دُوسرے سے یہ سوال کرتا تھا۔

ہم نے اِس جنگ میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟"

بڑی دوڑ دھوپ اور کوششوں سے حاصل کی ہُوئی نوکری اُس لمبی بیماری نے ہڑپ کر لی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری لیے ہُوئے لوگ ادنیٰ ملازمتوں کے لیے تگ و دو کرتے پھرتے تھے اور پھر مجھے ایک گونہ اطمینان سا ہُوا جب نوکری جاتی رہی زندہ رہنے کے لیے اگر روز کی روٹی مل جائے تو کافی ہے۔ چینڈی کے ہمراہ کافی ہاؤس کے ایک کونے میں میں بھی اندر سے کھولتا رہتا اور بیٹھا رہتا۔ اپنے ناکارہ ہونے کا احساس مجھے روز بروز تلخ سے تلخ تر کر رہا تھا۔ بھلا میں نے آج تک کیا کیا تھا؟

جوان ہوتے لڑکے اور نئے شاعر پہلے پہل شراب پی کر بہکنے والوں طرح عجیب اوٹ پٹانگ باتیں کرتے تھے۔

"یار میں نے جب فلاں ریزولیوشن پاس کروایا تو پرنسپل نے مجھے دفتر میں بلایا اور میری بہت منت کی" کوئی کہتا۔

"ہوں" دُوسرا سننے سے پہلے اپنی فتح کا ذکر کرنے لگتا۔ ایک عجیب دھما چوکڑی مچی رہتی، جنگ نے کتنے نئے شاعر نئے لکھنے والے اور نئے سوچنے والے پیدا کیے تھے۔ جو ذہن سے نہیں زبان سے سوچتے تھے۔ قلم سے سوچتے تھے جو باتیں کرنے کی خاطر زندہ تھے اور جو نئی نسل کے لیے مشعلیں لیے ہُوئے گھومتے تھے مگر جن کے دل روشنی سے

خالی تھے۔ کبھی کبھار ایسا سناٹا ہوتا مانو ویرانے میں گم ہو گئے ہوں نہ کوئی اپنی آواز سننے والا نہ کوئی سمجھنے والا نہ کوئی اس راہ پر چلنے والا اور اپنے قدموں کی چاپ تک سنائی نہیں دیتی تھی۔

جنگ نے دلچسپ مذاق ہم سے کیا تھا۔

انہی دنوں مارجری بھی اپنی یاتراؤں سے واپس آگئی۔ آج میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ غیر ملکی لوگ صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ہم لوگوں سے دوستی کرتے ہیں وہ زیر لب مسکراتے ہوئے ہمارے ہاں سے رخصت ہوتے ہیں اور ہماری حیثیت ان کی نگاہوں میں چاپلوسکتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی سیاست کی بساط پر ہمیں محض اور صرف مہروں کی طرح استعمال کرتے ہیں مدد دینے کے بہانے وہ ہمارے گھروں میں گھس آتے ہیں اور ہماری نوجوان نسل تن آسانی اور آئندہ خوشیوں کے وعدوں پر کس طرح ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہے

جس دن چنڈی اور میں اُسے ملنے کے لیے گئے ہیں وہ کھل کر بات نہیں کر رہی تھی جیسے شرمندہ ہو کر اس شرمندگی کو قبول کرنا نہ چاہتی ہو۔ چنڈی دوسرے ملک سے لائی ہوئی تصویروں کی کتابیں دیکھتا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ آتشدان کے سامنے نیم دراز تھی اور چاکلیٹ کھاتے ہوئے کسی کتاب کے ورق اُلٹ پلٹ کر رہی تھی۔ میں الماری میں رکھی بوربن کی بوتلوں اور فرانسیسی رنگین شراب کی قطار اندر قطار سجی ہوئی سیال آگ کو دیکھتا رہا اور پھر مجھے سخت پیاس لگی مجھے اپنے اعصاب میں شدید کھنچاؤ محسوس ہوا اور اس عورت کی تمنا میری جان کو تیز دھوپ کی تپش بن کر لگی جیسے حدت سے سر چکرانے لگے اور بخار کی سی کیفیت ہو مگر میں مڑ کر اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے تجربے کو دُہرانا نہیں چاہتا تھا۔

یکایک چنڈی نے کہا مارجری تمہیں ہم دونوں میں سے کس کی ضرورت ہے میری یا مرلی کی اگر تم مرلی کو ٹھہرانا پسند کرو تو میں چلا جاتا ہوں؟

مارجری نے زور سے قہقہہ لگایا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی چلو یہ سرد جنگ تو ختم

ہونی چاہیے تم زبان درازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور میں تمہیں اس سانحے کے بعد سے کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ تم کو یہ ہمت کیسے ہوئی کہ تم مجھ سے ملنے چلے آتے۔"

چنڈی نے کہا، "میں نفرت کرنے والی عورتوں کے تیور پہچانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے تم منہ کا مزہ بدلنے کے لیے خاک تک چاٹنے کو تیار ہو سکتی ہو۔"

"میں نے سوچا تھا تمہارے مزاج کی حس کو جنگ نے تھوڑا بدل دیا ہوگا مگر دیکھتی ہوں تم ابھی تک ویسے ہی ہو یہ کیسے ہے کہ اتنے بڑے واقعے نے تمہارے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ حیرت ہے تم نے جنگ سے کوئی اثر نہیں لیا۔" مارجری نے بہت ٹھہر ٹھہر کر بات ختم کی۔

"تمہارا خیال ہے میں بین کرنے لگوں۔ تم سے بات کرتے میں آنکھیں نیچی رکھوں؟" چنڈی پہلو بدل کر ذرا اور جم کر بیٹھ گیا

مائی گاڈ۔ چنڈی میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں جب کوئی بڑا واقعہ ذہن کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو جنس اور ذاتی لڑائیاں اور تلخیاں سب بے بضاعت اور بے حیثیت لگنے لگتی ہیں۔ آدمی آخر کسی قوم کا فرد بھی تو ہوتا ہے۔ مارجری کوشش سے سیاست کو اپنی گفتگو میں ٹھونس رہی تھی۔

"تم کس منہ سے یہ سارے مسائل ہمیں سمجھاؤ گی۔ تم اور تمہاری قوم تو ہم لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہو۔" چنڈی نے بالکل لڑائی والا انداز اپنے پر طاری کر لیا

"چنڈی میں تم سے کسی بات کے لیے بحث کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" آگ پر لکڑیاں ڈالتے ہوئے مجھے وہ بے بس سی عورت لگی جانے کیوں؟

"میں تم کو بحث کے قابل سمجھتا ہی کب ہوں۔ میرے لیے تمہاری حیثیت سوائے عیش کی ایک صورت کے اور کچھ نہیں۔ فی الحال تو مجھے اس کی بھی تمنا نہیں اس لیے الوداع، مرلی تمہیں کافی ہوگا۔" اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا وہ جا چکا تھا اور مارجری ایک گدی پر اوندھی پڑی تھی۔ سسکیوں سے اس کا جسم ہل رہا تھا۔

اندھیرے میں نہ تابناک گلاب کھلے اور نہ کوئی تیز مہک ہی ہمارے گرد بکھرگئی رہی تھکے ہوئے جسموں کی بو تھی اور بے پناہ تنہائی تھی اور دو الگ الگ قوموں کے افراد تھے جنہوں نے اس گونگی زبان میں باتیں کرنا جانے کب سے سیکھ لیا تھا۔ مجھے وہ کسی کال گرل سے زیادہ نہیں لگی مگر میں پوری طرح مدہوش نہیں تھا اور وہ شرلے کی ماں ہونے کی حیثیت سے کوئی زیادہ خیال انگیز نہیں تھی اور اس میں میرے لیے کوئی نیا پن بھی نہیں تھا۔ وہ بہرحال ایک غیر ملکی عورت تھی اور سامانِ تعیش بھی نہیں تھی۔

اس رات کے بعد سے صبح میرے لیے کبھی نہیں ہوئی مارجری نے مجھے جس قیمت پر خریدا ہے اس پر آج تک بکتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ چنڈی نے اپنے جسم کا سودا کیا تھا مگر میں نے تو روح بیچ ڈالی تھی۔ آخر میں مجھے پتہ چلا کہ وہ نہ کوئی شاعرہ تھی نہ اُسے ہمارے ہاں کے شاعروں میں دلچسپی تھی اس نے اپنا شکار بہت ہوشیاری سے چنا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں میں اس کا آفیشل عاشق تھا ہم ساتھ ساتھ غیر ملکی پارٹیوں میں جاتے تھے۔ اپنوں نے بھی بیگانوں میں میری اتنی عزت دیکھ کر مجھے اس اونچی سطح پر قبول کر لیا تھا۔ جہاں ریس کے گھوڑے تھے۔ مہنگے کلبوں کی ممبر شپ تھی۔ ہوائی جہازوں کا آرام دہ سفر تھا۔ سرکاری ڈنر تھے اور سخت کلف لگے کالر کی سفیدی اور اکڑ کو مؤثر سمجھا جاتا تھا۔ شہر میں ہونے والی ہر تقریب کے کارڈ میری جیب میں ہوتے تھے۔ میں ہر جگہ بار پا سکتا تھا کیونکہ غیر ملکی شرابوں کی قطار اندر قطار سجی بوتلیں میرے فلیٹ کی الماری کی زینت تھیں جسے میں اپنا ذاتی بار کہتا تھا۔ اور جس تک رسائی پانے کے لیے کئی کامیاب سول سروس کے افسر بے تاب رہتے تھے۔

میرے ارادے میرے نظریئے سب ماضی کی داستان بن گئے۔

اور اپنے تجربے سے میں کہتا ہوں جب خون میں حدت کم ہو جاتی ہے آدمی خواہش کا غلام بن سکتا ہے پھر میرے چاروں طرف تو ایسے ہی ناکام نظریوں کے شکار لوگ تھے زندگی ایک بازار کی طرح میرے سامنے کھلی تھی۔ جہاں تھوڑے سے بھاؤ تاؤ کے بعد ہر ناممکن الحصول شے بھی مل سکتی تھی۔ میں نے اپنے سے بہتر اچھے کامیاب اور سچے آدمیوں

کو بکتے دیکھا تھا۔ میں تو مسلسل ضمیر کی بنائی دوزخ میں جلتا تھا مگر لوگ ہنستے ہوئے بک جاتے تھے اور بکنے کے بعد بھی اسی اکڑ سے چلتے ہوئے میرے سامنے سے گزرتے تھے۔

سوچتا ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوں کہ میں نے مارجری کے کیسے کیسے لوگ خرید لیے تھے۔ ان کی بے داغ زندگیوں کو داغدار کیا تھا امریکہ میرے لیے گھمنڈ تھا اور دولت میرے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ وہ میرے لیے بڑے بڑے ڈیزدیتی کیونکہ میں نہایت کامیابی سے اس کے بتاتے ہوئے راہ پر چل رہا تھا میں ایک کامیاب آدمی تھا اور پھر اوپر کی طرف جاتا ہوا راہ مشکل ہے پہاڑی سے ڈھلوان راہ پر تھوڑی سی محنت سے تم پاتال کی طرف تیزی سے اُتر سکتے ہو۔

میں امریکن قونصل کے ڈنر میں جانے کے لیے تیار تھا اور اپنی ٹائی کی گرہ کو آخری بار آئینے میں دیکھ کر جی ہی جی اپنے بے داغ سراپا کی تعریف کر رہا تھا۔ یہ بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں جیسے نیند سے بوجھل ہوں۔ جس پر مارجری کے لاتعداد بوسوں کے نشان اب بھی جاگتے ہیں۔ یہ سفید نرم ہاتھ جنہوں نے کبھی کوئی مشقت نہیں کی غیر ملکی سگریٹ پیتے ہوئے یہ ہونٹ میں کس قدر مکمل تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے گنگناتے ہوئے کواڑ کھولے۔ ایس پی اور اس سے پرے سپاہیوں کی ایک جماعت تھی ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی مزاحمت فضول سمجھ کر میں نے خاموشی سے اپنا آپ ان کے حوالے کر دیا۔

مگر میں نے لب سی لیے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو اب بھی بہت سے لوگوں کو اسی پریشانی میں مبتلا کر سکتا ہوں مگر میں نے اپنے سے آخری عہد کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میرا کوئی ماضی نہیں کوئی مستقبل نہیں۔ صرف افسوس ہے کہ میں نے ایک نہایت غیر اہم عورت کے ہاتھوں اپنا آپ بیچا۔

چندی جیل میں مجھے ملنے آیا تو میں نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور جب اس نے کہا تھا۔

"مرلی ایک بار باہر نکلو تو دوبارہ وہیں سے شروع کر سکتے ہو جہاں سے چھوڑا

تھا اصل میں سارا قصور میرا ہے اگر میں اس رات تمہیں اس ذلیل عورت کے پاس بٹھا کر خود نہ چلا آتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔"

میں خلا میں تکتا رہا اور اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا

لوگ سمجھتے ہیں کہ خوف اور دہشت سے میری زبان گنگ ہو گئی ہے۔

مگر آج جانے شرتے کا خط مجھے کیوں یاد آ رہا ہے۔"آدمی اپنے معبود خود بناتا ہے" اور مارجری کے مصور عاشق کی عقیدت اور یہ سپاہی کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ جو چاندنی کی ایک کرن کو بھی خاموشی سے میرے پاس بیٹھنے اور کہانیاں کہنے نہیں دیگی۔ سستے سگریٹ کی بو اور ایسی رات جس کے بعد صبح کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

چندی نے کہا تھا "سارا قصور میرا ہے۔" "میں دوبارہ وہیں سے شروع کر سکتا ہوں۔"

آدمی کو ایک ہی زندگی ملی ہے چودہ سال ختم کرنے کے بعد کیا میں دوبارہ شروع کر سکوں گا اور وفاداریاں کیا ہیں؟

آج جب ملک اور قوم کا تصور بدل رہا ہے جب حدیں طاقت کے بل بوتے پر تعین ہوتی ہیں دھوپ چھاؤں کی طرح گھٹتی بڑھتی ہیں اور زمین کسی کے پاؤں تلے بھی مضبوط نہیں۔ میں نے کس سے بے وفائی کی تھی؟

میں نے غلط خواب دیکھے تھے۔

لالہ بھگوتی پرشاد نے بھی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزارا تھا اور میں اس کا بیٹا مرلی دھر جہاں سے بھی وہیں پر ہوں۔

یہ مجھے اپنے اندر سے ہنسی کی آوازیں کیوں سنائی دے رہی ہیں جیسے کوئی غیر مجھ سے الگ میری پہنچ سے باہر میرے اندر میری ہنسی اُڑا رہا ہو۔

- آتشِ رفتہ ــــــــ ناولٹ
- تلاشِ بہاراں ــــــــ آدم جی انعام یافتہ ناول
- آپ بیتی جگ بیتی ــــــــ افسانے
- روہی (صحرا کی داستان) ــــــــ ناولٹ
- اپنا اپنا جہنم ــــــــ تین ناولٹ
- چہرہ بہ چہرہ رُوبرُو ــــــــ ناول
- دشتِ سُوس (منصور حلاج) ــــــــ ناول
- جوگ کی رات ــــــــ ناول
- بسنت رُت میرو ــــــــ افسانے